جہادِ افغانستان کے پس منظر میں لکھا گیا ایک شاہکار ولولہ انگیز ناول

اور حصار ٹوٹ گیا......

مصنف: طارق اسماعیل ساگر

☆......ملنے کا پتہ......☆

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔اردو بازار، لاہور

فون 7223584، موبائل 0300-4125230

علم و عرفان پبلشرز

34-اردو بازار، لاہور فون 042-7352332-7232336

فہرست

عرض مصنف

یہ ناول جس کا مطالعہ آپ کرنے جا رہے ہیں گزشتہ پندرہ سال سے میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ پندرہ سال سے میں اس ناول کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لئے بے قرار تھا لیکن جب کبھی میں نے عملاً ایسا کرنا چاہا تو قلم نے دل و دماغ کا یا پھر دل و دماغ نے قلم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس صورتحال کا نفسیاتی پس منظر کیا ہے؟

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو اس سوال کا جواب بھی دے دے گا۔

میں نے افغانوں کو صرف پڑھا نہیں، دیکھا بھی ہے، ان کی لپک، جھپٹ کا مشاہدہ اپنی گنہگار آنکھوں سے کیا ہے۔

مجھے 1980ء کی وہ رات کبھی نہیں بھولتی جب مرحوم صلاح الدین (مدیر تکبیر) کے ساتھ میں ڈاکٹر احسان اللہ ترین اور ہمارے دو گمنام ساتھی میران شاہ سے افغانوں کی معیت میں سرحد عبور کر کے خوست میں داخل ہوئے یہاں مجاہدین کا مضبوط ''ژاور'' مرکز قائم تھا۔

پہاڑوں کے اندر غاروں میں بنے اس مرکز سے خوست کا سارا محاذ ان دنوں مولوی جلال الدین حقانی کنٹرول کر رہے تھے۔ تب مسئلہ افغانستان کے اتنے زیادہ ''چیمپئن'' پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق پاکستان سے مجاہدین کی سرگرمیوں کا عینی مشاہدہ کرنے والے ہم دونوں شاید پہلے پاکستانی صحافی تھے۔

بے سروسامان، چنے کھا کر اور قہوہ پی کر پیٹ کا جہنم سرد کرنے والے افغان مجاہدین کے پاس تب بڑی بڑی لینڈ روور گاڑیاں اور کمیونی کیشن کا جدید ترین نظام نہیں آیا تھا چونکہ ان دنوں امریکہ بہادر ان پر مہربان نہیں ہو رہا تھا صرف آئی ایس آئی ہی جیسے تیسے معاملات کو چلا رہی تھی۔

وہ قیامت کی رات تھی روسی کمانڈوز چھاتہ بردار ہیلی کاپٹرز نے اچانک ''ژاور'' مرکز پر حملہ کر دیا اور اس حملے کا جو حشر ہوا؟ اسے دیکھنے کے بعد ''جہاد اور فساد'' کا فرق بخوبی سمجھ آ جاتا ہے۔ اس کے بعد عرصہ تک مجاہدین کی کاروائیاں نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن وہ منظر آنکھوں کو پھر دیکھنے کو نہیں ملا۔

اب 20 سال بعد اچانک ایک اور منظر دیکھ رہا ہوں۔

پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقہ کی ایک افغان بستی ہے یہاں سودیت روس نام کی سپر پاور کو صفحہ ہستی سے نابود کر دینے والے

مجاہدین کے دو سو بچے سردی اور خوراک کی بمباری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے ہیں۔

یہ منظر آپ سب کو بھی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے دیکھنے کو ملا ہوگا۔

اور ہم سب نے اسے ''معمول کی خبر'' جان کر نظر انداز کر دیا ہوگا لیکن کوئی ضمیر نام کی شے اگر ہمارے مردہ دلوں میں زندہ ہے تو ہم سب کو اپنے گریبانوں میں جھانک کر خود سے یہ سوال کرنا چاہیے۔

کیا بیس لاکھ سے زیادہ افغانی، پاکستانی، عربی، افریقی، یورپی مسلمان جہاد افغانستان میں اس لئے شہید ہوئے تھے کہ ہمیں ایسی خبریں پڑھنے کو ملیں؟

کیا پاکستان کی رگوں میں ہیروئن کا زہر نہیں پھیل گیا؟

کیا پاکستان کے گلی کوچوں میں کلاشنکوف نے دہشت نہیں پھیلا دی؟

کیا ہمارے شہر، ٹرینیں، بسیں اور ذرائع مواصلات دھماکوں سے نہیں اڑائے گئے؟ محض اس لئے کہ پاکستان جہاد افغانستان کا ''بیس کیمپ'' تھا۔

ہماری دوسری نسل اس ''جرم'' کی قیمت ادا نہیں کر رہی؟

کیا ہمارے کوڑھ مغز دانشور نے کبھی ایمانداری سے سوچا کہ ہم جہاد کے ثمرات سے محروم کیوں رہے؟

افغانستان کو آزادی کی صورت میں قحط اور بربادی کیوں نصیب ہوئی؟

یہ ناول شاید ان تمام سوالات کے جوابات تو نہ دے سکے لیکن اس کا مطالعہ آپ کو اس بنیادی گناہ کی نشاندہی ضرور کروا دے گا جس کی سزا ہم سب من حیث القوم بھگت رہے ہیں۔

ہائے! منافقت، ریاکاری، انسانوں اور اللہ سے دھوکہ اور جھوٹ جو ہمارے ارباب اختیار کا وطیرہ بن چکا ہے، نے ہمیں کیا سے کیا بنا دیا، کیا سے کیا دکھا دیا؟

اور نجانے ابھی کتنا کچھ دیکھنے کو باقی ہے۔ کاش میں اس سے آگے کچھ کہہ سکتا؟

یا اللہ ہم پر رحم کر دے۔

ہمیں معاف کر دے۔

ہمارے گناہوں سے درگزر فرما دے۔ آمین

میری یہ کتاب ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز سے شائع ہو رہی ہے جس کے بعد اُمید ہے کہ آپ کی وہ شکایات جو آپ میری کتابوں کے لئے استعمال ہونے والے کاغذ، جز بندی اور پروف ریڈنگ سے متعلق کیا کرتے ہیں رفع ہو جائے گی۔ جس طرح یہ قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب معنوی ہی نہیں، صوری طور پر بھی خوبصورت دکھائی دے۔ مصنف بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق جب پیکر میں ڈھلے تو اتنی ہی خوبصورت

دکھائی دے جیسا کہ اس نے سوچا اور لکھا۔

ہمارے ہاں بد قسمتی سے حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ قاری اور کتاب کا رشتہ ختم ہو جائے اس کے لئے بہترین ہتھیار کاغذ کی گرانی ہے جسے ہر حکومت نے کلہاڑے کی طرح استعمال کیا ہے۔ دنیا کے جاہل ترین معاشروں میں بھی کتاب کے لئے استعمال ہونے والے کاغذ پر حکومتیں رعایت دیتی ہیں ہمارے ہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے اور زمانے بھر کے ٹیکس کاغذ پر تھوپ کر اُسے اتنا مہنگا اور نایاب کر دیا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ان حالات میں جو پبلشرز کتاب خوبصورت انداز میں آپ تک پہنچاتے ہیں بلاشبہ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز بھی ان میں شامل ہے میری تمام پرانی کتابیں اسی ادارے سے ملیں گی اور جلد ہی انشاء اللہ نئی کتابیں بھی۔

آپ سے درخواست ہے کہ میری کتابیں طلب کرتے ہوئے ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز کا نام ضرور دیکھ لیا کریں تاکہ آپ تک معیاری کتاب پہنچے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

مارچ 2001ء لاہور

ہنگامی میٹنگ اور......

اوول ہاؤس میں سٹنفیلڈ ٹرنر کی طلبی کچھ ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی لیکن اس روز وہ اچانک رات آٹھ بجے اپنی طلبی پر حیران رہ گیا۔ کیونکہ صدر سے وہ تین گھنٹے پہلے ایک طویل ملاقات کے بعد رخصت ہوا تھا صدر کارٹر کی عادت تھی کہ وہ ایک نشست میں طے شدہ ایجنڈا مکمل کرنے کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں چھوڑتے تھے۔

''کیا پتا آن پڑی ہے ایسی''؟

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا پھر خود ہی اس مسئلے پر سر کھپائی سے الگ رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ ایڈمرل ٹرنر سی آئی اے کا چیف نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دماغ کو صدر سے ہنگامی ملاقات سے پہلے ہی مصروف کر لے وہ اپنی توانائیاں آنے والی ملاقات کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ وائیٹ ہاؤس میں داخلے پر اس کا استقبال جس شخصیت نے کیا اس سے صورت حال کچھ زیادہ ہی گھمبیر دکھائی دینے لگی۔

''کیسے ہو ایڈمرل''؟

نیشنل سیکورٹی کے چیئرمین نے اسے مخاطب کیا۔

''شاندار......اور آپ''

ٹرنر نے خود کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں اکٹھے خصوصی میٹنگ ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں دوسری بہت سی حیرتیں اس کی منتظر تھیں۔ پنٹاگان نیشنل سیکورٹی ایجنسی ڈیفنس انٹیلی جنس ایجنسی (ڈی ڈی آئی) نیشنل فارن انٹیلی جنس بورڈ (این ایف آئی بی کے سربراہان اور وہ تمام قابل ذکر ہستیاں سیکرٹری آف سٹیٹ سمیت وہاں موجود تھیں جنہیں عموماً جنگی خطرے کے پیش نظر یہاں طلب کیا جا سکتا تھا۔

ایڈمرل ٹرنر کا ماتھا ٹھنکا اس نے دراصل آج صبح موصول ہونے والی ایم آئی۔6 (برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی) کی تفصیلی رپورٹ کا سرسری جائزہ لیا تھا کیونکہ صبح ناشتے کے فوراً بعد جیسے ہی اسے یہ رپورٹ موصول ہوئی اور ٹرنر نے اسے دیکھنا شروع کیا تو امریکن میرین کا خصوصی وفد ملاقات کے لئے آ گیا جسے ٹرنر نے بریفنگ دینی تھی۔ جس کے بعد اس نے پنٹاگان کی ایک ٹیم سے مذاکرات کیے اور لنچ کیے بغیر ہی صدر سے ملاقات کرنے چلا گیا کیونکہ آج چار بجے سہ پہر اسکی صدر سے ملاقات پہلے سے طے تھی۔ صدر کے ساتھ دو گھنٹے کی طویل ملاقات اور بہت سے معاملات کا جائزہ لینے کے بعد وہ دوبارہ آفس پہنچا تو ایجنسی کی ایک اہم میٹنگ اس کی منتظر تھی جہاں اسے شام کے سات بج گئے اور ابھی وہ اپنی میز پر کافی کی چسکیاں لیتا صبح ملنے والی اہم برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی (ایم۔آئی۔6) کی رپورٹ کا مطالعہ کر ہی رہا تھا جب اچانک صدر کی طرف سے بلاوا آ گیا۔

وہ تو خیریت گزری کے اس نے وائیٹ ہاؤس پہنچنے تک اس رپورٹ کے کچھ مندرجات دیکھ لئے تھے ورنہ شاید یہاں شرمندگی کا سامنا کرنا ہوتا۔

سب لوگ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے جب صدر کی آمد ہوئی اور وہ احتراماً اٹھ کھڑے ہوگئے۔

''لیس جنٹل مین''

امریکی صدر جمی کارٹر نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی سیکرٹری آف سٹیٹ نے اس اچانک میٹنگ کا ایجنڈا بیان کرنا شروع کیا تو ان لوگوں کے علم میں آیا کہ اس اچانک طلبی کا محرک برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی (ایم آئی۔6) کی وہ خصوصی رپورٹ تھی جو ان کے ''کے جی بی'' (روسی انٹیلی جنس) میں موجود ایک انتہائی اہم اور معتبر ذرائع نے انہیں پہنچائی تھی۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اگلے دو ماہ میں کسی بھی وقت روسی افواج افغانستان میں داخل ہو جائیں گی۔ امریکی صدر کے لیے یہ بات اتنی پریشان کن تھی کہ اسے فوراً سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کرنا پڑا۔

''مائی فرینڈز''...... امریکی صدر نے وزیر خارجہ کی بریفنگ کے خاتمے پر کہنا شروع کیا۔

کیوبا، نکاراگوا، یمن، انگولا اور ایتھوپیا میں روسی مداخلت کے بعد یہ خبر زیادہ باعث تشویش ہو جاتی ہے۔''

اپنی گفتگو کا رد عمل جاننے کے لیے صدر جمی کارٹر نے گہری آنکھوں سے بار بار حاضرین کے چہروں کا جائزہ لیا اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی پریشانی کو بہت شدت سے اس کے ساتھی بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایڈمرل سٹنفیلڈ ٹرنر نے 1977ء میں جب سی آئی اے کی کمانڈ سنبھالی تو بلاشبہ بہت سے چیلنج اس کے منتظر تھے۔ اس سے پہلے امریکی کانگریس اور سینٹ دونوں کی لگی بندھی رائے تھی کہ امریکن سی آئی اے COVERT OPRATION (خفیہ آپریشن) کر کے دوسرے ملکوں میں مداخلت کرنا قطعاً زیب نہیں دیتا اور اس سے امریکہ کے ہاتھ سوائے بدنامی کے اور کچھ نہیں آنے والا......

ستمبر اور نومبر 77ء میں پہلے کانگریس میں بگورے آن اور پھر سینیٹر ڈک کلارک فارن ریلشنز سب کمیٹی آف افریقہ دونوں نے یہی سفارشات امریکی ایوان کو پیش کی تھیں اور صورتحال یہ تھی کہ 78ء کے آغاز میں کیوبا میں تربیت پانے والے ''کرائے کے سپاہیوں'' نے جو ''انگولا'' پر چڑھائی کر چکے تھے اب زائرے میں گھس بیٹھ شروع کر دی تھی جبکہ کیوبا میں روسی تربیت یافتہ گوریلے ایتھوپیا کی مارکسٹ حکومت کی مدد کرتے ہوئے صومالیہ میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کر رہے تھے۔ 79ء کے آغاز ہی سے ''کے جی بی'' کی پشت پناہی سے جنوبی یمن کی مارکسٹ سرکار نے شمالی یمن پر چڑھائی کر دی تھی۔

اور......

اب مستند اطلاعات کے مطابق روس کے اسی ہزار فوجی افغانستان میں مداخلت کے لیے پر تول رہے تھے۔

ٹرنر پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔

یہاں موجود امریکہ کی تمام ذمہ دار ہستیاں ٹرنر کی طرح اس طرف دیکھ رہی تھیں جیسے وہ ہی اس صورتحال کا ذمہ دار ہے...... اور ایڈمرل ٹرنر کے دونوں ہاتھ امریکی کانگریس اور سینٹر نے باندھ رکھے تھے۔

رات دیر گئے تک وہ کم از کم صدر کو پاکستان کے لیے فوراً چار سو ملین ڈالر کی امداد جاری کروانے پر رضامند ہو چکا تھا اور اب گھر کے بجائے لینگلے کی طرف واپس جا رہا تھا۔ جہاں اس نے ڈپٹی ڈائریکٹر آپریشن (ڈی ڈی او) میک میہان کو پہلے سے سٹینڈ بائی کروا دیا تھا......

رات ایک پہر بیت چکی تھی۔

سی آئی اے کا ڈائریکٹر ایڈمرل سٹیفیلڈ ٹرنر اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر آپریشن سے پاکستان میں موجود افغان قبائل کے تربیتی کیمپوں کی تازہ ترین صورتحال دریافت کر رہا تھا۔ آئر لینڈ نژاد میک میہان MCMEHAN کے متعلق اس بات کا علم ایجنسی کے ہر ذمہ دار کو تھا کہ وہ افغان گوریلوں کے لیے انتہائی سافٹ کارنر SOFT CORNAR رکھتا ہے اور ایجنسی میں اسے Father of the Afghan Optation کہا جاتا تھا۔

میک میہان کو اس بات کی کم از کم خوشی ضرور ہوئی تھی کہ (ایم آئی۔6) برطانوی انٹیلی جنس کی رپورٹ کو اتنا سیریس لیا جا رہا ہے۔ وہ گزشتہ 30 سال سے ایجنسی کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا اور اس کا طے شدہ فارمولا تھا کہ اگر کبھی روس کو اس کی جارحیت کا مزہ چکھانے کا موقعہ میسر آیا تو وہ صرف افغانستان کے ذریعے ہی آئے گا۔

1966ء کے اواخر میں جب پاکستانی وزیراعظم مسٹر بھٹو نے اپنے دست راست اور افغان امور کے ماہر میجر جنرل نصیر اللہ بابر کے ذریعے افغان گوریلا لیڈر گلبدین حکمت یار سے روابط بڑھائے اور افغانستان کے طرف سے ہونے والی جارحیت کو روکنے اور اسے سبق سکھانے کے لئے حکمت یار کے ذریعے افغانستان میں قبائلی شورش کا آغاز کروایا تو سی آئی اے میں اس کا سب سے بڑا احمایتی میک میہان ہی تھا کیونکہ اس کی دوربین اور دوررس نگاہوں نے مستقبل کا منظر ابھی سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

جنرل نصیر اللہ بابر نے جب امریکنوں کو صورتحال کی سنگینی کا احساس دلانا شروع کیا تو میک میہان ہی اس کا سب سے بڑا احمایتی تھا......

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی، جب ٹرنر اور اس کا ماتحت اس فیصلے پر پہنچے کہ اب روس کو سبق سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔

انہوں نے دنیا کے حساس ترین خطے میں جارحانہ مداخلت کا اصولی فیصلہ کر لیا تھا۔

ان تلخ حقائق کے باوجود کہ گزشتہ چار سو دنوں سے تہران کے امریکی قونصلیٹ میں امریکن سفارت کار قید ہیں......

ایران میں آیت اللہ خمینی کے انقلابی نظریات نے "مرگ بر امریکہ" کو تحریک کی شکل دے دی ہے اور لیبیا میں کرنل قذافی کی شکل میں دوسرا فیڈرل کاسٹرو ان پر حملے کے لیے کمر کس رہا ہے۔

بین الاقوامی منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔

اور......

اس بدلتے منظر نامہ میں سی آئی اے نے اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆

تیسرے روز ایک خصوصی مشن پر میک میہان کانگریس میں اپنے سب سے بڑے حمایتی ڈیموکریٹ چارلس ولسن کیساتھ اسلام آباد کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا......

ریاست ٹیکساس سے امریکی کانگریس مین چارلس ولسن افغان مسئلے پر اس کی طرح ایک مضبوط موقف رکھتا تھا اور اسے اپنی بات منوانے کا فن بھی آتا تھا۔ لمبا تڑنگا چارلس ولسن اپنے قد کاٹھ کی طرح ارادوں کا بھی بہت مضبوط تھا۔

دونوں عام فلائیٹ سے اسلام آباد پہنچے تھے۔

دونوں کو آئی ایس آئی کی خصوصی شخصیات نے امریکن سفارتخانے کے افسران کی معیت میں خوش آمدید کہا تھا۔

طویل اور تھکا دینے والے سفر کے باوجود دونوں تر و تازہ تھے حالانکہ وہ براستہ مصر اور جدہ اسلام آباد پہنچے تھے جہاں کے سیکورٹی حکام سے دونوں نے طویل مذاکرات کیے تھے۔

''ہم مجاہدین کے تربیتی کیمپ کا دورہ کریں گے''

اس روز ڈنر پر جب اپنے میزبان پاکستانی بریگیڈئر سے چارلس ولسن نے یہ بات کہی تو وہ چونک گیا۔

''او۔کے''......

سنجیدہ اور حالات کی سنگینی کا ادراک رکھنے والے بریگیڈئر نے اثبات میں سر ہلایا حالانکہ ابھی تک اس نے یہ اطلاع اپنے ڈی جی کو نہیں پہنچائی تھی لیکن وہ جانتا تھا اس کا ڈی جی اس فیصلے سے خوش ہوگا۔

☆☆

دوسرے روز علی الصباح ایک ہیلی کاپٹر میران شاہ سے کچھ فاصلے پر ایک آرمی بیس پر اتر رہا تھا جس سے قبائلی لباس پہنے میک میہان اور چارلس ولسن بریگیڈئر کی معیت میں برآمد ہوئے۔ یہاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دونوں امریکیوں نے نزدیک کھڑی پجیرو جیپ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

مقامی فورس کمانڈر حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے مہمانوں کے لیے اپنی روایات کے مطابق کھانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا لیکن مہمان بہت جلدی میں دکھائی دیتے تھے۔

اگلے ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد وہ میران شاہ ایجنسی میں پہنچ چکے تھے جہاں سے تین افغان گوریلوں کی معیت میں تینوں مہمان افغانستان کے سرحدی علاقے میں موجود اس خفیہ تربیتی مرکز کی طرف جا رہے تھے جہاں گزشتہ تین سال سے جیسے تیسے حالات میں مجاہدین کو آمدہ روسی جارحیت

کے خلاف منظم کیا جارہا تھا......

سارا دن اور رات دونوں امریکی مہمانوں نے مجاہدین کے درمیان گزارے۔ان کی کارکردگی اور بلند حوصلگی کا بھرپور اور تنقیدی جائزہ لیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ جس طرح روس نے ویت نام کو 58 ہزار امریکی فوجیوں کا مرگھٹ بنایا تھا بالکل اسی طرف وہ افغانستان کو بھی ان کہساروں کی طرح مضبوط، بے رحم، جفاکش اور کومٹڈ افغانوں کی مدد سے روس کا قبرستان بنادیں گے۔

''مسٹر ولسن یہ تاریخی ساعت ہے۔آپ کا فیصلہ آنے والی نسلوں پر گہرے اثرات مرتب کرے گا۔''

واپس لوٹتے ہوئے ڈپٹی ڈائریکٹر آپریشن سی آئی اے میک میہان نے امریکی کانگریس مین چارلس ولسن سے کہا۔

''میں اپنی ذمہ داری کو بخوبی سمجھتا ہوں میک''

ولسن نے پتھریلے پہاڑوں پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

فیضان اوغلو

افغان انٹیلی جنس سروس...... ''خاذ'' کے ہیڈ کوارٹر پر ہمیشہ کی طرح بے رحم سکوت طاری تھا! پرانی اور خستہ حالت عمارت کے در و دیوار پر ٹپکتی نحوست اس عمارت کے مکینوں کے چہروں پر اس طرح پھیل گئی تھی کہ وہ عمارت ہی کا حصہ نظر آنے لگے تھے...... بیرونی پتھریلی فصیل کے اندر بنے مختلف بلاکوں کے قطار اندر قطار کمروں میں کرخت چہروں والے افغانی ''ضابط'' (افسر) اور روسی مشاوروں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ چلتے وقت ان کے قدموں کی چاپ بھی دوسرے کو سنائی نہ دے۔

کبھی کبھی کسی بلاک کے کسی کمرے سے جب اچانک زیر تفتیش ملزم کی چیخ سنائی دیتی تو محسوس ہونے لگتا: جیسے یہ عمارت انسانوں کے بجائے بھوت پریت کا مسکن ہے۔ عموماً ایک بلاک سے اٹھنے والی چیخ کا گلا وہیں گھٹ کر رہ جاتا کیونکہ دوسرے بلاک تک درمیان میں اچھا خاصہ فاصلہ رکھا گیا تھا۔

یہ چیخیں اور آہیں یہاں کے مکینوں کے لیے روزانہ کا معمول بن چکی تھیں۔ خصوصاً ''فورائے دوست'' (دوست افواج) کی آمد کے بعد سے تو اب کوئی ان پر دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔

رات کو جب شہر کرفیو کی زد میں آ کر سائیں سائیں کرنے لگتا تو اس عمارت میں ایک نیا شہر بسنے لگتا۔ مہمانوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھ جاتا! غروب آفتاب کے تھوڑی دیر بعد ہی اس عمارت کے پیٹ سے مختلف جیپیں برآمد ہوتیں جن میں افغان عساکر (سپاہی) اور ان کی کمانڈ کے اکا دکا جگرن (میجر) موجود ہوتے!! جیپوں اور کاروں کی روانگی تو بڑی پر اسرار ہوتی تھی لیکن ان کی واپسی اپنے ہمراہ ایک آدھ ہنگامہ ضرور لئے ہوتی۔

جب کبھی ایسی کوئی گاڑی اپنے مشن سے لوٹتی اس کے سواروں میں ایک آدھ ہتھکڑی سے بندھا نیم بے ہوش افغان ضرور موجود ہوتا۔

رات کے دوسرے پہر جب کابل کی سڑکیں کرفیو کی وجہ سے کھانے کو دوڑتیں تو چاروں اطراف سے بندروی گاڑ...... جیپیں بڑی تیز رفتاری سے برآمد ہونا شروع ہو جاتیں ان کا رخ عموماً دریائے کابل کی طرف ہوتا...... دریا کے کسی محفوظ کنارے پر جہاں عموماً روسی افواج مورچے سنبھالے موجود ہوتیں! ان جیپوں سے بڑی پھرتی سے روسی اور افغان سپاہی ان مردوں کو نکالنا شروع کرتے، جو تفتیش کی تاب نہ لا کر ''خاذ'' کے کسی نہ کسی بلاک میں چیختے چلاتے مرجاتے تھے۔ ان کی لاشیں دریا کی شوریدہ سر لہروں کے سپرد کر دی جاتیں جنہیں جھاگ اڑاتی موجیں لمحوں میں نظروں سے اوجھل کر دیتیں۔

دن کے اوقات میں عموماً یہاں موجود افسران اور ملازمین زیادہ تر اونگھتے رہتے یا پھر مختلف فائلیں سامنے رکھے ان مغز ماری میں مصروف

رہتے۔

لیکن ان میں ایک گروپ ایسا بھی تھا جن کا کام دن رات جاری رہتا: وہ لوگ حال ہی میں درآمدہ ان آلات تفتیش سے جوان کے لئے ''قوائے دوست'' اپنے ہمراہ روس سے لے کر آئے تھے، ان پابہ زنجیر افغانیوں پر مشق ستم ڈھانے میں مصروف رہتے جو زیر حراست یہاں موجود تھے۔

پچھلے دو تین ماہ سے یہاں بڑے نامحسوس طریقے سے ایک اور تبدیلی عمل میں لائی گئی تھی: افغانی افسران کی ایک بڑی تعداد کو یکے بعد دیگرے دوسرے مقامات پر تبدیل کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ روسی ''مشاوروں'' نے لے لی تھی......!

مگر اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں افغان افسران اس مداخلت بیجا پر سیخ پا نہ ہو جائیں، اعلیٰ حکام نے اہم ترین عہدوں پر انہیں ہی متمکن رہنے دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ عملی اختیارات ان کے نہ ہونے کے برابر تھے۔ خصوصاً کرنل شولوخوف کے سامنے تو ان کی حیثیت رائی کے برابر بھی نہیں تھی۔

☆☆

لمبا تڑنگا سرخ و سپید چہرے اور گنجے سر کا مالک کرنل شولوخوف اتنی روانی سے فارسی اور پشتو جانتا بولتا تھا کہ ''خاد'' کے قریباً سب ہی افسران دنگ رہ جاتے۔ وہ پٹھانوں کی طرح پگڑی باندھے، شلوار اور لمبی گھیرے والی قمیض پہنے جب کبھی کابل کی سڑکوں پر مٹر گشت کرنے نکلتا تو کوئی بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا کہ کرنل شولوخوف روسی ہے یا افغانی!

پہلے پہل جب اس نے ہنستے ہوئے اپنا تعارف ''خاد'' کے اعلیٰ افسران کو کروایا تو وہ اسے روسی ماننے کو تیار ہی نہ ہوئے۔ بات تھی بھی ایسی ہی۔ کسی نے اسے آج تک روسی زبان بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ عموماً ایک دلفریب مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر چپکائے رکھتا تھا، لیکن کبھی کبھی اچانک جب یہ مسکراہٹ غائب ہو جاتی تو اس کے چہرے کے حسن کو بالکل دوسرا روپ عطا کر دیتی۔

اب وہ خوبصورت اور قد آور نوجوان کے بجائے ڈھلتی عمر کا ایک خونخوار بھیڑیا نظر آنے لگتا۔ اس کے دانتوں کی اوپری چمکدار قطار سے خونخواری ٹپکنے لگتی۔ گالوں کی ہڈیاں سختی سے بھنچ جانے کی وجہ سے اتنی نمایاں ہو جاتیں کہ ان کا خون نچڑ کر اس کی آنکھوں میں پناہ لے لیتا۔

بظاہر تو کرنل شولوخوف ''خاد'' کے ڈائریکٹر آپریشن اسفندیار کے ماتحت تھا، لیکن اسفندیار اب خود اس سے خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ کیونکہ اس نے شولوخوف کی رپورٹوں پر اپنے تین چار ماتحتوں کے خلاف کاروائی کے بعد ان کے حشر سے خاصی عبرت حاصل کر لی تھی۔

یوں تو اس عمارت کے ہر بلاک کا انچارج ایک افغان جگرن (میجر) ہوا کرتا تھا، جو ڈیپوٹیشن پر یہاں آتا اور اپنی مدت گزارنے کے بعد واپس چلا جاتا۔ ''خاد'' کے تحت انجام پانے والے مختلف آپریشنز انہی انچارج کی زیر کمان ترتیب و تکمیل کے مراحل سے گزرتے۔

لیکن ''قوائے دوست'' کی آمد کے بعد اب حالات بدل گئے تھے۔

اب تمام آپریشن ڈائریکٹر آپریشن کرنل شولوخوف کی نگرانی میں ترتیب و تکمیل پاتے۔ پہلے پہل تو افغان افسران نے اپنی پٹھانی فطرت

کے تحت اس بات پر جھنجلاہٹ کا اظہار کیا لیکن شولوخوف نے محض تین ماہ کی قلیل مدت ہی میں ان کے دماغ درست کر دیئے۔ وہ اچانک ہنستے ہنستے یکدم آدمی سے ڈریکولا کا روپ دھار لیتا اور اپنے سامنے کھڑے افسر پر پل پڑتا۔ اول تو اس کے اس اچانک اقدام سے کسی کو مدافعت کی ہمت ہی نہ ہوتی اور اگر کوئی غصے یا بے عزتی کے احساس کی تاب نہ لا کر جوابی کارروائی کرتا تو عموماً کوئی گہری چوٹ کھا کر گر پڑتا۔

پھر یوں ہوتا کہ شولوخوف کے ہال نما کمرے کے باہر کھڑے باوردی "ضابط" جب گھنٹی کی آواز پر اندر داخل ہوتے تو وہ ہنستے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے فارسی یا پشتو میں اس بے ہوش افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے کہتا۔

"ان کی طبیعت ذرا خراب ہے اسے باہر کھلی ہوا میں لے جاؤ!"

"ضابط" بڑے مئودب غلاموں کی طرح اس افسر کو ہاتھوں پیروں سے پکڑتے اور ڈنڈا ڈولی کرتے باہر لے جاتے۔

خدا جانے کرنل شولوخوف کے پاس کیا پر اسرار طاقت تھی کہ پلک جھپکنے میں وہ بڑے بڑے شہ زوروں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتا۔ اس "راز" کا علم "خاد" کے دفتر میں اگر کسی کو تھا تو ڈائریکٹر اسفندیار کو۔

☆☆

وہ جانتا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے کرنل شولوخوف ماسکو میں کے۔جی۔بی کے ہیڈ کوارٹر میں مارشل آرٹس کا سب سے بڑا انسٹرکٹر تھا۔ دو تین ماہ بعد اس کی ٹریننگ کے ہاتھوں کسی نہ کسی زیر تربیت ایجنٹ کی کوئی نہ کوئی ہڈی ٹوٹنے کے واقعات سننے کو ملتے رہتے تھے۔ اسے یوکرائن کے اکثر علاقوں میں مقامی شر پسندوں کا دماغ ٹھیک کرنے کے فرائض سونپے جاتے تھے اور شولوخوف کا نام ہی یوکرائن کے آزادی پسندوں کے لیے خوف کی علامت بن چکا تھا۔

اس روز بھی ایسا ہی کوئی واقعہ ہو گیا تھا۔

"جونیئر ضابطوں" کو کیا علم کہ اندر خانے معاملہ کیا ہے۔ وہ بے چارے تو سہمے سکڑے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے تھے کیونکہ دوپہر کے بعد ہی انہیں کرنل کا موڈ آف ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ ہر کوئی اس کے سامنے جانے سے کترا رہا تھا۔ خصوصاً ہر بلاک کے آپریشن انچارج کی تو جان پر بنی تھی۔

جگرون ارخان کو جب انٹر کام پر کرنل کے سامنے پیش ہونے کا حکم ملا تو اپنے ہاتھوں پیروں سے جان نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے لکڑی کی کرسی جس پر وہ بیٹھا تھا، میں اچانک مقناطیسی لہر دوڑنے لگی ہے جس نے اس کے بند بند کو جکڑ لیا ہو۔ بڑی ہمت کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے پیچھے کارنس پر رکھے شیشے میں اس نے اپنے چہرے کی اڑتی رنگت کا نظارا کیا، خوف کو سنبھالا دینے کے لیے وہیں ایک کونے میں رکھے جگ سے ایک گلاس میں پانی انڈیلا۔ یخ پانی کے دو گھونٹوں نے ہی اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو بھی منجمد کر دیا تھا لیکن نجانے کیوں آدھا گلاس حلق میں انڈیلنے کے بعد اسے اپنے حواس بجا ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

جگرون ارخان نے ٹوپی اپنے سر پر سلیقے سے جمائی، ہولسٹر میں رکھے ریوالور کو تھپتھپایا اور نپے تلے قدموں سے اپنے کمرے سے باہر نکل

آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی خود اعتمادی لوٹ رہی تھی۔ جب وہ آخری بلاک کے ایک کونے میں بنے کرنل شولوخوف کے ہال نما کمرے تک پہنچا تو خود کو خاصا پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

دروازے کے باہر موجود دونوں محافظوں کی ''درخواست'' پر اس نے ہولسٹر سے پستول نکال کر ان کے حوالے کر دیا اور خود ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوا۔ جہاں کمرے کی پچھلی دیوار پر لٹکتے ایک بڑے نقشے کے نیچے جس پر کابل شہر کی ایک ایک تفصیل نمایاں تھی۔ کرنل شولوخوف مسکراہٹ ہونٹوں سے چپکائے اس کا منتظر تھا۔

ارخان نے دونوں ایڑیاں بجا کر کرنل کو سلیوٹ کیا۔

''خوش آمدید میجر ارخان...... '' کرنل کی مسکراہٹ دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

شولوخوف نے اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی لمبی سی میز کے ایک کونے پر قریباً جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس سے کہا:

''میجر ارخان میرے خیال میں فیضان اوغلو کسی جن بھوت کا نہیں انسان کا نام ہے اور وہ اسی ملک میں بلکہ اسی شہر میں موجود ہے۔''

''جناب والا! ہم سرگرمی سے اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے شہر کے چپے چپے پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ کابل سے باہر جانے والے تمام راستے ہمارے نظر میں ہیں۔'' ارخان نے بڑے اعتماد لہجے میں کہا۔

''ارخان تم لوگ کب سے اسے ڈھونڈ رہے ہو؟'' کرنل شولوخوف نے بڑے تمسخر سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک بے رحم سے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بدستور کھیل رہی تھی۔

''جناب!'' ارخان نے تھوک نگلا: ''پرسوں صبح سے، جب آپ کا حکم موصول ہوا۔''

اس کا جواب سنتے ہی کرنل شولوخوف تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے چپکی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہاں وہ کرختگی اور درشتی نظر آنے لگی جس کے تصور ہی سے ''خاد'' کے افسران سہمے رہتے تھے۔

'ارخان'' اس نے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ پرسوں صبح سے جھک مار رہے ہو۔ جانتے ہو وہ کہاں ہے؟''

''نہیں جناب...... '' بے ساختہ اور گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکلا۔

''گدھے'' کرنل شولوخوف نے میز پر رکھی چھوٹی سی چھڑی اٹھا کر اس سے میز کا ایک کونا پیٹا، پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر اس نقشے تک پہنچ گیا جو اسکی پشت پر نظر آ رہا تھا۔

''ادھر آؤ...... اس نے قریباً پھاڑ کھانے والے لہجے میں جگڑون ارخان کی طرف گھورتے ہوئے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ارخان کو کرسی سے اٹھ کر اس تک جاتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی روح کسی نے آہستہ آہستہ قبض کر لی ہو، تاہم کسی نہ کسی طرح وہ کرنل سے دو تین قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ کرنل نے اپنی چھڑی کی نوک نقشے میں ایک جگہ جمائی اور چیختے ہوئے بولا:

''یہاں..... اسے ایک گھنٹے کے اندر ہر حالت میں میرے سامنے پیش کرو۔'' پھر وہ ارخان کی طرف گھوما۔

''ناؤ گیٹ آؤٹ۔''

☆☆

ارخان جب بوجھل قدموں سے کمرے سے باہر آ رہا تھا تو بے عزتی کے احساس اور غصے کے مارے اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا جی یہی چاہتا تھا کہ باہر کھڑے ''ضابطہ'' جیسے ہی اس کا ہولسٹر لوٹا ئیں۔ وہ پستول نکال کر اندر داخل ہو اور سارا پستول اس بھیڑیے کرنل پر خالی کر دے، لیکن..... وہ بھی دیگر افسران کی طرح ایسی باتیں صرف سوچ ہی سکتا تھا۔ ان پر عمل کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔

پلازا ہوٹل کا شمار کابل کے امیر ترین ہوٹلوں میں ہوتا تھا..... اس ہوٹل کو ''جنج گھر'' بھی کہا جا سکتا تھا۔

یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی شادی کی تقریب منعقد ہوتی رہتی تھی اور ہوٹل پلازا ایسی تقاریب کے انتظام و انصرام کے لئے مشہور تھا۔ روسی افواج کی آمد کے بعد سے شہر میں ایسے بے نام سا خوف و ہراس تو پھیل گیا تھا، لیکن اس ہوٹل کے در و دیوار اس سے خاصے محفوظ تھے۔

فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ اب رات گیارہ بجے سے پہلے پہلے ایسی تقاریب اپنے انجام کو پہنچ جاتی تھیں۔ کیونکہ گیارہ بجے رات کے بعد سے صبح پانچ بجے تک کرفیو لگا رہتا تھا۔

یوں بھی رات گیارہ بجے کے بعد سارے شہر میں دھماکے ہونے لگتے تھے۔ اور شہر کے کسی نہ کسی کونے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ جس کی وجہ سے یہاں ہنگامہ ہاؤ ہو کا جاری رہنا مشکل نظر آتا تھا۔

ہوٹل پلازا کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں فیضان اغلو بڑی شدت سے کسی بارات کا منتظر تھا۔ اس کی اطلاعات کے مطابق شام سات بجے تک بارات کو یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا، لیکن ساڑھے چھ بج رہے تھے اور ابھی تک دور دور تک بھی باراتیوں کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس دوران اس نے دو مرتبہ نیچے جا کر اس ہال کا جائزہ لیا جہاں بارات آنے والی تھی۔

ہوٹل کے ملازمین نے بڑے سلیقے سے ہال کو سجا رکھا تھا۔ ایک طرف میزوں پر سفید بے داغ چادریں ڈال کر ان پر کھانے کے برتن سجائے گئے تھے اور ہال سے ملحق اس کچن روم سے جہاں باراتیوں کے لیے کھانا پک کر تیار ہو چکا تھا اشتہا انگیز خوشبو..... نکل کر ہال میں پھیل رہی تھی۔

ابھی چند منٹ پہلے ہی کاروں کے ایک جلوس کے ساتھ یہاں دلہن کی آمد ہوئی تھی جو ''پرچمی پارٹی'' کے ایک سرکردہ لیڈر کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی بھی ''پرچم پارٹی'' ہی کے ایک لیڈر کے بیٹے سے طے پائی تھی۔

جو لوگ دولہن کو بیاہنے آنے والے تھے ان میں ایک خاص شخصیت تھی اور وہ تھا مقامی پولیس کا سربراہ اخوندزادہ جس کے پچھلے کئی حساب فیضان اور غلو اور اس کے ساتھیوں نے چکانے تھے۔

روانگی سے پہلے..... میر داد خان نے جو مقامی جماعت مجاہدین کا سربراہ اور علاقے کے روحانی پیشوا کا بیٹا بھی تھا اسے خاص طور سے اس

مہم کے لیے منتخب کیا تھا۔ میر داد خان نے ''ژاور'' مرکز سے کابل پہنچتے تک فیضان کو متعدد مرتبہ آزمالیا تھا۔

''میرے دوست!'' میر داد خان نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔''میں جانتا ہوں تمہاری تلاش ان لوگوں کو کتنی شدت سے ہے، لیکن تم چونکہ ماسکو یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہو۔ روسی زبان بول اور سمجھ سکتے ہو۔ اس کے علاوہ اس جماعت میں صرف تم ہی ایک ایسے فرد ہو جو اونچی سوسائٹی کے جدید رسوم و رواج سے واقف ہو جسے اس طرح کے ہوٹلوں اور کلبوں میں رہنے کا تجربہ ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے اخوندزادہ کو مارنے کی سعادت صرف تمہارا نصیب ہے...... صرف تمہارا۔''

''جو حکم یا امیر! مجھ سے انشاء اللہ کسی بزدلی کی شکایت آپ کو نہ ہوگی'' اس نے بڑے پر اعتماد لہجے میں میر اجماعت سے کہا تھا۔

فیضان اوغلو نے صبح گیارہ بجے کمرہ ایک جعلی نام سے بک کروایا۔ اس نے خود کو غزنی کے ایک تاجر کا بیٹا ظاہر کیا جو مقامی منڈی سے حساب کتاب کرنے آیا تھا۔

کرنل شولوخوف کے متعلق فیضان اوغلو اور اس کے کسی ساتھی کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی: وہ سب جانتے تھے کہ شولوخوف نے چارج سنبھالتے ہی کتنی برق رفتاری سے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا ہے۔

فیضان کی بے قراریوں کو تب قرار ملا جب اس کے کانوں تک شہنائی کی مخصوص آواز پہنچی جو اس بات کا اعلان تھا: ''کہ بارات آگئی ہے۔''

اس نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھے ریوالور کو تھپتھپایا پھر کسی اچانک آمدہ خیال کے تحت دوبارہ باتھ روم میں جا کر ریوالور کو چیک کیا، اس سے گولیاں نکال کر گراری کو گھما کر چیک کیا۔ گولیوں کو الٹا پلٹا کر ان کا جائزہ لیا اور دوبارہ بڑی پھرتی سے ریوالور لوڈ کر کے اسے جیب میں رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆

فیضان کا رخ ہوٹل کے دروازے کی طرف تھا۔

جب وہ مین گیٹ پر پہنچا تو شہنائیوں کی زوردار آواز کے ساتھ اسے شہنائیاں بجانے والے بھی نظر آنے لگے۔ ہوٹل کے دروازے پر دلہن کے رشتہ دار جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے بارات کا استقبال کرنے کھڑے تھے۔ ان میں اکابرین شہر نمایاں تھے اگر وہ چاہتا تو یہاں موجود حکومتی پارٹی کے کئی آدمیوں کو آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس کے اوورکوٹ کی دوسری جیب میں ہینڈ گرینڈ بھی کسی ہنگامی حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود تھے لیکن امیر کا حکم صرف اخوندزادہ سے متعلق تھا۔

بارات اب ہوٹل کے دروازے میں داخل ہونا شروع ہوگئی تھی۔ پھر بے اختیار اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگ گیا۔ ایک لمبی شیورلیٹ کار سے اس نے اخوندزادہ کی گنجی ٹانٹ چمکتے دیکھ لی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہجوم میں دروازے کی طرف پیدل ہی آرہا تھا۔ کاریں ہوٹل کے باہر ہی پارکنگ ایریا میں کھڑی کی جارہی تھیں۔

جگرون ارخان نے لاکھ طیش میں ہونے کے باوجود اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا تھا: کہ اگر آج فیضان اس کے ہاتھوں سے نکل گیا تو کچھ بعید نہیں کہ کرنل شولوخوف غصے یا جھنجھلاہٹ میں اسے گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کرے۔ اس لیے اس نے انتظامات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

سب سے پہلے تو اس نے ہوٹل کے گرداگرد چاروں طرف کی ناکہ بندی بڑی تیزی اور احتیاط سے کروا دی۔ اس کے بعد ہوٹل میں ''خاد'' کے ایجنٹ پھیل گئے۔ انہوں نے کمروں کے سامنے اور ہال پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔

اس خدشے کے پیش نظر کہ ''خاد'' میں موجود مجاہدین کے آدمیوں میں سے کوئی فیضان یا جماعت کے کسی اور رکن کو صورتحال سے آگاہ نہ کر دے، انہوں نے فیضان کے متعلق کسی کو نہیں بتایا تھا۔ صرف ارخان نے اس کی تصویر دیکھی تھی۔ عموماً ماتحت عساکر کو آخر وقت تک یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس شخصیت کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں کیونکہ ان سے زیادہ تر خطرہ اسی بات کا رہتا تھا کہ کہیں ان کی وفاداریاں تبدیل نہ ہو جائیں وہ افغانیت کے جوش میں آ کر سارے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دیں۔

ارخان جب اپنے ماتحتوں کے ساتھ سویلین کپڑوں میں ملبوس ہوٹل پہنچا تو اس کے ساتھی اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے تھے...... بارات دروازے کے پاس آ کر ٹھہر گئی تھی اور اس میں شامل براتیوں کے گلے میں لڑکی والے خشک میوہ جات سے پروئے ہوئے ہار ڈال کر ان کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

ارخان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس ہجوم میں ضرور شولوخوف بھی موجود اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ اگر اس نے ذرا سی بھی کوتاہی کی تو وہ اسے موقع پر ہی گولی مار دے گا۔

جس طرح اچانک اس نے فیضان کی موجودگی کا انکشاف اس ہوٹل میں کیا تھا اس سے تو ارخان بھونچکا رہ گیا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرنل شولوخوف کے ایسے کون سے ذرائع یہاں موجود ہیں جنہوں نے اس تک یہ اطلاع براہ راست پہنچا دی۔ جب کہ ''خاد'' کے روسی تربیت یافتہ ایجنٹ شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔

ابھی تک فیضان اسے اس ہجوم میں دکھائی نہیں دیا تھا، البتہ اس کی نگاہیں مختلف چہروں پر پھسل کر یہاں موجود لوگوں کی اہمیت سے باخبر ہو چکی تھیں۔ اور اسے اس بات کی بھی سمجھ آ گئی تھی کہ فیضان آخر اس ہوٹل میں کیوں موجود ہے۔

ارخان ہجوم کے ایک طرف سے نکلتا ہوا ہوٹل کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ جب اچانک ایک فائر کی آواز نے اس کے حواس پر بجلی گرا دی۔ آواز کے ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا اس سے چند قدم کے فاصلے پر اخوندزادہ سینے پر ہاتھ رکھے آگے کی طرف جھک رہا تھا اور اس سے بمشکل آٹھ دس گز دور فیضان اوغلو کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور سے گولیاں یکے بعد دیگرے نکل کر اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھیں۔

وہاں موجود باراتیوں میں بھگدڑ مچ گئی، لیکن ارخان کے حواس بجا تھے۔ اس نے اپنا پستول ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ فیضان کی گولیاں ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اخوندزادہ کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر اس کی طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو جاتی تو فیضان کو گولی لگنے سے پہلے دو تین بے گناہ ضرور مارے جاتے۔

جیسے ہی فیضان کا ریوالور خالی ہوا اس نے بھاگ کر ایک طرف نکلنا چاہا تا کہ دوبارہ ریوالور لوڈ کر سکے لیکن اس دوران ارخان اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے درجنوں ساتھی بھی ہجوم کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہوئے اپنے پستول تانے فیضان اوغلو کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فیضان کا بایاں ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں تھا جب اس نے جلگون ارخان کو للکارتے سنا۔

''ہینڈز اپ''

اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ گرینڈ باہر نکال کر اسے ارخان کی طرف پھینک دے۔ اگر پن نکالتے ہوئے اسے ایک آدھ گولی لگ بھی جاتی تو بھی فیضان اوغلو اپنی سی کر گزرتا، لیکن ارد گرد افراتفری کے عالم میں چیختے چلاتے بے گناہ لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے۔ اس کی غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ کسی مجاہد کے ہاتھوں کسی بے گناہ کی جان بھی جائے۔ فیضان اوغلو نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

فوراً میجر ارخان کے اشارے پر اس کے دو ساتھیوں نے فیضان کو بڑی پھرتی سے جامہ تلاشی لے کر اس سے گرینڈ، خالی پستول اور فالتو راؤنڈ برآمد کر لیے۔

اس دوران ارخان نے پستول اسی کی کنپٹی سے لگائے رکھا۔ اس کی تلاشی سے مطمئن ہوتے ہی انہوں نے فیضان اوغلو کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور وہ لوگ اسے دھکے دیتے ہوئے ہوٹل سے باہر کھڑی ایک جیپ کی طرف لے جانے لگے۔

آنکھیں بند ہونے سے پہلے فیضان اوغلو نے آخری منظر یہی دیکھا تھا کہ لوگ اخوندزادہ کی لاش کے گرد اکٹھے ہونے لگے تھے۔ ارد گرد کی زمین اس کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ سرخرو ہوا۔

ارخان پچھلی سیٹ پر فیضان اوغلو کے پہلو میں پستول لگائے اس سے چپکا بیٹھا تھا۔ اسے یہاں موجود کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ عام حالات میں وہ کبھی اتنی احتیاط نہ کرتا لیکن اب معاملہ کرنل شولوخوف کا تھا اور اسے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے والا شولوخوف اتنی جلدی بھولا نہیں تھا۔

کرنل شولوخوف کو پل پل کر خبر مل رہی تھی۔ جب اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جیپ کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو ایک سفاک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس کی ہدایت پر قیدی کو سیدھا اس کے کمرے میں پیش کرنے کے لیے لایا جا رہا تھا۔

جیپ کے رکتے ہی ارخان نے فیضان اوغلو کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اسے جیپ سے باہر نکالنے کا حکم دیا۔

''جب تم لوگ مجھے پکڑ کر لے ہی آئے ہو تو کم از کم میری آنکھیں تو کھول دو۔ اتنے پہرے میں بھاگا تو نہیں جا رہا۔'' فیضان اوغلو نے اسے مخاطب کیا۔

ارخان نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی کہ اس کے لہجے میں التجا یا درخواست والی ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ کہ وہاں گھبراہٹ یا خوف کا شائبہ تک بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ گرفتاری سے لے کر ''خاد'' کے ہیڈ کوارٹر پہنچتے تک فیضان نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ جب کہ اس نے راستے میں کئی مرتبہ اس سے بات کرنی چاہی تھی۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی فیضان اوغلو کے لیے کچھ ہمدردی سی محسوس کرنے لگا تھا اس کی تصویر دیکھنے یا اسے ملنے سے پہلے ارخان کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ وہ کوئی ''ہائی جیکر'' قسم کا بین الاقوامی غنڈہ ہوگا، لیکن اس سے گفتگو کیے بغیر ہی اس کے ساتھ ایک ''غالب'' کی حیثیت میں سفر کرنے کے دوران ہی نجانے کیوں وہ خود کو فیضان اوغلو کی شخصیت کے سامنے دبا دبا سا محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ وہ فیضان نہیں تھا جو اسے پل چرخی جیل میں دو سال پہلے ملا تھا۔

لیکن اس نے اپنے لہجے میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اسے علم تھا کہ اس کے ساتھیوں میں یقیناً کرنل شولوخوف کے خصوصی مخبر بھی موجود ہیں۔ جن کو اگر اس بات کا ذرہ برابر بھی شک ہو گیا کہ اس کا رویہ قیدی سے کچھ نرم یا شریفانہ قسم کا رہا ہے تو وہ فوراً اس کی رپورٹ کر دیں گے اور اس کے بعد جو حال ارخان کو ہوتا، اس کے متعلق اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔

 ☆☆

اس نے پچھلے تین چار ماہ میں اس بات کا نظارہ بہت قریب سے کیا تھا کہ ''خاد'' کے دفتر میں موجود مجاہدین کے ''مخبروں'' کا انکشاف ہونے کے بعد کیا حشر ہوا۔ ان کے لواحقین کو کبھی اس کا علم نہ ہو سکا کہ انہیں کن کن اذیت ناک مراحل سے گزرنے کے بعد موت نصیب ہوئی تھی۔

''بکومت'' اس نے سخت گیر لہجے میں فیضان اوغلو سے کہا۔ اور اسے دھکا دے کر آگے بڑھا دیا۔

فیضان نے کوئی مداخلت نہ کی اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ عمارت کے مختلف کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ لوگ بالآخر اسے ''آپریشن بلاک'' میں لے آئے۔ ارخان نے بدستور اس کے ایک بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ کرنل شولوخوف کے کمرے کے باہر اسے رکنے کا حکم ملا۔

باہر موجود گارڈز نے اس کی دوبارہ جامہ تلاشی لی۔ ارخان کو انہوں نے واپس جانے کے لیے کہا اور خود اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر انہوں نے فیضان اوغلو کو رکنے کے لیے کہا اور اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔

جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سب سے پہلے فیضان کی نظر کرنل شولوخوف کے چہرے پر پڑی جو اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کن اکھیوں سے اس نے کمرے کی مختلف اطراف کا جائزہ لیا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں سٹین گن سے مسلح ''ضابطہ'' موجود تھے۔

''خوش آمدید مسٹر فیضان اوغلو'' شولوخوف نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

فیضان خاموشی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑے رہا۔ کرنل شولوخوف نے اس کی مادری زبان فارسی میں اسے مخاطب کیا تھا، لیکن فیضان نے پہلی ہی نظر میں اس کی قومیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''تمہیں گرفتاری کا افسوس تو اصولاً نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ تمہارا مشن بہر حال پورا ہو چکا ہے۔ اخوندزادہ مارا گیا۔'' شولوخوف بدستور مسکرا

رہا تھا۔

''میرے لئے گرفتار ہونا، زخمی ہونا یا مرجانا کچھ اہمیت نہیں رکھتا......''

پہلی مرتبہ فیضان نے زبان کھولی۔

''حیرت ہے ماسکو یونیورسٹی کا گریجویٹ بھی ایسی باتیں کرتا ہے۔''

کرنل نے بڑے تمسخر سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں ابھی بہت سی حیرتوں کا سامنا ہوگا، دیکھتے جاؤ......''

فیضان کے لہجے کا وقار بدستور قائم رہا۔

''کم از کم اس بات پر تو ہمارا شکریہ ادا کرو کہ ہماری تعلیم نے تم جیسے گنواروں کو مکالمہ بازی سکھا دی۔'' شولوخوف کی جہاندیدہ نظروں نے اندازہ کر لیا تھا کہ فیضان نے اس کی شہریت پہچان لی ہے۔

''تمہاری یہ خوش فہمی بھی جلدی دور ہو جائے گی۔''

''باتیں بہت کرتے ہو۔''

کرنل کی مسکراہٹ غائب ہونے لگی۔

''عمل بھی ہمارا ایسا ہی ہوتا ہے۔'' فیضان رعد کی طرح کڑکا۔

جب کرنل شولوخوف نے اس کی فائل پڑھی تو پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ یقیناً اس نوجوان کو ملاؤں نے ورغلا لیا ہے کیونکہ یونیورسٹی کے غیر ملکی طلبہ کے گروپ میں اس کا شمار ان طالبعلموں میں ہوتا تھا جو انتہا پسند کمیونسٹ نظریات رکھتے تھے۔ اور کرنل شولوخوف کے تجربے نے اسے بتایا تھا کہ انتہا پسند نظریاتی لوگوں کی بڑی کمزوری یہی ہوتی ہے کہ وہ اتنی ہی شدت سے متضاد نظریہ بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اسے امید تھی کہ فیضان اوغلو کو واپس لایا جا سکتا ہے۔

فیضان اوغلو کو واپس لانا بہت ضروری اور سود مند تھا وہ مجاہدین کے جتنا اندر جا چکا تھا اس کی اہمیت اتنی ہی کے۔جی۔بی کے نزدیک بڑھ چکی تھی۔ اگر وہ تعاون پر رضامند ہو جاتا تو ان لوگوں کی بہت بڑی دردسری ختم ہو جاتی اور کابل میں وہ شرپسندوں کی کمر توڑ کر رکھ دیتے۔

شولوخوف کی کامیابی کا یہی راز تھا کہ وہ ٹھنڈے دماغ کا گرم مزاج آدمی تھا۔ اس میں برداشت کا حوصلہ بہت زیادہ تھا۔ اتنا زیادہ کہ بسا اوقات ہیڈ کوارٹر اس کے رویے پر جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتا لیکن آج تک اس نے جو کہا وہ کر گزرا۔ اسی باعث اعلیٰ حلقوں میں اس کا ایک مقام بن چکا تھا۔

''میرا خیال ہے تمہیں آرام کرنا چاہئے، ہم اطمینان سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کریں گے۔''

شولوخوف نے بڑی نرمی سے فیضان کا کندھا تھپتھپایا۔

اس کے اشارے پر ایک ضابطہ نے فیضان کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کا مظاہر کیے باہر نکل آیا...... دو مسلح محافظ اسے اپنے جلو میں لیے دوسرے بلاک کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس کے باہر نکلتے ہی کرنل شولوخوف مسکراتا ہوا اپنی میز پر رکھے انٹرکام کی طرف پلٹا، ایک مخصوص بٹن دبانے پر اس کا رابطہ "ٹارچر سیل" کے انچارج میجر بونا کوف سے ہوگیا۔ اس نے الفاظ چباتے ہوئے بونا کوف کو کچھ احکامات جاری کئے اور دوبارہ اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کرسی سے پشت سہلاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی: منصوبے کا پہلا حصہ تو مکمل ہوگیا۔"

❀......❀......❀

ٹارچ سیل

رات 12 بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تھی اور اسے آج تین روز کے بعد گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ اب ان لوگوں کے لیے ہفتہ وار چھٹی والی تو کوئی بات رہ نہیں گئی تھی۔ مہینے میں بمشکل ایک یا دو خوش قسمت دن چھٹی کے نصیب ہوتے تھے۔

عمارت کے کمروں میں سے چھنتی ہوئی روشنی کہیں کہیں کھڑکیوں سے باہر جھانکتی دکھائی دیتی تھی ورنہ تو ہر سو اندھیرے یا پھر یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں کی حکمرانی تھی، اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے احمد اس اندھیرے ہی کا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

اپنے بلاک سے موٹر سائیکل تک پہنچتے ہوئے اسے تین مرتبہ شناخت کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ مرکزی دروازے تک وہ موٹر سائیکل کو بغیر انجن سٹارٹ کئے گھسیٹتا ہوا لایا تھا۔ اس کی پہچان مکمل ہونے کے بعد آہنی دروازہ کھلا اور جونیئر ضابط احمد ترسون موٹر سائیکل گھسیٹتا باہر نکل آیا۔ اس نے خصوصی کرفیو کارڈ اپنے اوورکوٹ کے باہر ٹانک لیا تھا کہ راستے میں اسے روکنے پر زیادہ تردد نہ کرنا پڑے۔

باہر نکل کر اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی تو روسی بائیک کی آواز سے جیسے ساری فضا تھرتھرا اٹھی۔ اس کا رخ، کابل، جلال آباد روڈ کی طرف تھا۔ اسی روڈ پر واقع ایک آبادی میں اس کا گھر تھا جہاں احمد ترسون کی ماں اور بہن اس کی منتظر تھیں۔ اس کا والد غزنی میں پھلوں کا کاروبار کرتا تھا اور مہینے میں ایک آدھ دفعہ ہی گھر آیا کرتا۔

راستے میں تین مرتبہ سڑکوں پر چکراتی آرمی کی جیپوں نے اسے روک کر اس کا کرفیو کارڈ چیک کیا۔ اب وہ قدرے غیر آباد علاقے کی طرف نکل آیا تھا۔ یہ سڑک ایک پہاڑی سلسلے کے درمیان سے گزرتی تھی۔ ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر اس نے موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ کرتے بالآخر اس کا انجن بند کر دیا۔

بادی النظر میں یہی دکھائی پڑتا تھا جیسے پلگ میں کچرا آ جانے کی وجہ سے موٹر سائیکل رک گئی ہو۔ سڑک کے ایک کنارے پر اس نے موٹر سائیکل کھڑی کر لی......!!

کابل کی جان لیوا سردی رگوں میں لہو جمائے دیتی تھی، لیکن احمد ترسون کے نزدیک اس لمحے سردی گرمی کا احساس ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں بھی یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ موٹر سائیکل کا ٹول بکس کھول کر اس میں سے پلگ پانا نکالنے کے بعد پلگ باہر نکال رہا تھا۔ جب اندھیرے میں پہاڑی سلسلے میں اس نے ایک سایہ برآمد ہوتے دیکھا۔

نووارد نے کچھ فاصلے پر رک کر ایک پنسل ٹارچ جلا بجھا کر مخصوص قسم کا اشارہ کیا۔ بیٹھے بیٹھے احمد ترسون نے اپنے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول باہر نکالا۔ اس کی گرفت اجنبی کے اس سمت بڑھتے قدموں کے ساتھ ساتھ پستول کے دستے پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

نووارد اس کے نزدیک پہنچ کر ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی سمت اٹھی پستول کی نال دیکھ لی تھی۔

"آمدم برسر مطلب؟"

احمد نے بڑے سرد لہجے میں اس کی طرف جھانکا۔

دوسری طرف سے پشتو میں ایک خاص لفظ سننے کے بعد اس نے پستول نیچے جھکا لیا۔

دو تین فقروں میں اس نے نووارد کے ساتھ "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ کر لیا تھا۔ اور مطمئن ہوتے ہی اس نے اپنے پاؤں میں پہنے لونگ بوٹ میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر اسے تھما دیا۔

"فی امان اللہ" اجنبی نے کہا اور منہ موڑ کر اس طرف چل دیا جس طرف سے اس کی آمد ہوئی تھی۔

"خدا حافظ" احمد ترسون آہستہ سے بڑبڑایا اس نے پلگ دوبارہ فٹ کیا۔ ٹول بکس باندھا اور موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی۔

جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اپنے فرائض سے وہ بڑے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہو چکا تھا۔ اس نے فیضان اوغلو کی گرفتاری کی خبر مجاہدین کو پہنچا دی تھی۔

امیر داد خان کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کے گرد اگرد بیٹھے پانچوں مجاہد بھی خاموش تھے وہ سب اپنے امیر کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوئے بھی انہیں شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پانچوں ہی اس حادثے کے ذمہ دار تھے۔

امیر داد خان کو صرف ایک ہی سوچ پریشان کر رہی تھی! "ان کے درمیان کوئی حکومتی مخبر ہے ضرور، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس طرح افغان سیکرٹ سروس فیضان اوغلو تک پہنچ جاتی۔" اور یہاں اپنے معتمد ساتھیوں کے درمیان وہ نجانے کیوں اپنے اندیشے کو نوک زبان پر لاتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔

"میرے خیال سے ٹھکانہ بدل لیا جائے۔"

اچانک پانچوں میں سے ایک نے اسے مخاطب کیا۔

امیر داد کے سامنے رکھی قہوے کی پیالی ٹھنڈی ہو رہی تھی حالانکہ وہ "لب سوز" قہوہ پینے کا عادی تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بات کہنے والے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ پھر دوبارہ چہرہ اسی سمت کر لیا۔

"میرا خیال ہے امیر!" اس کا دوسرا ساتھی بولا۔ "قاسم ٹھیک کہتا ہے۔"

"آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟" امیر دار خان نے باقی تینوں کو مخاطب کیا۔

تینوں خاموش رہے۔ کوئی بات ان تینوں کی زبان پر آ کر اٹک جاتی تھی۔ بالآخر ان میں سے ایک نے گلا کھنکار کر کہا۔

"یہ ٹھکانہ تو ہمیں بڑی مشکل سے میسر آیا ہے۔ جہاں بیٹھ کر ہم شہر پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ واحد جگہ ہے جو دشمن کے

جاسوس بجلی کا پتروں کی برقی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اگر یہ ٹھکانہ بھی چھوٹ گیا تو ہمیں شاید ایسی شاندار پناہ گاہ میسر نہ آ سکے۔''

''لیکن فیضان بہرحال گوشت پوست کا انسان ہے۔ وہ کسی بھی کمزور لمحے کی گرفت میں آ سکتا ہے۔'' قاسم نے مداخلت کی۔

پہلے بات اور تھی، اب روسیوں کی آمد کے بعد سے ان کے پاس برقی آلات تفتیش آ گئے ہیں جن کے ذریعے وہ بڑے بڑے سخت جانوں کی زبان بھی کھلوا لیتے ہیں۔'' دوسرا بولا۔

اس کے بعد پھر سب خاموش ہو گئے۔ ان کی نظریں اپنے امیر کی طرف لگی تھیں، جن کا فیصلہ بہرحال حتمی ہوتا۔

''میرے دوستو!'' بالآخر امیر داد خان بولا۔ ''اگر تو آپ لوگ یہاں سے کوچ کرنے کا اس لیے سوچ رہے ہیں کہ فیضان اوغلو کرنل شولو خوف کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا تو میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بعض لوگ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ہم ان پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں گو کہ یہ بات ہمارے اصولوں سے لگا نہیں کھاتی، لیکن ایسا ہے۔ فیضان اوغلو مر جائے گا لیکن اس کی زبان نہیں کھلے گی۔ میں یہ بات اتنے ہی اعتماد سے کہہ رہا ہوں جتنے اعتماد سے ہم یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔''!

''خان ہمارا مقصد بخدا یہ ہرگز نہ تھا کہ ہمیں فیضان پر اعتماد نہیں۔ یہ سب تو ہم بطور احتیاط کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کابل میں ہمارے دو تین سرکردہ آدمی بھی پکڑے گئے تو ہم اپنے سینکڑوں ہمدردوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بہرحال آپ کا حکم سر آنکھوں پر......''

''قاسم خان!'' اس مرتبہ امیر داد خان کی آواز میں رعد کڑک رہی تھی: ''اول تو ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا اگر ایسا ہوا بھی تو روسی فوج ہماری گرد کو بھی نہ پہنچ سکے گی۔ متبادل راستوں پر میری نظر ہے۔ ہمارے ساتھی پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔''

''جو حکم یا امیر'' قاسم خان مطمئن ہو گیا۔

امیر داد خان نے قہوے کی پیالی ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دی اور اپنے ساتھیوں کی طرف گھوما:

''سجاول خان کو پیغام روانہ کرو کہ ہم اس کی سمت سے پسپائی اختیار کریں گے! بھاری ہتھیار لے کر اگلے ٹھکانے کی طرف کوچ کر جاؤ۔ جلال آباد کے دوستوں کو نئی صورت حال سے آگاہ کر کے اگلی ہدایات حاصل کرو۔ اس ٹھکانے پر صرف آٹھ مجاہد چھوڑ کر باقی سب کو لے کر متبادل راستوں سے سجاول خان کی طرف نکلنے کی تیاری کرو۔ روانگی اگلی اطلاع آنے کے بعد ہوگی......!''

''تعمیل ہوگی یا امیر!'' قاسم نے کہا اور پانچوں ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے لیے باہر نکل گئے۔

☆☆

احمد ترسون کی واپسی اگلے روز دوپہر کے بعد ہوئی اس کی ڈیوٹی کے اوقات 3 بجے دوپہر کے بعد شروع ہوتے تھے۔ دروازے تک اس کی بوڑھی ماں اسکو الوداع کہنے آئی تھی۔ اس نے حسب سابق روانگی سے پہلے اس کا سر اور ماتھا چوم کر اسے دعائیں دیں۔ ریشم جان کا اس دنیا میں اور تھا ہی کون؟''

ایک اس بیٹے کے لیے اس نے کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ تعلیم مکمل کرتے ہی احمد ترسون باپ کے کاروبار میں

اس کا ہاتھ بٹائے۔ ان کی تو پشتوں میں بھی کسی نے حکومتی نوکری نہیں کی تھی۔ یہ بات ان کے نزدیک ایک طعنہ تھی کہ فلاں خان کا فلاں بیٹا نوکر ہے، لیکن برا ہو جدید تعلیم کا جس نے احمد ترسون کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

ریشم جان کی شادی اس کے والدین نے بہت کم عمری ہی میں اپنے خاندان میں کر دی تھی۔ بیچاری تیسرے ہی مہینے بیوہ ہوگئی اور خاوند کی وفات کے سات ماہ بعد احمد ترسون پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرداخت کا سوال ہمیشہ ریشم جان کو ڈستا رہتا تھا۔ کیونکہ اس معاشرے میں دوسری شادی کا تصور ہی بڑا اذیت ناک تھا۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد جب وہ غزنی اپنے گھر گئی تو اس کی نیکوکاری اور پرہیزگاری سے متاثر ہو کر اس کے خاندان کے ایک اور نوجوان نے اس کے والدین سے ریشم جان کا رشتہ مانگا۔ اس نوجوان کا قریبی رشتہ دار تو تھا نہیں۔

بہرحال ریشم جان کے والدین نے اسے تائید غیبی جانا اور ''ہاں'' کر دی۔

ایک سادہ سی تقریب میں ان کا نکاح ہوگیا۔ تب احمد ترسون بمشکل دو سال کا تھا۔ اس کا والد غزنی سے فروٹ وغیرہ لے جا کر کابل کی منڈی میں فروخت کیا کرتا تھا۔ پھر وہ یہیں کا ہو رہا۔ ان کا گھرانا کابل ہی میں آ گیا اور خادے خان نے کبھی ریشم جان کو اس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ احمد ترسون اس کا سوتیلا بیٹا ہے یا سگا۔

اس نے اپنے بیٹے کو کابل کے مشنری سکول میں تعلیم دلوائی اور اس کی خواہش پر اسے سرکاری نوکری کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ خادے خان زیادہ تر منڈی میں اپنے کاروبار ہی میں مصروف رہتا۔ اور گھر کم ہی آیا کرتا تھا۔ احمد البتہ دوسرے تیسرے روز ضرور اس سے مل لیا کرتا تھا۔

گھر سے روانہ ہونے کے بعد اس نے واپسی کا بھی وہی راستہ اختیار کیا تھا۔ جس راستے سے وہ دفتر سے گھر آیا تھا۔ پہاڑی سلسلے کی اس سڑک پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر اسکی موٹر سائیکل کی رفتار کم ہونے لگی۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ اگلے شیشے میں ایک آرمی ٹرک کو اپنے پیچھے آتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ اسے آگے نکلنے کا موقع دے رہا تھا۔

ٹرک سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس نے رات والے موڑ کے نزدیک پہنچ کر ایک مرتبہ پھر موٹر سائیکل کھڑی کر دی۔ اس مرتبہ اس نے یہاں قیام کا دوسرا بہانہ تراشا۔ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے میں پیشاب کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ جگہ اسے نظر آ گئی۔

ایک پتھر کے نیچے سے نکلا ہوا ایک نیلے رنگ کا لفافے کا کونہ اسے بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے وہیں بیٹھ کر لفافہ باہر نکالا۔ اسے چاک کر کے ایک رقعہ برآمد کیا۔ جس پر ایک مختصر سا ہدایت نامہ لکھا تھا۔

احمد ترسون نے رقعہ پڑھنے کے بعد جیب سے سگریٹ لائیٹر نکال کر اسے جلا دیا اور جلا کر اس اطمینان کے بعد کہ اس کی راکھ میں سے کسی کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس نے لائیٹر سے سگریٹ سلگایا اور اس کے لمبے لمبے کش لیتا وہاں سے باہر نکلا آیا۔ اس سارے عمل میں اس کے بمشکل دو دیا

تین منٹ لگے ہوں گے اور اس سے کم وقت میں کسی افغان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ استنجا سے فارغ ہو جائے گا۔

اپنی موٹر سائیکل کی طرف آتے ہوئے اس نے انہیں پہاڑی ٹیلوں کی اوٹ میں غائب ہوتے اس مجاہد کو نہیں دیکھا تھا۔ جس نے سڑک سے یہاں تک اس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اور جو ہوا میں اڑتے پرندے کو مار گرانے کی مہارت رکھتا تھا۔

یہ تھا قاسم ایشان زادہ.........!

امیر داد خان کے عقابوں میں سے ایک!

اس کے بعد دفتر پہنچنے تک اس کو کہیں رکنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ مدھم سروں میں سیٹی بجاتا بڑی لاپرواہی سے حسب سابق موٹر سائیکل کو گھسیٹ کر اندر لایا۔ آج اتفاق سے مین گیٹ پر وہ محافظ ڈیوٹی دے رہے تھے جو اس سے واقف تھے ورنہ تو بار بار اپنی شناخت کروانے سے اسے بہت الجھن ہوتی تھی۔

اس سے پہلے کبھی ایسی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن ''قوائے دوست'' کی آمد کے بعد سے عجیب عجیب باتیں سننے اور مشاہدے میں آنے لگی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ایک دوسرے سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان لوگوں کو ایک سے دوسرے بلاک تک جاتے ہوئے بھی اپنی شناخت کروانی پڑتی تھی۔

اس سے پہلے تو وہ لوگ کھل کر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کر لیا کرتے تھے لیکن روسی افسران کی آمد کے بعد سے تو وہ ایک دوسرے سے کھل کر بات کرتے ہوئے بھی جھجکتے تھے۔ بڑی تلخ فضا میں آج کل وہ لوگ کام کر رہے تھے۔

ماحول کچھ ایسا بن گیا تھا کہ خواہ مخواہ وہ لوگ ایک دوسرے پر شک کرنے لگے۔ اس کی وجہ وہ واقعات تھے جو پچھلے دنوں یکے بعد دیگرے پیش آئے تھے:

اگر کوئی جونیئر یا سینئر ''ضابطہ'' ہنسی مذاق میں بھی اپنے دفتر یا کنٹین میں بیٹھے کوئی بات حکومت یا ''مشاوروں'' کے خلاف کہہ دیتا تو اگلے ہی روز اس کی جواب طلبی افسر اعلیٰ کے سامنے ہو جاتی اور ایک سخت وارننگ بھی اس کے ساتھ ہی مل جاتی۔

''دیوار ہم گوش دارد'' ان سبھوں کو یہ بھولا ہوا سبق بڑا اشدت سے یاد رہتا تھا اور کبھی بڑے جی جان سے اس پر عمل پیرا بھی تھے۔

اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے جب وہ ڈیوٹی افسر کے پاس حاضری رجسٹر میں اپنی حاضری لگانے گیا تو ایک پیغام اس کا منتظر تھا۔

''فوراً آپریشن چیف سے ملیے۔''

ایک لمحے کیلئے تو جیسے وہ چکرا کر ہی رہ گیا۔ ابھی تک اس کا براہ راست سامنا کرنل شولوخوف سے نہیں ہوا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اسی کی پیشی ہوئی تھی۔ اس کے فرائض کچھ اس قسم کے تھے کہ وہاں براہ راست کرنل شولوخوف سے ٹکرانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ''پھر یہ سب آخر کیا ہے؟'' اس نے پریشانی سے سوچا اور بڑی بددلی سے اس کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆

فیضان اوغلو کے سفر کا خاتمہ جس بلاک کے سامنے ہوا وہ سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ یہ بلاک ایک چھوٹے سے قلعے کی شکل میں تھا جس کی چار دیواری کے درمیان ایک لوہے کا مضبوط پھاٹک لگا ہوا تھا۔

اس پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ دروازے کے اندر دروازے سے ملحقہ کیبن میں بیٹھے دو بے کٹے "ضابطوں" کو فیضان کا چارج دے کر اس کے ساتھ یہاں تک آنے والے واپس چلے گئے۔

ان کے واپس جاتے ہی وہاں موجود تین چار عسا کر فیضان کو دھکیلتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے جہاں اس کے جسم پر صرف ایک زیر جامہ رہنے دیا گیا اور اس کی دوبارہ تلاشی لی گئی...... اس کے اونی کپڑے بھی وہیں رکھ لئے گئے۔ اور ایک پتلون اور قمیض کے ساتھ ننگے پاؤں وہ لوگ دوبارہ اسے دھکے دیتے ہوئے ایک ہال کمرے کی طرف لے گئے۔

ابھی اس نے ہال میں قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کم از کم دس آدمی بیک وقت اس پر پل پڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں اور لاتوں سے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ فیضان کے ہاتھ بدستور پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ اس لیے اس کی طرف سے مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے بسی سے مار کھاتا رہا۔ لاکھ ضبط کرنے کے باوجود اس کے منہ سے کئی مرتبہ کراہیں نکلیں۔ بالآخر اس نے اپنے ہونٹ اس سختی سے دانتوں تلے بھینچے کہ نچلے ہونٹ سے لہو رسنے لگا۔

اپنے لہو کا ذائقہ ابھی اسکی زبان پر ہی تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

فیضان کو ہوش آیا تو وہ سنگلاخ فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک پھٹا پرانا کمبل تھا۔ جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ اور اس کا بند بند ٹوٹ رہا تھا بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم کو ہتھوڑوں کی مدد سے کوٹا گیا ہو۔

درد اس کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا تھا لیکن وہ چپ چاپ پڑا رہا۔

اسے ہوش میں آتے دیکھ کر "ضابط" اس کی طرف لپکا۔ اس نے فیضان کو کچھ کہے سنے بغیر صرف اس کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کیا اور کسی کو رپورٹ کرنے چلا گیا۔ فیضان کو اذیت ناک درد کے ساتھ، شدید سردی اور پیاس کا احساس بھی ہو رہا تھا، لیکن وہ اپنی طرف سے حتی المقدور کسی کمزوری کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اٹھ کر بیٹھنے کی سکت اس میں نہیں تھی، لیکن کسی نہ کسی طرح وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے سیل کے دروازہ کھلا اور تین چار سپاہی اندر در آئے انہوں نے بڑی بیدردی سے اسے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر باہر گھسیٹنا شروع کر دیا تھا۔

وہ فیضان اوغلو کو اس طرح گھسیٹتے ہوئے باہر لے جا رہے تھے جیسے وہ انسان کے بجائے کوئی مردہ جانور ہے جسے گڑھے میں پھینکنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ فیضان کا جی تو چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح اٹھ کر وہ ان کی بوٹیاں نوچ لے لیکن...... اس میں مزاحمت کی تمام قوتیں ہی دم توڑ چکی تھیں۔

اس اذیت ناک سفر کا اختتام اسی ہال نما کمرے میں ہوا جہاں اس پر پہلی باقاعدہ قیامت ٹوٹی تھی۔ ایک ٹھگنے قد کا روسی میجر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر سفاکی اور درندگی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں مسلسل بھینچے رہنے سے اس قدر نمایاں ہوگئی تھیں کہ وہ اس کے چہرے سے بالکل الگ دکھائی دیتی تھیں۔ جو لوگ فیضان اوغلو کو یہاں تک لے کر آئے تھے انہوں نے اسے میجر کے قدموں کے نزدیک ڈھیر کر دیا۔ جس نے اپنی شعلہ برساتی آنکھیں فیضان پر گاڑی ہوئی تھیں اور جو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی کو جس کے ایک کونے پر لوہے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ بار بار اپنے بائیں ہاتھ پر مار رہا تھا۔

اس نے اچانک ہی ایک زوردار ٹھوکر فیضان کی پسلیوں میں رسید کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''میرا نام میجر بوناکوف ہے۔ تم یقیناً مجھے جانتے ہوگے۔''

فیضان بوناکوف کو تو نہیں جانتا تھا لیکن اس نے قیام ماسکو کے دوران کے۔ جی۔ بی سے متعلق جو جو حکایتیں سن رکھی تھیں اور جن جن طریقوں سے وہ لوگ ملزموں کی تفتیش کرتے تھے ان کے متعلق جو کچھ وہ جانتا تھا اس کے بعد اگر بوناکوف اسے اپنا نام نہ بھی بتاتا تو کوئی بات نہیں تھی......

وہ میجر کو روسی افواج کی وردی پہنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆

کرنل شولوخوف کے ہمدردانہ رویے کے بعد بوناکوف کے اس اچانک بہیمانہ سلوک سے وہ بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ نفسیاتی اذیت کا طریقہ ''خاذ'' کے بس کا روگ نہیں۔ اس پردہ زنگار کے پیچھے بھی یقیناً کے۔ جی۔ بی کا دماغ ہی کام کر رہا تھا۔

وہ خاموشی سے زمین پر بیٹھا بوناکوف کو گھورتا رہا۔ اسے جھکنا آتا ہی نہیں تھا۔ میجر بوناکوف نے ٹہلتے ہوئے ایک چکر اس کے گرد اگرد کاٹا اور اچانک ایک اور زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں جما دی۔

فیضان اوغلو کو یوں محسوس جیسے اس کی پسلیاں ٹوٹ چکی ہوں۔ اس کے چلانے پر میجر کے منہ سے بااختیار قہقہہ بلند ہوا۔ جیسے اسے اس ''کراہ'' پر بہت خوشی ہوئی ہو۔ اس نے وحشیوں کی طرح بلند آہنگ قہقہہ لگاتے ہوئے فیضان اوغلو کو اپنی چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیا۔

وہ سپاہی جو فیضان کو یہاں لائے تھے ہنسنے میں میجر بوناکوف کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ جیسے ہنسنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہو...... بوناکوف اچھل اچھل کر فیضان کو ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اور چھڑی سے بھی پیٹ رہا تھا۔

اس لمحے فیضان کو ''رومن اکھاڑہ'' یاد آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ رومی غلام ہے اور یہ وحشی درندے سب ''نیرو''...... کے حواری ہیں۔

اچانک بوناکوف کے قہقہے رک گئے۔ اس کے ساتھ ہی باقی لوگ بھی خاموش ہوگئے۔ وہ سب کسی ایک مشین کے کل پرزے نظر آ رہے تھے۔

میجر بوناکوف کے اشارے پر ایک سپاہی باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی ایک سٹینوگرافر کے ساتھ ہوئی جو ہاتھوں میں کاغذ قلم تھامے کمرے

کے ایک کونے میں کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔اس کے ساتھ ہی وہاں رکھے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن ہو گیا۔

''تمہارا نام؟'' بونا کوف کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

''تمہاری فائلوں میں لکھا ہے۔''

فیضان اوغلو سوائے اظہار نفرت کے اور کسی بات پر قادر نہیں تھا۔

''کس گروپ سے تعلق ہے؟''

''افغانستان سے۔''

''اخوندزادے کو کس کے کہنے پر قتل کیا گیا؟''

''اپنی مرضی سے''......

وہ ہر سوال کا جواب اکھڑا لہجے میں دے رہا تھا۔

ابھی تک اس کے کسی جواب سے بونا کوف کو طیش نہیں آیا تھا۔شاید وہ نفسیاتی طور سے ہر طرح فیضان اوغلو پر اپنی برتری جتانے پر تلا ہوا تھا۔

''شہر نو میں ہونے والے واقعے میں کس کا ہاتھ تھا؟''

''میرا''......

''تم نے کس کے کہنے پر بم پھینکا''......

''میں کسی کے کہنے پر کچھ نہیں کرتا۔''

میجر بونا کوف کے چہرے سے کسی کیفیت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔صرف اس دوران میں وہ اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو حسب عادت دوسرے ہاتھ پر مارتا اچانک وہ زوردار آواز میں دھاڑا۔''مارو......اسے مارو'' وہ وحشیوں کی طرح چلا چلا کر وہاں موجود سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ سب لوگ فیضان اوغلو پر ٹوٹ پڑے۔ایک مرتبہ پھر وہ پہلے والی کیفیت سے گزر رہا تھا۔میجر بونا کوف اس درندگی میں پیش پیش تھا۔وہ دیوانہ وار اس پر چھڑیاں برسا رہا تھا جب کہ باقی لوگ اسے ٹھوکریں اور گھونسوں سے مار رہے تھے۔!

مسلسل مار سے اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔چہرہ نیلا پڑنے لگا اور ایک مرتبہ پھر فیضان اوغلو پر غشی طاری ہونے لگی......!!

کمرے کے باہر پہنچ کر احمد ترسون نے اپنی شناخت پیش کی۔باہر موجود خصوصی محافظوں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور سروس پستول رکھ کر اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔کمرے میں خلاف توقع کرنل شولوخوف اپنی کرسی پر موجود دروازے پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر احمد ترسون کو خوش آمدید کہا اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے تمہاری فائل دیکھی ہے۔''

کرنل شولوخوف نے اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

''یس سر''...... احمد ترسون نے تھوک نگلا۔

''تم بہت اچھے جا رہے ہو۔''

''شکریہ جناب۔'' اس کے حواس ٹھکانے آنے لگے۔

''تمہاری شرافت کی وجہ سے تمہارے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ اصولاً تمہیں اب تک ''سینئر ضابط'' ہونا چاہئے تھا۔''......

کرنل شولوخوف بڑے خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

احمد ترسون کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی اس بات کا کیا جواب دے۔ وہ خاموش بیٹھا اس کے چہرے کو تکتا رہا جہاں کسی سختی یا بد اخلاق کا دور دور تک نام و نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟''

''نہیں جناب''...... بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''سنائی''......

سنائی تارچ سیل کا افغان انچارج تھا۔ اور حال ہی میں اسے احمد کے شعبے سے اس خصوصی شعبے میں ترقی دے کر منتقل کیا گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے اس کا افسر اعلیٰ تھا اور کبھی احمد کے کسی کام سے خوش نہیں ہوا تھا۔

وہ خاموشی سے کرنل شولوخوف کا منہ دیکھتا رہا۔

''وہ اسفندیار کا خاص آدمی ہے...... اور یہ بڈھا زیادہ ہی اعتماد کرتا ہے۔'' اس پر کرنل نے اپنی بات جاری رکھی۔

احمد کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

''میں تمہیں ایک مہینے میں ''سینئر ضابط'' بنا دوں گا۔''

''شکریہ جناب''...... احمد نے بڑے انکسار سے جواب دیا۔

''لیکن ایک شرط ہے۔''

اچانک جیسے ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

''کیا جناب؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''دیکھو تم آج سے تارچ سل میں تبدیل ہو رہے ہو۔ سنائی کی حرکات پر نظر رکھو۔ اس کے پل پل کی خبر براہ راست مجھے دو۔ درمیان میں کسی سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ہر وقت مجھ سے رابطہ کرنے کی خصوصی اجازت ہوگی۔'' کرنل شولوخوف کی مکارانہ مسکراہٹ اس

کے ہونٹوں سے بدستور چپکی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے جناب۔'' احمد ترسون نارچ سیل تک اس طرح اپنی رسائی پر دل ہی دل میں جھوم ہی تو اٹھا تھا...... یہ واقعی اس کے لیے تائید غیبی تھی۔

اسی دوران ایک مؤدب بیرا ان کے سامنے کافی کے دو مگ رکھ کر واپس چلا گیا۔

''اور ہاں''...... کرنل شولوخوف نے ایک مگ اس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔'' اور اگر تم اس کا کوئی تعلق تخریب کاروں سے ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر احمد ترسون کے چہرے کی بدلتی کیفیت کا جائزہ لیا اور بولا: ''سنائی کی جگہ پھر تم سنبھال سکتے ہو۔''

''میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا جناب۔'' احمد ترسون نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''ایک بات کا خیال رہے؟'' اچانک کرنل دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔

''جناب؟''

''زیادہ چالاکی نہیں...... ہاں! سمجھ گئے نا! تم جانتے ہو ہمیں جلدی بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔''

''یس سر۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

جب احمد ترسون اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالے اپنے بلاک کی طرف جا رہا تھا تو اس کو کم از کم ایک بات کی اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی کہ آخر کرنل شولوخوف کو اس دفتر کے معمولی ملازمین سے افسر اعلیٰ تک کی ہر خفیہ بات کا علم کیسے ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا: ''کہ اب وہ فیضان اوغلو سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا ورنہ اس تک ''خصوصی پیغام'' پہنچانے کے لئے نجانے اسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے۔''

❁......❁......❁

دوسرا محاذ

7 جون 1982ء کی ایک شام......

ویٹی کن سٹی میں صدر ریگن کی آمد نے ساری دنیا کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ امریکی صدر کی آمد عام حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ ساری دنیا کے باخبر حلقے اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ 79ء میں پوپ جان پال کے دورہ پولینڈ پر جس والہانہ انداز میں پوپ جان پال کا استقبال کیا گیا تھا اس کے بعد سے امریکی حکومت کی دلچسپی ویٹی کن سٹی میں کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگی تھی۔

پولینڈ مشرقی یورپ کا اشتراکی گڑھ تو تھا ہی...... اس کے ساتھ ساتھ وہ پوپ جان پال کی جائے پیدائش بھی تھا۔

پوپ کو اپنی جائے پیدائش سے خصوصی دلچسپی تھی اور ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ کسی بھی طرح پولینڈ روس کے پنجہ استبداد سے رہائی حاصل کرلے۔ پوپ کی پولینڈ آمد پر 60 لاکھ پولش باشندوں نے جس والہانہ انداز سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے بعد سے پولینڈ کی اشتراکی حکومت کے خلاف سرگرم عمل "سالیڈیریٹی تحریک" کو خصوصی تقویت حاصل ہوگئی تھی......

اس کے ساتھ ہی سی آئی اے متحرک ہوئی اور اس نے سالیڈیریٹی تحریک کے لخ ویلسیا کو اپنا گھوڑا بنالیا۔

سی آئی اے کو اب لخ ویلسیا کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے چرچ کی خصوصی معاونت درکار تھی کیونکہ کلیسا کی مدد کے بغیر وہ اشتراکی جبر کی مزاحمت بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکتے تھے...... اشتراکی حکومت نے 1981ء تک سالیڈیریٹی موومنٹ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں تھیں اور یہ باور کیا جانے لگا تھا کہ اب لخ ویلسیا کا سحر ٹوٹ جائے گا۔ اس مرحلے پر اگر امریکی حکومت کی درخواست پر پوپ جان پال کا یہ دھمکی آمیز پیغام روس کو نہ ملتا کہ اگر اس کی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کیا تو کلیسا اس کے مقابل کھڑا ہو جائے گا تو اب تک روسی افواج پولینڈ میں داخل ہو چکی ہوتیں۔

امریکیوں کو حیرانگی اس بات کی تھی کہ ایک طرف افغانستان کی تحریک مزاحمت ہے جس کو وہ PEANUTS (مونگ پھلی) جتنی امداد دے رہے ہیں لیکن اس کے نتائج حیرت انگیز طور پر شاندار اور چونکا دینے والے ہیں۔

اور...... دوسری طرف پولینڈ کی تحریک مزاحمت جس کے پیچھے کلیسا، پنٹاگان، سی آئی اے کی طاقت کروڑوں ڈالر کی امداد ہے لیکن وہاں نتائج نہ ہونے کے برابر حاصل ہو رہے تھے۔

آخر دونوں تحریک مزاحمت میں فرق کیا تھا؟

امریکیوں کو جلد ہی اس سوال کا جواب مل گیا۔

یہ فرق تھا پاکستان انٹر سروسز انٹیلی جنس ایجنسی کا چیف میجر جنرل اختر عبدالرحمٰن خان......

کرخت چہرے، سمارٹ بدن اور عقابی آنکھوں والے اس جرنیل نے افغانستان کو روس کا قبرستان بنانے کا آغاز ایسا بھرپور اور جاندار کیا تھا کہ سی آئی اے انگشت بدنداں تھی...... 1946ء کے اواخر میں فوج میں کمیشن حاصل کرنے والا جنرل اختر عبدالرحمٰن صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے صرف دو سال جونیئر تھا......

چالیس سال بعد جب جنرل ضیاء الحق اپنی فوجی سے زیادہ سیاسی ذہانت کے بل بوتے پر پاکستان کا صدر بنا ہوا تھا تو اختر عبدالرحمٰن آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل تھا۔ پچاس سال کی عمر میں انہیں انفنٹری ڈویژن کی کمان سونپی گئی تھی جس کے ہمراہ 1974ء سے 1978 تک وہ آزاد کشمیر میں رہے......

ان کے شاندار ماضی کو دیکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی تھی کہ اس جرنیل کی ترقی کی رفتار قدرے سست رہی اور انہیں ترقی دینے کے ہر مرحلے پر بطور خاص نظرانداز کر دیا گیا۔ ڈی جی آئی ایس آئی بننے سے پہلے ان کی آخری تقرری فوج کے ایڈ جوئنٹ جنرل کی حیثیت سے تھی......

جنرل اختر عبدالرحمٰن نے اپنے عہدے کا چارج لیا تو افغانستان میں تحریک مزاحمت مضبوط ہو رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے پاکستان میں مقیم کچھ افغانی لیڈروں کو حکومت کی طرف سے نہ ہونے کے برابر امداد اور تربیت دی جارہی تھی......

لیکن...... اپنے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بمشکل چھ ماہ بعد ہی اختر عبدالرحمٰن کو اس صدی کے سب سے بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

روس کے 80 ہزار فوجی کابل میں مورچہ بندی کر چکے تھے اور پاکستانی صدر جنرل ضیاء الحق کو اس کے مشیر ایک ہی مشورہ دے رہے تھے کہ پاکستان اپنی خیر منائے روس سے "پنگا بازی" پاکستان کو لے ڈوبے گی......

صدر پاکستان جانتا تھا وہ کیسے خطرناک جغرافیائی پھندے میں پھنسا ہے۔

مشرق میں 80 کروڑ ہندو اپنے جارحانہ عزائم کے ساتھ موجود تھے۔ مغرب میں روس کی سرخ فوج دریا آمو پار کر کے کابل میں ڈیرے جما چکی تھی۔ ایران میں انقلاب کے فوراً بعد ایران عراق جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور چین تبدیلی کے انقلابی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ چینیوں کے لیے اپنا دفاع مضبوط اور ناقابل تسخیر بنانا ناگزیر ہو چکا تھا......

فوجی قوت کے بل بوتے پر راج سنگھاسن سنبھالنے والے جرنیل کو بخوبی اپنی اندرون ملک مقبولیت کا احساس بھی تھا۔ وہ اسلامی جمہوری محاذ جس نے اسے درخواستیں کر کے بھٹو سے نجات دلانے کے لیے بلایا تھا اب بڑی بے چینی سے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تدبیر کر رہا تھا۔

عدالتی متنازعہ فیصلے کے بعد منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی چڑھانے کے بعد سے عملاً ساری دنیا سے جنرل ضیاء الحق کٹ چکا تھا۔ اس پس منظر میں روسی فوجوں کی کابل میں دراندازی نے ایک مرتبہ تو جنرل ضیاء الحق کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔

☆☆

جنرل اختر عبدالرحمٰن پر اس نے افغانستان کے حوالے سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور حیرت انگیز طور پر اس نے محسوس کیا کہ آہنی اعصاب کے مالک جنرل اختر کو اس مسئلے پر قطعاً کسی پریشانی کا سامنا نہیں......

ایسا پر اعتماد جرنیل اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن نے صدر ضیاء الحق کو حوصلہ دیتے ہوئے پر عزم لہجے میں کہا کہ اگر صدر محترم انہیں اجازت دیں تو وہ افغان مزاحمت کو بڑی گوریلا جنگ میں تبدیل کر دے گا اور افغانستان روسیوں کے لیے ویت نام بن جائے گا۔

جنرل اختر نے صدر کو افغانوں کی عسکری مدد کے لیے تیار کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے اس عمل سے ہی پاکستان کا دفاع ممکن ہوگا اور وہ افغانستان کو روس کے خلاف اپنی ''فسٹ ڈیفنس لائن'' بنا سکیں گے۔

جنرل ضیاء الحق کا ذہن دو امکانات پر غور کر رہا تھا۔ پہلا امکان تو وہ تھا جو جنرل اختر نے بتایا کہ بصورت دیگر پاکستان کی سلامتی داؤ پر لگی رہے گی اور دوسرا پہلو سیاسی تھا۔ بھٹو کو پھانسی چڑھانے کے بعد سے بین الاقوامی سطح پر خود کو تنہا محسوس کرنے والے جرنیل کے سیاسی دماغ نے فیصلہ کیا کہ روسی ریچھ کو للکارنے سے وہ مغربی دنیا کی ہمدردیوں کا بہر صورت مستحق ہو جائے گا......

اور......ایک مرتبہ اگر امریکہ اور مغربی دنیا نے اس کے روس مخالف کردار کو آشیرواد دے دی تو پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں مل کر اس کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔

AKHTAR! water in Afghanistan must boil,but at the right temperatur

اس نے بالآخر لمبی سانس لے کر جنرل اختر سے کہا۔

"......You will see sir......"

جنرل اختر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر جنرل اختر نے اپنے جانثاروں کو جمع کیا۔ انہیں صورتحال پر بریفنگ دی۔ صدر کی منشا سے آگاہ کیا۔ ان کی رائے لی۔ اپنے اسباب کا جائزہ لیا۔

زمینی صورت حال یہ تھی کہ تمام سوالات کے جوابات نفی میں ملتے۔ پنٹاگان اور سی آئی اے پہلے کابل کو ''ہاری ہوئی جنگ'' قرار دے چکے تھے......ان کے شہ دماغوں نے یہی فیصلہ دیا تھا کہ ایک ماہ میں روس سارے افغانستان پر قبضہ جمالے گا اور پھر افغانستان بھی مشرقی یورپ کی طرح روس کی جاگیر بن جائے گا......

''NO'' ......کرخت چہرے، عقابی آنکھوں اور مضبوط ارادے والے جنرل اختر عبدالرحمٰن نے سر جھٹکا......"Kabul must bearn"......اس نے اپنے ماتحتوں پر نظریں جمائے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"Yes Sir"

پر عزم ماتحتوں نے مضبوط ارادوں کا اظہار کیا..........

"Death by a thousand cuts"

جنرل اختر کی آواز میں رعد کڑک رہی تھی......

اس نے اپنے سپہ سالاروں کو روایتی گوریلا جنگ کا بھرپور آغاز کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ دنیا کی سپر پاور روس کے خلاف......!!

ہتھیار کہاں سے آئیں؟

سب سے پہلے سوال اٹھا۔ فوجی اسلحہ کے گودام کھنگالے گئے۔ کچھ تھری ناٹ تھری رائفلیں برطانوی ساختہ کچھ ٹینک شکن بارودی سرنگیں، اور چینی ساخت کے چند راکٹ لانچر۔ یہ تھا وہ ابتدائی ایمونیشن جس کے بل بوتے اور اپنی ایمانی قوت کے ساتھ جنرل اختر نے روس کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا......

جنرل اختر نے افغان مجاہدین کو ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ مضبوط کرنے پر توجہ مرکوز کی اور اسی سرحدی علاقے کو گوریلا جنگ کے بنیادی سپلائی علاقے کا کردار ادا کرنے کے لئے منتخب کر لیا......

وہ پاکستانی سرحد سے کابل تک سپلائی لائن مضبوط اور محفوظ کرنے کے عزم لے کر اپنے مشن پر ڈٹ گیا.......... روس کی بدقسمتی یا جنرل اختر کی خوش قسمتی افغانستان کی تمام سڑکیں کابل کی طرف جاتی تھیں کابل کی حیثیت سائیکل کے ایک پہیے کی سی تھی جس کی تاریں افغانستان کے گرد اگرد پھیلی سڑکیں ہیں ان تاروں کے درمیان چاروں طرف پھیلی ہوئی وادیاں۔

کابل کے شمال میں سالنگ ہائی وے کوہ ہندوکش کو کاٹتی ہوئی وادی پنج شیر کے پہلو سے نکلتی چلی جاتی۔ یہ سلسلہ دریائے آمو پر ختم ہوتا ہے۔

مشرق سے مرکزی سڑک دریائے کابل کے ساتھ ساتھ سفر کرتی جلال آباد سے درہ خیبر میں داخل ہوتی پشاور تک آتی ہے۔

جنوب مشرق کی طرف سے کئی ذیلی سڑکیں پہاڑوں میں واقع دروں سے گزر کر جزیرہ نما پاڑہ چنارہ سے گزرتی، گردیز اور خوست کے راستے میراں شاہ کے مقام پر پاکستان میں داخل ہوتی ہے۔

جنوب میں رنگ روڈ غزنی اور قندھار کے شہروں سے گزرتی کابل کے مغرب میں قریباً چھ سو کلومیٹر دور ہرات تک چلی جاتی ہے اور کابل شہر کے مغرب سے بھی کئی گزرگاہیں اور وادیاں بل کھاتی ہوئی ہزارہ جات کے پہاڑی سلسلوں میں گم جاتی ہیں۔

جنرل اختر نے روسی فوج کے Strong hold اعصابی مرکز "کابل" کو اپنا پہلا ہدف بنایا اور اس کے گردونواح میں سرگرم جہاد مجاہد کمانڈروں کو 107 ملی میٹر راکٹ لانچر چینی ساخت کے ملٹی 12 بیرل پہنچانے شروع کئے اس کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت زوروشور سے شروع کر دی۔

صورتحال کی تبدیلی کے ساتھ سنگل بیرل راکٹ تیار کروائے گئے تاکہ ان کا وزن کم ہو اور نقل وحمل میں آسانی میسر آئے۔

☆☆

مجاہد کمانڈروں کو متعینہ اہداف کے ساتھ منزل کی طرف روانہ کر دیا جاتا اور اس بات کا بطور خاص اہتمام کیا جاتا کہ ان کی سپلائی لائن نہ ٹوٹنے پائے۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن کی حکمت علمی نے روسیوں کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ کیونکہ اس کے تربیت یافتہ مجاہدین سالنگ ہائی وے پر مسلسل راکٹ برساتے روسیوں کی لائف لائن کاٹنے میں مصروف رہے۔

ان کامیابیوں کی خبریں سی آئی اے کے سٹیلائٹ جب "لینگلے" (سی آئی اے ہیڈ کوارٹر) اور پنٹا گان پہنچاتے تو امریکی حیرت زدہ رہ جاتے......

ولیم کیسی نے سی آئی اے کا چارج سنبھال لیا تھا وہ جنرل اختر کی حکمت عملی سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے ملنے کے لیے اسلام آباد پہنچ گیا۔

ڈائریکٹر آپریشن سی آئی اے میک میہان اس کے ساتھ تھا یہ دونوں قاہرہ اور سعودی عرب سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ جنگی سازو سامان افغانوں کو قاہرہ کے راستے پاکستان بھیجا جا رہا تھا جبکہ سعودی عرب امریکہ سے زیادہ بڑھ چڑھ کر افغانوں کے لیے فنڈز فراہم کر رہا تھا۔

سی آئی اے کی سربراہی اب ولیم کیسی کے پاس تھی جس پر صدر ریگن کو بے پناہ اعتماد تھا اور ولیم کیسی کو کانگریس میں چارلس ولسن کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

چارلس ولسن چند روز پہلے بھی پاکستان آیا اور افغانوں کے جنگی ٹھکانوں کا خفیہ دورہ کرنے کے بعد امریکہ پہنچا تھا۔ اپنے ساتھ وہ ایک چار سالہ افغان بچے کو بھی لے گیا جس کے منہ پر ایک 'TOY بم' پھٹنے کے نشانات موجود تھے۔

اس نے ڈرامائی انداز میں کانگریس کمیٹی کے سامنے بچے کو پیش کیا اور بتایا کہ روس وہاں کیا کیا گھناؤنے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔

اس نے افغانوں کو روسیوں پر اپنی آنکھوں سے جھپٹتے دیکھا تھا اور ان کی لپک جھپک کا زبردست قائل ہو چکا تھا۔ ولسن نے محسوس کیا تھا کہ روس کی ہوائی طاقت کے سامنے افغان بے بس ہیں خصوصاً روسی ہیلی کاپٹر انہیں زبردست نقصان پہنچا رہے ہیں۔

اس نے شدت سے افغانوں کی وکالت کرتے ہوئے انہیں "OERLIKON Gun" فراہم کرنے کے لیے کہا اور اپنی بات منوا کر اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس اور سینٹ مشترکہ کمیٹی نے اس ضمن میں سی آئی اے کے فنڈز ڈبل کر دیے......

ولیم کیسی اب خود کو بے حد مضبوط اور محفوظ خیال کر رہا تھا۔ بصورت دیگر اسے کانگریس اور سینٹ کی مختلف کمیٹیوں کو قائل کرنے میں خاصا وقت اور قوت صرف کرنی پڑتی تھی......

کانگریس کی ہاؤس انٹیلی جنس کمیٹی نے اسے فری ہینڈ دے دیا تھا اور اب وہ مکمل اعتماد کے ساتھ جنرل اختر عبدالرحمٰن سے ملاقات کے لیے آیا تھا......

اس مرحلے پر جنرل اختر نے اسے باور کروا دیا تھا کہ سی آئی اے پکے ہوئے کھانے پر ضیافت اڑانے آتی ہے۔ اس نے ولیم کیسی کو بتا دیا تھا کہ پنٹاگان اور سی آئی اے کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں انہوں نے پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی سے متعلق غلط اندازے لگائے تھے۔

کیسی کو اس کی بات کا قائل ہونا پڑا......

جنرل اختر عبدالرحمن نے سی آئی اے کی دیرینہ خواہش کہ وہ براہ راست مجاہدین سے "معاملات" کرے کبھی پوری نہ ہونے دی۔

وہ پاکستان کو ہمیشہ درمیانی واسطہ بنائے رکھتے تھے......

اور...... یہ بات سی آئی اے کو کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ نہ صرف سی آئی اے بلکہ امریکہ کے بیشتر نمک خوار اپنے آقاؤں کے ساتھ اس سلوک کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ سب یہ بات جانتے تھے کہ مجاہدین اور امریکہ کے درمیان اگر جنرل اختر کو الگ کر دیا گیا تو انہیں پھر صفر سے آغاز کرنا پڑے گا۔

☆☆

پولینڈ میں دوسرا محاذ روس کے خلاف کھولنے کے لیے امریکی صدر کو خود پوپ جان پال کے ہاں حاضری دینا پڑی تھی اور دونوں کے درمیان بڑے اہم مذاکرات ہو رہے تھے۔

اس روز ویٹی کن سٹی کے لائبریری ہال میں صدر رونالڈ ریگن اور پوپ جان پال کے درمیان جو مذاکرات ہوئے انہوں نے مشرقی یورپ میں روس کے خلاف نیا محاذ کھول دیا۔

لائبریری ہال کے دوسرے کمرے میں امریکی وزیر خارجہ الیگزنڈر ہیگ، آگسٹینو کارڈینل کسلولی اور پوپ کے نمائندے آرچ بشپ آچیل سلوسٹرینی کے ساتھ مذاکرات کر رہا تھا اس کی مدد کے لیے امریکی صدر کے قومی سلامتی امور کے مشیر ولیم کلارک موجود تھے......

الیگزینڈر ہیگ نے سی آئی اے اور پنٹاگان کی طرف سے تیار کردہ منصوبہ ان کے سامنے رکھا اور اپنی اس بات کا قائل کر لیا کہ افغانستان میں تین سالہ مزاحمتی تحریک کی کامیابی کے علی الرغم پولینڈ کو بھی روس سے نجات مل سکتی ہے۔

پوپ جان پال اور صدر رونالڈ ریگن نے سالیڈیریٹی تحریک کو ہر ممکن مدد بہم پہنچانے اور لخ ویلیسا کو بہر صورت مضبوط بنائے رکھنے کی حکمت عملی طے کر لی تھی......

کلیسا اس مرحلہ پر اپنا تاریخی رول ادا کرنے جا رہا تھا۔

سی آئی اے اور پنٹاگان کی مدد کے لیے ویٹی کن سٹی کی مدد سے ایک مضبوط نیٹ ورک قائم ہو گیا۔

عیسائی راہب اور راہباؤں کی مدد سے سالیڈیریٹی تحریک کے ساتھ روابط قائم ہونے لگے ان کے ہاتھ مضبوط کیے جانے لگے۔

ولیم کیسی نے پاکستان والا روس مخالف محاذ میک مہیان کو عملاً سونپ کر اپنی ساری توانائیاں اس طرف مبذول کر لی تھیں۔

اس نے پولینڈ کے کیتھولک عیسائیوں کو جمع کر کے حکومت کے خلاف زبردست تحریک چلانے کے منصوبے کا آغاز کر دیا تھا یہ ایک طرح

کی نیم مذہبی حکومت مخالف تحریک تھی جسے پوپ جان پال کی مقدس سربراہی بھی حاصل ہوگئی۔

اس کے پے در پے حملوں سے بوکھلا کر پولش حکومت نے مارشل لاء نافذ کردیا۔ سالیڈیرٹی کو خلاف قانون قرار دے کر اس پر پابندی عائد کردی گئی۔

اس مرحلے پر ویٹی کن کی بھرپور مدد نے سی آئی اے کا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ ولیم کیسی نے بیک وقت جنرل اختر عبدالرحمٰن اور پوپ جان پال سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ولیم کیسی باریک بینی سے سی آئی اے کے منصوبوں کا جائزہ لیتا اور جنرل اختر کے تجربات کی روشنی میں پولینڈ حکومت کے خلاف نئی منصوبہ بندیاں کرتا رہا۔

لخ ویلیسا اور سالیڈیرٹی کے دوسرے راہنماؤں کے ساتھ روابط کا ایک وسیع نیٹ ورک بنایا گیا۔ یہ رابطے چرچ کے راہبوں، سفارتکاروں کے بھیس میں موجود سی آئی اے کے ایجنٹوں اور بین الاقوامی مشنوں کے مختلف کارندوں کے ذریعے قائم کیے گئے۔ جس طرح جنرل اختر عبدالرحمٰن نے اسلام آباد سے سینکڑوں میل دور سرگرم عمل مجاہدین تک ایک سپلائی لائن قائم کردی تھی۔ بعینہ انہی خطوط پر کام کرتے ہوئے ولیم کیسی نے سینکڑوں ٹرانسمیٹر فیکس، پرنٹنگ مشینیں، کمپیوٹر، ٹائپ رائٹر وغیرہ سمگل کر کے سالیڈیرٹی کے زیر زمین کارکنوں تک پہنچائے جنہوں نے سی آئی اے کی مدد سے خفیہ پرنٹنگ پریس قائم کئے۔

اپنے اخبارات اور رسائل جاری کئے۔ دھڑا دھڑ حکومت مخالف لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لخ ویلیسا کے مردہ بت میں جان پیدا ہونا شروع ہوگئی۔

سی آئی اے کی کامیابیوں کا گراف بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے بیک وقت افغانستان اور مشرقی یورپ میں روس کو پھنسا لیا تھا...... اور امید پیدا ہونے لگی تھی کہ اب وہ روس کو اندر سے توڑ ڈالنے کا اپنا دیرینہ خواب حقیقت میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یاسمین

احمد ترسون کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے آرڈر سنائی کی میز پر پہنچ چکے تھے۔ اور وہ غصے سے کھولتا ہوا بڑبڑا رہا تھا:

''کمبخت یہاں بھی آن مرا۔''

اور عین اسی لمحے احمد بھی وہاں آ گیا جب سنائی نے اس کی فائل اپنے سامنے میز پر زور سے پٹخ دی تھی۔ احمد نے دروازے کے نزدیک رک کر اسے احترام دیا اور مؤدب ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا! سنائی نے بڑی غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''جب تمہارا واسطہ کبھی ان کاموں سے پڑا ہی نہیں تو یہاں آنے کیا کیا ضرورت تھی؟''

''جناب والا!'' احمد نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا: ''میں اپنی مرضی سے تو یہاں نہیں آیا۔''

''افوہ خدایا یہ شخص تو عذاب بنتا جا رہا ہے...... جانے کس منحوس گھڑی میں یہ کمبخت ہماری قسمت میں لکھا گیا تھا۔''

سنائی نے بڑے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جناب''...... احمد ترسون نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔

''بیٹھو تم دفتر میں، میں تمہارے فرائض کا تعین کرتا ہوں۔''

سنائی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اسے باہر جانے کو کہا۔

سنائی جل بھن کر ہی تو رہ گیا۔ اس کی احمد ترسون سے کبھی نہ بن سکی تھی۔ سنائی چونکہ ''خاذ'' کے ڈائریکٹر اسفندیار کا رشتہ دار تھا۔ اس لیے وہ اپنے ماتحتوں سے توقع سے زیادہ تابعداری کی امید کیا کرتا تھا۔ جب کہ احمد ترسون نے کبھی سنجیدگی سے اس کی کسی بات کو نوٹس ہی نہ لیا تھا! وہ احمد ترسون کا اور تو کچھ نہ بگاڑ سکا۔ البتہ اس کی فائل اس نے اتنی بگاڑ دی کہ اگلے دو تین سال تک اس کے ''سینئر ضابطہ'' بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

احمد ترسون کے فرائض کی نوعیت کبھی ایسی نہیں رہی تھی کہ اسے اتنی ''حساس ڈیوٹی'' سونپی جاتی۔ سنائی نے سوچا ضرور وہ اسے تنگ کرنے کے لیے شرارتاً یہاں چلا آیا ہے۔ اب وہ احمد ترسون کو اس شرارت کو سزا دینے کے چکر میں تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اسے زک پہنچائے۔ بالآخر ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی اور وہ دل ہی دل میں جھوم اٹھا:

''اب دیکھوں گا برخوردار۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد احمد ترسون تک نئے فرائض کا حکم نامہ پہنچا تو زیرِ لب مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

سنائی نے تو انتقاماً اس کو اتنی گھٹیا ڈیوٹی سونپی تھی جب کہ وہ تیز رفتاری سے اس طرح فیضان کے نزدیک ہونے عطیہ خداوندی جان رہا تھا: احمد ترسون کو زیر تفتیش ملزموں کے باورچی خانے کا انچارج بنا دیا گیا تھا! ایک لحاظ سے یہ بڑی اہم ذمہ داری بھی تھی اور سنائی اس کی وضاحت بھی افسران اعلیٰ کے سامنے کر کے بآسانی کسی الزام سے بری الذمہ ہو سکتا تھا۔

اس سے پہلے یہاں دو تین ایسے واقعات دیکھنے کو ملے تھے کہ کسی باورچی نے میس انچارج کی نظر بچا کر کسی ملزم کے کھانے میں نشہ آور شے ملا کر کھانا اس تک پہنچا دیا۔ اس طرح زیر تفتیش ملزم بآسانی ''وقتی مار پیٹ'' کے اثر سے محفوظ ہو جاتا تھا...... اور ایک مرتبہ اگر خاصے تشدد کے بعد بھی کوئی ملزم جرم کا اقرار نہ کرتا تو اس پر بے گناہ ہونے کا ''شک'' کیا جا سکتا تھا۔

اس کے بعد سے میس انچارج کی ڈیوٹی خاصی سخت قسم کی ہو گئی تھی۔ وہ عموماً کھانا پکنے کے بعد اسے ڈاکٹر سے ٹیسٹ کرواتا اور پھر اپنی نگرانی میں تقسیم کرواتا تھا۔

☆☆

احمد ترسون نے بڑی فراخدلی سے اپنی نئی ذمے داریوں کے پروانے پر دستخط کئے اور باورچی خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں تھوڑی دیر بعد ملزموں کے لیے رات کا کھانا پکنے والا تھا۔ زیر تفتیش ملزموں کی کوٹھڑیاں جہاں وہ بند کئے جاتے تھے، دو قطاروں کی صورت میں زیر زمین بنائی گئی تھیں۔

دونوں قطاروں کے دروازے بھی ایک دوسرے کے سامنے نہیں کھلتے تھے بلکہ ان کی پشت آپس میں ملی ہوئی تھی۔ اس طرح یہاں بند لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ذہنی اذیت پہنچانے کا سامان کیا گیا تھا، تاکہ انہیں ایک دوسرے کی شکل بھی نظر نہ آ سکے۔

ان کوٹھڑیوں سے جب کسی ملزم کو تفتیش کے لیے لے جایا جاتا تو اس کے منہ پر کمبل ڈال دیا جاتا تاکہ وہ دوسروں کو اور دوسرے اسے نہ پہچان سکیں۔ اسی حالت میں بعد از تفتیش انہیں یہاں لا کر بند کر دیا جاتا تھا اور مہینوں ایک دوسرے کے نزدیک رہنے کے باوجود بھی یہاں گرفتار لوگ ایک دوسرے کی شخصیت سے بے خبر رہتے تھے۔

اس خطرے کے پیش نظر کہ کوئی ملزم اونچی آواز سے ساتھ والوں کو اپنی شناخت نہ کروا دے، انہیں آپس میں گفتگو کرنے یا اونچی آواز میں بولنے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی۔ عموماً اس جرم کے مرتکب ملزموں کو بڑی ظالمانہ سزا دی جاتی تھی، تاکہ دوسروں کو نصیحت ہو۔ انہیں اچھی طرح مارنے پیٹنے کے بعد ان کا منہ کالا کر کے ان کوٹھڑیوں کے آگے گھمایا جاتا اور ان کو مجبور کیا جاتا کہ اپنے بارے انتہائی بے ہودہ الفاظ کی تکرار کریں۔

ان تمام اقدامات کے باوجود آئے دن کوئی نہ کوئی ملزم ضرور اس ''گناہ'' کو مرتکب ہو جاتا۔ اس سلسلے میں انہیں پہریداروں کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں۔

یہاں مختلف گروپوں سے تعلق رکھنے والے مجاہدین نظر بند تھے، لیکن وہ سب ہی فیضان اوغلو سے غائبانہ تعارف رکھتے تھے۔ فیضان اوغلو زیر زمین دنیا کے لوگوں میں پراسرار اور جری مجاہد کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اس نے قلیل عرصے ہی میں اتنے زیادہ کارنامے انجام دے لئے

تھے کہ اب وہ ان مجاہدین کے نزدیک ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

اس کی آمد کے ساتھ ہی اس کا ذکر بھی اس ٹارچر سیل میں پہنچ گیا۔ جہاں مجاہدین میں پریشانی کی لہر دوڑی تھی وہاں اس کی آمد سے ان کا اعتماد بھی بڑھنے لگا تھا فیضان کو جب پہلی مرتبہ بے ہوشی کے عالم میں یہاں لایا گیا تو ''نعرہ تکبیر'' ''اللہ اکبر'' کے فلک شگاف نعروں سے اس کے جانباز ساتھیوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔

مسلسل مار پیٹ نے گو کہ جسمانی طور پر اسے نڈھال کر دیا تھا۔ لیکن اس کے عزائم کو توڑنے والا کوئی ایٹمی یا کیمیاوی ہتھیار ابھی تک افغانی یا روسی افواج کے ہاتھ نہ لگا تھا۔ ہر دفعہ جب وہ تشدد کا سامنا کرتے بے ہوش ہونے کے بعد ہوش میں آتا تو ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش اپنے اندر موجود پاتا۔

 ☆☆

امیر داد خان کو چند مہینوں کی صحبت نے اسے گوشت پوشت کے معمولی سے انسان سے مرد آہن بنا کر رکھ دیا تھا۔ اگر اس کے جسم کی بوٹی بوٹی بھی افغانستان کی آزادی کے نام پر نوچ لی جاتی تو بھی خود کو خوش قسمت گردانتا اور بخوشی جان سے گزر جاتا۔ یہاں موجود پہریدار اس کے عزم و استقلال پر انگشت بدنداں تھے کہ آج تک اس نے ہوش میں آنے کے بعد کبھی پانی بھی طلب نہ کیا تھا۔ وہ خود ہی افسران سے چوری چھپے اسے پانی کے دو گھونٹ پلا دیتے تھے۔

آج پہلی مرتبہ فیضان کے لئے ملزموں کے مطبخ سے کھانا آ رہا تھا۔ اس نے اس ''نوازش'' کو بھی دشمن کی چال ہی گردانا اور دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ ''مطبخ'' کا نیا انچارج احمد ترسون اپنی زیر نگرانی ملزموں میں کھانا تقسیم کروا رہا تھا۔ وہ ایک ایک قیدی کو بڑے سخت گیر لہجے میں مخاطب کرتا اور ساتھ ہی دو چار جھڑکیاں بھی پلا دیتا۔

فیضان اوغلو کو حفاظتی اقدامات کے تحت بالکل آخری سرے والی کوٹھڑی میں بند رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد دو تین کوٹھڑیاں بطور احتیاط خالی رکھی گئی تھیں تا کہ وہ چیخ کر بھی کسی کو مخاطب کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ احمد ترسون ٹہلتا ہوا اب اسی کوٹھڑی کی طرف جا رہا تھا۔

کوٹھڑیوں کا پہرے دار دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ماحول سے بے نیاز اس راشن پر نظر رکھے ہوئے تھا جو قیدیوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ احمد ترسون کسی طرح وہاں سے ہٹے تو راشن تقسیم کرنے والے عسا کر اسے بھی چوری چھپے ملزموں کے کھانے میں سے کسی قدر حصہ دے دیں۔ جب احمد ترسون ٹہلتا ہوا آخری کوٹھڑی تک پہنچ گیا تو اس نے بھی اپنی تھالی نکال کر چپکے سے راشن تقسیم کرنے والے کی طرف بڑھا دی۔

''عقاب کو سلام پہنچے'' ......

احمد ترسون نے اس کوٹھڑی کے نزدیک پہنچ کر فیضان اوغلو کو مخاطب کیا۔

''عقاب'' کے لفظ پر فیضان چونکا ...... کہیں دھوکا تو نہیں ہو رہا۔

''سیاہ عقاب کی طرف سے سلامتی کی دعا پہنچے۔''

احمد ترسون کے اگلے فقرے نے اس کا خیال فوراً بدل دیا۔

''کوہسار باقی......افغان باقی......'' فیضان اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بولا۔

یہ ایک طرح کا سوال تھا جس کا مطلب دوسرے سے شناخت طلب کرنا تھا۔ احمد ترسون کے اگلے دو تین فقروں کی ادائیگی نے فیضان اوغلو کے تمام وسوسے ختم کر دیئے۔ وہ بے اختیار آگے کی طرف جھک گیا۔

''سیاہ عقاب کا پیغام ہے......''

احمد ترسون اس طرف آتے باورچیوں کو دیکھ کر فوراً ایک قدم پیچھے ہٹا اور خوامخواہ فیضان کو ڈانٹنے لگا۔

''تم لوگ اس قابل ہرگز نہیں کہ تمہیں کھانے پینے کو ملے۔ تمہیں تو سسکا سسکا کر مارنا چاہیے۔ ملاؤں نے تو تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے''......

اس نے فیضان کے سامنے اچھا خاصا لیکچر جھاڑ دیا۔

وہ سر جھکائے احمد ترسون کی باتیں سنتا رہا......!

باورچی ایک پلاسٹک کی پلیٹ میں اس کے سامنے ترکاری اور روٹیاں پھینک کر چلے گئے۔ احمد ترسون وہیں کھڑا رہا۔

یہ بات اس کے فرائض میں شامل تھی کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے ملزموں پر آخری وقت تک نظر رکھے تاکہ کسی شک کی صورت میں فوراً کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔

وہیں کھڑے کھڑے احمد ترسون نے اس کاغذ پر لکھا ہوا سارا پیغام جو اس نے پڑھ کر جلا دیا تھا فیضان اوغلو تک پہنچا دیا اور خود اس کے سامنے سے ہٹ کر باری باری باقی گرفتاروں کا جائزہ لینے لگا..........!!

☆☆

رات کے قریباً 10 بجے کا عمل تھا۔ فیضان اوغلو اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں نماز سے فراغت کے بعد اپنی جسمانی تکالیف سے نجات پانے کے لیے اپنا ذہن اگلے لائحہ عمل کی تیاری میں مصروف کیے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جب بوناکوف کی طرف سے اس کے فرستادہ درندے اسے لینے آ گئے۔

اس مرتبہ خاصے شریفانہ انداز میں لے جایا جا رہا تھا۔ صرف معمول کی کارروائی کے مطابق اس کے منہ پر کمبل ڈالا گیا تھا۔ پہلے کی طرح اس کی کھینچا تانی نہیں کی جا رہی تھی۔ اسی ہال کے کمرے کے اندر پہنچ کر اس کے چہرے سے کمبل الگ کر کے اسے اندر دھکیل دیا گیا۔

ہال کے کمرے کے ایک کونے میں چھت کے ایک کنڈے سے ایک رسہ لٹک رہا تھا۔ میجر بوناکوف نے اس سمت میں اپنی چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں الٹا لٹکا کے پہلے مرچوں کی دھونی دی جائے گی، اس کے بعد جسم کا بند بند کاٹ کر الگ کر دیا جائے گا...... یہ عمل اس وقت تک

جاری رکھا جائے گا جب تک تم سچ نہ بک دو۔"

"میجر!" فیضان اوغلو نے پہلی مرتبہ اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔"اس سزا سے میں ڈرنے والا نہیں۔ نہ میں تمہارے ڈرانے دھمکانے سے کوئی بات کہنے والا ہوں میرا خیال ہے کہ اس کھیل کو ختم کر کے ہم دوسرے ماحول میں کوئی بات کریں......لیکن تمہارے ساتھ نہیں......اس لیے کہ مجھے بہر حال کچھ ضمانت درکار ہوگی۔ اور وہ تم نہیں دے سکتے......"

میجر بوناکوف کی مکارانہ اور گہری نظریں فیضان پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ شاید جھوٹ یا چالاکی کے تاثرات......لیکن فیضان اوغلو جیسے ملزم سے اس کا سامنا شاید اس سے پہلے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

ایک ڈیڑھ منٹ تک اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر گھورنے کے بعد جب اسے وہاں چالاکی ہوشیاری دور دور تک نظر نہ آئی تو اسے فیضان کی پیش کش کے متعلق کچھ سوچنا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

"اس بات کی ضمانت کیا ہوگی کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہو؟"......

اس نے فیضان اوغلو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ دوطرفہ معاہدہ ہے میجر......"

فیضان نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میرا خیال ہے اس سلسلے میں تم میری کوئی مدد نہیں کر سکو گے۔" اس کے لہجے کا سکون برقرار تھا۔ وہ اپنے کسی بھی غیر معمولی عمل سے کے جی بی کے تربیت یافتہ اس میجر کو شک میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کی کامیابی کا راز اس کی شاندار ایکٹنگ ہی کے مرہون منت تھا۔ کیونکہ وہ کے جی بی کو دوسری مرتبہ دھوکا دینے جا رہا تھا۔

"کچھ بولو گے بھی......"

بوناکوف نے بڑی جدوجہد سے اپنے لہجے کو نارمل بنائے رکھا۔

"میں سوائے کرنل شولوخوف کے اور کسی سے اس مسئلے پر بات نہیں کروں گا۔" فیضان نے حتمی اور دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

میجر بوناکوف پریشان ہو کر رہ گیا۔ اس سے تو وہ صورت حال زیادہ بہتر تھی جب وہ اپنے جرم کا اقرار نہیں کر رہا تھا۔

اس نے اچانک ہی گیند میجر بوناکوف کے کورٹ میں پھینک کر اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ اگر وہ خود اس معاملے کو زبردستی ہینڈل کرنے کی کوشش کرتا تو ممکن تھا کہ فیضان اوغلو دوبارہ بتھے سے اکھڑ جاتا۔ اگر کرنل شولوخوف تک معاملہ پہنچا تو اس کی ناراضی کا خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔

تیسرا خیال سب سے زیادہ پریشان کن تھا: کہ کہیں فیضان اوغلو اسے ڈاج تو نہیں کر رہا......اس نے ماضی میں یہی کچھ تو کیا تھا۔

میجر بوناکوف کو ان تمام اذیت ناک سوچوں سے فرار کا صرف ایک ہی راستہ نظر آیا کہ وہ سارا معاملہ کرنل شولوخوف تک پہنچا کر خود اس سے الگ ہو رہے۔ اس طرح کم از کم آئندہ پیش آنے والے منفی حالات سے تو وہ خود کو بری الذمہ ثابت کر سکتا تھا۔ بات اس تک محدود ہی نہیں رہ

سکتی تھی۔

فیضان اوغلو کی پیش کش کو یہاں موجود تمام عساکر نے سن لیا تھا اور ان میں سے کوئی بھی کرنل شولوخوف تک یہ بات پہنچا سکتا تھا۔ وہ خود کے۔ جی۔ بی کا میجر تھا اور جانتا تھا کہ ہر بڑا افسر ہر چھوٹے افسر پر آنکھ رکھنے کے لیے اس کے پیچھے اس سے چھوٹے افسر کو لگا دیتا ہے۔

"ٹھیک ہے.........اسے واپس لے جاؤ"

اس نے انہی عساکر کو حکم دیا۔ جو اسے یہاں تک لائے تھے۔

جب فیضان اوغلو اپنی کوٹھڑی کی طرف واپس جا رہا تھا تو اسے اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ اس نے کم از کم کچھ عرصے ہی کے لیے سہی میجر بوناکوف کو ذہنی اذیت میں مبتلا تو کر دیا ہے۔

دوسری طرف فیضان کے رخصت ہوتے ہی میجر بوناکوف نے اپنے سامنے رکھے انٹر کام پر کرنل شولوخوف کو مخاطب کر کے اس تک یہ سارا معاملہ پہنچا کر گویا اپنے سر سے بوجھ اتار دیا۔

کرنل کی طرف سے ہدایات وصول ہونے پر اس نے مطبخ کے انچارج سے رابطہ قائم کیا اور اپنا سر کرسی کی پشت سے سہلاتے ہوئے اسے فیضان اوغلو کے لیے نئی ہدایات دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆

تھوڑی دیر بعد احمد ترسون میجر بوناکوف کے خصوصی حکم پر اس کے لیے کافی تیار کر کے لے جا رہا تھا۔ جب وہ فیضان اوغلو کے سامنے پہنچا تو دونوں ہی زیر لب مسکرا دیئے۔

صبح تک فیضان نے کسی سے رابطہ قائم نہ کیا۔ کافی کا مگ ختم ہونے تک کوٹھڑیوں کا منتظم اس کے لیے دو فالتو کمبل بھی لے آیا تھا۔ احمد ترسون نے چوری چھپے اس تک درد سے نجات کی دو گولیاں بھی پہنچا دی تھیں۔

صبح اس کی آنکھ قریبی کوٹھڑی سے بلند ہوتی اذان کی آواز کے ساتھ کھلی۔ ایک "ضابط" کو آواز دے کر اس نے اپنے وضو کرنے کے لیے پانی طلب کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے منصوبے کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

نماز کی ادائیگی کے بعد گرفتار شدگان کو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے ایک ایک کر کے لے جایا جاتا تھا۔ آج فیضان اوغلو کو نہ صرف خصوصی طور پر غسل کرنے کی اجازت تھی بلکہ اس کے لیے ایک پرائیویٹ کپڑوں کا جوڑا بھی موجود تھا اور اس کے ضبط شدہ اونی کپڑے بھی لوٹا دیئے گئے تھے وہیں سے عساکر اسے کرنل شولوخوف کے کمرے کی طرف لے گئے۔ وہ اس حالت میں اسے دوبارہ کوٹھڑیوں میں لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

کرنل شولوخوف ایک میز پر ناشتہ سجائے اس کا منتظر تھا۔

"خوش آمدید......" اس نے فیضان کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کمرے کے ایک کونے میں صرف ایک مسلح پہرے دار موجود تھا۔ باقی محافظ بھی کرنل کے اشارے پر باہر چلے گئے تھے۔

''اپنے دوستوں کے لیے ہمارے پاس بے شمار محبت ہے مسٹر اوغلو......!''

اس نے کافی کا مگ خود بنا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''شکریہ جناب۔'' فیضان اوغلو نے نہایت عاجزی کا مظاہرہ کیا۔

''ان ملاؤں کے ورغلانے میں کوئی کب تک آ سکتا ہے۔ مسٹر اوغلو! ہم تمہارے دشمن نہیں۔ ہم غیور افغانوں کے دوست ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ہمارے دوست ترقی کریں۔ اس بورژوائی نظام سے نجات حاصل کریں جو ملاؤں اور سرداروں نے ان پر صدیوں سے مسلط کر رکھا ہے۔ ہم شخصی آزادی کے تقدس کی بحالی کا عزم لے کر آئے ہیں۔ ہم ان پہاڑوں سے دودھ کی نہریں نکال دیں گے تاکہ ہمارے عظیم دوست دنیا کی ہر نعمت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے عوض ہم صرف دوستی چاہتے ہیں صرف دوستی......!'' جانے وہ اور کیا کیا کہتا کہ اوغلو نے اسے روک دیا۔

''کرنل مجھے تمہاری باتوں پر پورا یقین ہے۔ افسوس میں ان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا۔'' پھر اس نے اچانک بڑی پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا!'' کرنل مجھے کیا دوبارہ ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا۔''

''اوہ! کیوں نہیں! کیوں نہیں...... ہمارے دروازے واپس آنے والوں کے لیے ہمیشہ سے کھلے ہیں''......!

''آپ واقعی ہمارے عظیم دوست ہیں کرنل......''

ماسکو یونیورسٹی میں حاصل کی گئی سٹیج ڈرامے کی ایکٹنگ اس کے صحیح معنوں میں آج کام آ رہی تھی۔

''اپنی پچھلی زندگی کو بھلا دو۔'' کرنل نے اسے بظاہر بڑی شفقت سے کہا۔

''شکریہ جناب والا! بہت شکریہ...... میں اپنی وفاداری کا ثبوت آپ کی توقعات سے بڑھ کر دوں گا۔'' اس نے خاصے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔

کرنل شولوخوف نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے صرف نظریں اٹھا کر استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا:

''میں امیر داد خان اور اس کے گروہ کو گرفتار کروا دوں گا کرنل......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا سا سسپنس پیدا کیا۔

کرنل شولوخوف نے بے یقینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

''آج ہی کرنل...... آج رات ہی...... میں نے کہا تھا کہ آپ کو یقین نہیں آئیگا۔''

''اور اگلے ہفتے آج ہی کے دن تم ماسکو میں زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہو گے۔''

کرنل نے بڑے وثوق سے اسے یقین دلایا۔

''مجھے صرف آپ کی زبان پر یقین ہے کرنل...... صرف آپ کی زبان پر...... میں افغان انتظامیہ سے بات بھی نہیں کروں گا''......

فیضان کا لہجہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

''تم مطمئن رہو کامریڈ......''

کرنل شولوخوف نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

فیضان اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مصافحہ کرنے میں کچھ زیادہ ہی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

کرنل شولوخوف کے چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ فیضان اوغلو کی بات سے خاصا متاثر نظر آ رہا ہے۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے وہاں موجود واحد پہرے دار کو بھی باہر جانے کا حکم دے دیا۔ یہ واحد پہریدار جو ابھی تک یہاں موجود تھا۔ روسی فوج کا سپاہی تھا اسے پشتو زبان آتی ہی نہیں تھی جس میں کرنل شولوخوف اور فیضان اوغلو اب تک باتیں کر رہے تھے۔ پھر بھی کرنل شولوخوف کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ فیضان اوغلو کو بھی اس کی یہاں موجودگی کھٹک رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد فیضان اوغلو ایک کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر شولوخوف کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ دونوں قریباً دو گھنٹے تک اسی نقشے پر بحث کرتے رہے جو فیضان کی انہی الٹی سیدھی لکیروں سے وجود میں آیا تھا۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔

''کرنل''...... نتیجے پر پہنچنے کے بعد فیضان اوغلو نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں آپ کو کوئی مشورہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ نہ ہی ظاہر ہے آپ میرے مشورے پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ میں آپ کی حکمت عملی بھی دریافت کرنا نہیں چاہتا۔ صرف ایک احتیاط کی طرف توجہ دلاؤں گا......''

''کیا؟'' کرنل نے بے صبری سے پوچھا۔

''اگر آپ نے حملہ کرنے سے پہلے وہاں کمانڈوز چھپانے کی کوشش کی تو ہماری ذرا سی بے احتیاطی سے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ لوگ کتنے محتاط اور خبردار ہیں۔ اس علاقے کے چپے چپے پر ان کی نظر ہے اور ایک مرتبہ اگر امیر داد خان ہاتھ سے نکل گیا تو سارے کابل کی فوج مل کر بھی اس کی گرد کو نہ پا سکے گی۔''

اس نے اپنا آخری نفسیاتی حربہ بھی آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور تیر نشانے پر لگا۔

کرنل نے گہری نظروں سے اس کے چہرے کو ٹٹولا جہاں سنجیدگی کے سوا اور کچھ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تم بے فکر ہو جاؤ مسٹر اوغلو......''

''میرے خیال سے آپریشن بھی رات ہی کے وقت ترتیب دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' اوغلو نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے...... فی الوقت تم وہیں رہو گے جہاں میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔ تم سے کوئی کچھ دریافت نہیں کرے گا۔ اگر کوئی سوال بھی کرے تو اسے ڈانٹ دینا۔ تم سوائے میرے اور کسی کی بات کا جواب دینے کے پابند نہیں......''

کرنل شولوخوف خود اسے اس آرام دہ کمرے تک چھوڑنے آیا تھا۔ جہاں اسے رات دس بجے تک کا وقت گزارنا تھا۔

☆☆

آپریشن روم میں اسفندیار کرنل شولوخوف اور تین دوسرے اعلیٰ افغان افسران موجود تھے۔ سامنے دیوار پر وہ نقشہ ٹنگا ہوا تھا۔ جس میں فیضان اوغلو کو نشان زدہ جگہ اور اس تک پہنچنے والے ممکنہ راستوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان لوگوں نے چھاپہ مارنے کے لیے رات کا وقت منتخب کیا تھا کیونکہ فیضان اوغلو کی اطلاع کے مطابق دن کے اوقات میں وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ تخریب کار صرف اسے دیکھ کر سامنے آئیں گے۔ اگر فوراً حملہ آوروں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تو بازی الٹ کر رہ جائے گی۔

''ایک بات ذہن میں آئی ہے فیضان ہمیں جس راستے سے لے جا رہا ہے۔ وہاں اچھی خاصی جمعیت چھپ سکتی ہے اور اس علاقے کی پوزیشن ایسی نہیں کہ ہم ان لوگوں کو گھیرے میں لے لیں پھر کسی ممکنہ مدافعت پر ان کے گرد گھیرا تنگ کرتے چلے جائیں اگر کھل کر کارروائی کی گئی تو شہری آبادی زد میں آجائے گی...... ہوائی حملے کے امکانات ہی نہیں............''

ایک اعلیٰ افسر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' شولوخوف نے چونکتے ہوئے کہا۔

سر! میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی دھوکہ ہی نہ ہو...... اس جگہ گھیرے میں آنے کے بعد کسی بھی فوج کے بچ نکلنے کے مواقع کم رہ جاتے ہیں۔''

اسی افسر اعلیٰ نے اپنے خدشہ ظاہر کیا۔

اس کی بات پر شولوخوف تو الجھ گیا تھا لیکن اسفندیار نے زوردار قہقہہ لگایا...... ''بیوقوف!''...... اس نے اس افسر کو مخاطب کیا...... ''تخریب کار کیا کھلی سڑکوں پر کندھوں پر رائفلیں سجائے گھوما کرتے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ ایسی ہی کسی پناہ گاہ میں ہوگا۔'' افسر کسمسا کر رہ گیا۔

''کوئی رپورٹ آئی ہے ان لوگوں کی طرف سے......'' کرنل شولوخوف نے اس گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑنا چاہا۔ وہ منفی نتائج کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ابھی تک تو نہیں...... ہمارے آدمی وہاں پھیل رہے ہیں۔'' اسفندیار نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ اگلی کوئی بات ہو آپریشن روم کا ہنگامی ریسیور چلانے لگا۔ ''ضروری پیغام''...... اسفندیار نے آگے بڑھ کر ایک ریڈیو سیٹ کے قریب رکھا چونگا منہ سے لگالیا۔

''ڈائریکٹر آن دی لائن۔'' اس نے کسی کو مخاطب کیا۔

''جناب والا کنٹرول روم سے بات کیجئے''...... دوسری طرف سے کہا گیا۔

کلک کی آواز کے ساتھ کنٹرول روم سے رابطہ مل گیا۔ اس مرتبہ آواز ہنگامی ریسیور سے بلند ہو رہی تھی۔

''ایڈوانس پارٹی کی رپورٹ ہے جناب کہ مشتبہ نقل و حرکت نوٹ کی گئی ہے۔

حالات پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔''

کنٹرول روم سے پیغام آ رہا تھا۔

''آؤٹ''...... کہہ کر ڈائریکٹر اسفندیار نے سوئچ آف کیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کا قہقہہ گونجا۔ کرنل شولوخوف کے کھچے ہوئے اعصاب بھی نرم پڑنے لگے۔ اسفندیار نے اسی افسر اعلیٰ کی طرف رخ کیا۔ جس نے اس سے پہلے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

''اب کیا خیال ہے!''

وہ بے چارہ شرمندہ سا نظر آ رہا تھا۔

اس اطلاع کا مطلب یہ تھا کہ فیضان اوغلو اسے دھوکہ نہیں دے رہا تھا۔ بات واقع کچھ ضرور تھی۔ ڈائریکٹر اسفندیار نے اس طرح کرنل شولوخوف کی طرف دیکھا جیسے یہ کارنامہ بھی اسی نے انجام دیا ہو۔ اس نے دوبارہ ریڈیو سیٹ کے نزدیک پہنچ کر اس ''ایڈوانس پارٹی'' سے رابطہ قائم کیا۔ جنھیں پہلے اس علاقے میں ''لانچ'' کیا گیا تھا تاکہ وہ لوگ یہاں ''ریکی'' کر کے تازہ ترین صورت حال کی اطلاع ان لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔

☆☆

ڈائریکٹر ''خاد'' اسفندیار نے ایڈوانس پارٹی کو حکم دیا کہ وہ صورت حال پر کڑی نظر رکھیں اور بجائے کنٹرول روم کے براہ راست اسے رپورٹ کریں۔ ان لوگوں نے اس آپریشن روم کو آپریشن کے لیے ہنگامی ہیڈ کوارٹر کی شکل دے لی تھی کیونکہ یہاں سے وہ ہر جگہ رابطہ قائم کر سکتے تھے۔

یہ آپریشن روم ''قوائے دوست'' کی آمد کے بعد سے کے۔ جی۔ بی کی زیر نگرانی جدید ترین خطوط پر استوار کر دیا گیا تھا۔ اب یہاں سے کوئی بھی ''حکم'' جاری ہونے کے محض چند منٹ بعد متعلقہ محکمے کے لوگ حرکت میں آ سکتے تھے اور اسی آپریشن روم کے کسی بھی ہنگامی حکم پر عمل پیرا ہونے کے لیے مختلف مقامات پر ''تیار بر تیار'' (Stand to) دستے موجود تھے جو صرف ''خاد'' کی کارروائیوں کے لیے مختص کیے گئے تھے۔

فیضان اوغلو کی کہی گئی بات کے حق میں ایک دلیل بھی کرنل شولوخوف کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی کیونکہ وہ خوف کو خاصا پرسکون محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس افسر اعلیٰ کی طرف سے اٹھائے گئے پراز خدشات نکات پر وہ بھی پچھلے ایک گھنٹے سے مغز ماری کر رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے خدشات کا اظہار ان لوگوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''خدمت اطلاعات دولتی'' کے ہیڈ کوارٹر میں فوراً افغانی کمانڈوز کا ایک دستہ تربیت پا گیا۔ جس کی کمان ایک روسی میجر کو سونپی گئی۔

''تمھیں صرف فیضان پر نظر رکھنی ہے۔ اگر وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دو''...... کمانڈوز میں سے ایک حوالدار کو جس کے سچے نشانے کا مظاہرہ اس سے پہلے بھی کرنل شولوخوف کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ الگ کر کے اس نے ہدایات دیں۔

سورج غروب ہونے کے بمشکل پندرہ منٹ بعد ہی آپریشن شروع ہو گیا۔ صبح ہی سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سردی کی شدت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ انھیں یہی امید تھی کہ تخریب کار سردی سے بچنے کے لیے اپنی پناہ گاہوں میں بیٹھے ہوں گے۔

پہلے حملہ رات کو دیر گئے کرنے کا منصوبہ زیر غور آیا تھا لیکن کرنل شولوخوف کے جی۔ بی کا کرنل تھا۔ وہ واقعے کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے تمام احتیاطیں بروئے کار لایا تھا۔ اس نے اتنا شاندار اور بھرپور منصوبہ ترتیب دیا تھا کہ اس پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے علم تھا کہ کرفیو کے اوقات میں اس طرف کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری وہیکلز کی "خصوصی آمد" تخریب کاروں کو شک میں مبتلا کر دے گی۔ اس نے سوائے "ایڈوانس پارٹی" کے چار جوانوں کے اور کسی کو اس طرف پھٹکنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ کرنل شولوخوف نے اس پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کی ایک بس حاصل کی تھی جو اس طرف جایا کرتی تھی۔ اس بس میں اس نے کمانڈوز کو سویلین لباس میں چھپا کر اس طرف روانہ کیا تھا۔

بس کی روانگی کے لیے وہی وقت منتخب ہوا تھا۔ جس وقت پر اس کمپنی کی ایک بس واقعی وہاں سے گزر کر جلال آباد جایا کرتی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس بس کو چھپانے کے لئے اور کمانڈوز کے چھپ کر اور وہاں موجود تخریب کاروں کی نظروں سے بچ کر چلنے کے لیے جگہ اور راستے ایڈوانس پارٹی نے تلاش کر لیے تھے۔ انہوں نے اس علاقے میں مقامی دیہاتیوں کے روپ میں ریکی کرنے کے بعد تمام حالات کا جائزہ لے کر جو رپورٹ ترتیب دی تھی اس پر بحث کرنے کے بعد ہی ان لوگوں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا تھا۔

بس "خاذ" کے قلعہ نما دفتر کے صحن میں کھڑی تھی اور اس کی چھت پر بھاری مشین گنیں دونوں اطراف نصب کرنے کے بعد اس طرح کیموفلاج کر دی گئی تھی کہ ان کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ چند سیکنڈ کے نوٹس پر حرکت میں آ سکتی تھیں۔

ان مشین گنوں کے ساتھ کمانڈوز کو لٹا کر ان پر ترپال ڈال دی گئی تھی اور بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ بس کے اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کا سامان اوپر چھت پر رکھا ہوا ہے۔ کابل سے جلال آباد کی طرف جانے والی بسوں پر رکھے سامان پر اس طرح ترپال ڈال کر باندھ دیا جاتا تھا خصوصاً بوندا باندی کے ایسے موسم میں جس میں یہ لوگ سفر کر رہے تھے۔

بس کے اندر موجود کمانڈوز نے اپنا اسلحہ سیٹوں کے درمیان رکھا ہوا تھا اور انہوں نے چادریں اوڑھی ہوئی تھیں۔ اگر کوئی کھڑکیوں میں لگے بڑے بڑے شیشوں سے بھی اندر جھانک کر دیکھتا تو اسے اندر کچھ نظر نہ آتا۔

تخریب کاروں پر حملہ کرنے کی ریہرسل وہ لوگ دو تین گھنٹوں سے کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے کرنل شولوخوف کے سامنے اس ریہرسل کا شاندار مظاہرہ کیا۔ کرنل نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور میجر شکن کو بلا کر کچھ خصوصی ہدایات دیں۔ اس کے بعد اس نے فیضان کو کچھ سمجھایا۔

اس کے سنہرے مستقبل کے سپنے کی شاندار جھلک اسے دوبارہ دکھائی اور اس تسلی کے ساتھ کہ اس کی جان ہر طرح محفوظ رہے گی۔ اسے کمانڈوز کے ساتھ بس میں سوار کر دیا۔

وہ حوالدار جس نے فیضان اوغلو پر نظر رکھنی تھی۔ وہیں سے اس کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے جان بوجھ کر فیضان اوغلو کے ساتھ والی

سیٹ پر بیٹھایا گیا تھا۔

☆☆

احمد ترسون نے بس کی روانگی کا نظارہ اپنے بلاک کی بالکونی سے کیا تھا بس روانہ ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ بالکونی سے نیچے اتر آیا۔اس نے آخری تیاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھیں۔اس کا رخ سنائی کے کمرے کی طرف تھا:

''جناب والا آج مجھے چھٹی مل جائے گی تھوڑی دیر کے لیے؟''......

اس نے بڑی ملتجی نگاہوں سے درخواست کی۔

''نہیں''......سنائی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

احمد ترسون کو اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔

''جناب!میرا والد شدت سے میرا منتظر ہے۔مجھے کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے کی چھٹی ہی دے دی جائے تا کہ اس سے......''

میں نے کہا نا کہ چھٹی نہیں مل سکتی''......

سنائی نے اس مرتبہ ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جناب......جو آپ کا حکم''......کہہ کر احمد ترسون اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اپنے کمرے میں وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا جا رہا تھا۔اس کے ساتھی اس کی اور سنائی کی معاصرانہ چشمک سے آگاہ تھے۔اس لیے اسے دیکھتے ہی وہ ساری بات خود بخود سمجھ گئے اور زیر لب مسکرانے لگے۔اگر سنائی چاہتا تو اسے چھٹی دے بھی سکتا تھا کیونکہ احمد ترسون کوئی ایمر جنسی ڈیوٹی تو دے نہیں رہا تھا۔

اس نے اپنی میز پر رکھا ہوا ٹیلیفون اٹھایا اور باپ کی دکان کا نمبر گھما دیا۔

''ہیلو بابا جان......خالد میرا انتظار کر رہا ہو گا اسے کہو تھوڑی دیر بعد جانے والی کابل غزنی ٹرانسپورٹ کی بس پر بیٹھ کر چلا جائے۔مجھے آج تو کیا ایک ہفتے تک بھی چھٹی نہیں مل سکتی......''اس کی بات پر وہاں موجود اس کے ساتھی قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

''خاد'' کی ٹیلیفون ایکسچینج میں بیٹھا آپریٹر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔اسے ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔یہاں موجود ہر شخص چھٹی کو خدائی عطیہ جاننے لگا تھا۔شاید ہی کوئی خوش قسمت ایسا ہوتا جسے ہفتے میں ایک دن گھر جانے کی اجازت مل جاتی۔جب سے ایمر جنسی کا اعلان ہوا تھا۔وہ لوگ خود کو اس چار دیواری میں قیدی جاننے لگے تھے۔انہیں سارے دن میں بمشکل لنچ ٹائم کے وقت ہی ایک گھنٹہ فرصت کا میسر آتا تھا۔جس دوران وہ یہاں سے باہر نکل کر کھلی فضا میں سانس لے سکتے تھے۔ورنہ تو بے چارے سارا سارا دن وہیں اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے رہتے تھے۔

خادے خان کے پاس دوپہر ہی سے احمد ترسون کا کوئی دوست جلال آباد سے آیا بیٹھا تھا۔احمد ترسون نے اپنے والد کو بتا رکھا تھا کہ وہ آج شام کو اسے ملنے آئے گا کہ اب اچانک اس کا فون آ گیا۔

اس کا بیٹا اتنے غصے میں دکھائی دے رہا تھا کہ اس نے اپنے جلال آباد سے آئے ہوئے دوست سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ خادے خان اس کی اس بے رخی پر حیران رہ گیا۔ یہ بات اس کی پٹھانی روایات کے سراسر خلاف تھی۔ اسے اپنے بیٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ سرکاری نوکری کرتے کرتے وہ اپنی روایات کو بھی فراموش کرنے لگا تھا۔

خادے خان نے بڑے معذرتی لہجے میں اس کے دوست کو اطلاع دی اور اس کا پیغام بھی دہرا دیا۔

''وہی ٹرانسپورٹ بیٹا...... جس کی بسیں یہاں سے غزنی اور دوسری طرف جلال آباد کے لیے چلتی ہیں۔''

خادے خان نے اسے مکمل اطلاع بہم پہنچائی۔

''کوئی بات نہیں...... اصل میں سرکاری نوکری ہے ہی بری چیز......''

خالد نے اظہار افسوس کیا۔

''ہاں بیٹا! لیکن اس نالائق کو سمجھائے کون......''

خادے خان بولا۔

''اچھا بزرگوار مجھے چلنا چاہئے شاید تھوڑی دیر بعد مجھے لاری بھی نہ مل سکے۔ کرفیو لگ جاتا ہے نا۔''

خالد نے اٹھنا چاہا۔

''نہیں بیٹا...... تم میرے ساتھ گھر چلو...... یہ مناسب نہیں لگتا''......

خادے خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں بزرگوار...... پھر کبھی سہی...... احمد کو علم ہے کہ مجھے آج رات واپس پہنچنا ہے۔ وہاں بھی کام کا ہرج ہو رہا ہوگا۔ اسی لیے اس نے کہا ہے...... آپ برا نہ منائیں۔ وہ میرا بہت بے تکلف دوست ہے۔''...... خالد نے بوڑھے خادے خان کو تسلی دی۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے دوست کو فون کر لوں۔''

''کیوں نہیں بیٹا''...... کہتے ہوئے خادے خان نے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

خالد نے ایک نمبر ملا کر اپنے کسی دوست کو اپنی آمد اور روانگی کی اطلاع دی اور بتایا تھا کہ وہ کابل غزنی ٹرانسپورٹ کی بس سے جلال آباد جا رہا ہے۔ فون کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آخری لاری کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کے ''نا''''نا'' کرنے کے باوجود خادے خان اسے لاری اڈے تک چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔

ابھی وہ لوگ بمشکل وہاں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ چل کر لاری اڈے کے قریب ہی پہنچے تھے جب اچانک احمد ترسوں کے دوست کو نزدیکی بازار میں کوئی ''ضروری کام'' یاد آ گیا اور اس نے خادے خان کا شکریہ ادا کر کے اس سے جان چھڑا لی۔

''الحمدللہ''...... پیغام سنتے ہی بے اختیار امیر داد خان کے منہ سے نکلا۔ ''اللہ نے فضل کیا اور فیضان اوغلو کا منصوبہ کامیاب رہا۔''

''الحمدللہ''......اس کے نزدیک بیٹھے باقی ساتھیوں نے بھی بیک زبان پکارا۔

''قاسم!......ساتھیوں کو چوکس کردو......آج اللہ نے ہمیں دشمن سے کابل میں براہ راست دو دو ہاتھ کرنے کا موقعہ دیا ہے......اس موقعے کو غنیمت جانو......اللہ ہمارا مددگار ہو......''اس نے قاسم ایشان زادے کو مخاطب کیا۔

''بے شک یا امیر۔''

مختصر سی دعا کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔

جس جگہ وہ لوگ بیٹھے تھے وہ پہاڑی سلسلے سے ملتی ایک جدید اور ماڈرن آبادی تھی جہاں کابل کے روسا اور افسران قیام پذیر تھے۔ عام شہری تو اس کالونی کے نزدیک پھٹکنے کی جسارت بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس ماڈرن کوٹھی کے ایک تہہ خانے میں رکھے ایک ٹرانسمیٹر کے ذریعے یہ پیغام مجاہدوں تک پہنچ گئے۔

قاسم کے بعد اس کے باقی ساتھی بھی ایک ایک کرکے باہر نکل گئے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ اپنی اپنی جگہ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اپنایا تھا وہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

پہاڑی سلسلے کے آغاز کے بمشکل ایک فرلانگ بعد ہی مجاہد مورچہ بند ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں محیر العقول کارنامہ انجام دینا ہے: افغانستان کے سب سے بڑے شہر میں......روسی افواج کے مرکز میں......حکومتی طاقت کے گڑھ میں بیٹھ کر انہیں حکومت سے ٹکرانا تھا۔

غیر ملکی خود ساختہ آقاؤں کو بتانا تھا کہ پہاڑوں کے بیٹے آزاد فضاؤں کے مکین ہیں۔ غلامی کا لفظ ان کی کسی......لغت میں موجود نہیں۔

وہ آزاد پیدا ہوتے اور آزادی سے زندہ رہ کر مرنے کے قائل ہیں۔ غلامی کی زندگی سے وہ باوقار موت کو ہر حال میں بہتر جانتے ہیں۔ یہ آزادی، اخوت، جہانبانی اور جاں نثاری ان کے خمیر میں رچ بس چکی ہے۔ انہوں نے سر جھکانا سیکھا ہی نہیں۔

وہ سربہ فلک کی چوٹیوں جتنے بلند اور ناقابل تسخیر عزائم سینوں میں رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں:

''کوہسار باقی......افغان باقی''......اور کوہساروں کو موت نہیں۔

☆☆

کابل غزنی ٹرانسپورٹ کی بس کمانڈوز اپنے پیٹ میں سمیٹے بڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ ''میجر ششکن'' ونڈ سکرین کے باہر سڑک پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار کے بعد اب دھند پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ بس کی تیز لائٹس اور اس کے ماتھے سے بندھی سرچ لائٹ کی روشنی میں بھی وہ لوگ بمشکل پندرہ بیس گز دور تک ہی دیکھ سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ دھند گہری ہوتی جارہی تھی......''کہرا اور یخ بستہ موت کی طرح بے رحم سردی کی تیز لہر کابل کو اپنے دامن میں لپیٹ رہی تھی۔ بس ائیر کنڈیشنڈ تھی اور اس کے ہیٹر پوری رفتار سے چل رہے تھے اس کے باوجود میجر ششکن کو سردی اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس ہورہی تھی۔ وہ

سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ جب بس سے باہر نکل کر وہ لوگ کھلی فضا میں پہنچیں گے تو کس طرح برفانی ہواؤں کا سامنا کر پائیں گے۔

فیضان اوغلو بھی باقی مسافروں کی طرف سوچوں کے گہرے بھنور میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا اور ابھر ابھر کر ڈوب رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جانے اب تک کتنی مرتبہ اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر چکا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی توقعات پر پورا اترا ہے۔ اسے اس بات کا بالکل خوف نہیں تھا کہ گھیرے میں آنے کے بعد خود اس کی اپنی حالت کیا ہوگی؟

اسے تو صرف ایک بات کی خوشی تھی کہ وہ جس جگہ ان لوگوں کو لے جا رہا تھا۔ وہاں سے ان میں سے کسی کے زندہ سلامت بچ آنے کے ایک فیصد امکانات بھی باقی نہیں تھے۔ اسے اگر کوئی سوچ پریشان کر رہی تھی تو یہی کہ اس کے اپنے کچھ لوگ بھی مارے جائیں گے!" کچھ بھی تھا۔ آخر یہ سب تھے تو افغانی۔

بس اب پہاڑی سلسلے کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ ایک پہلے سے مخصوص شدہ مقام پر پہنچ کر رک گئی اور میجر ششکن نے کمانڈوز کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ کرنل شالوخوف کی ہدایات پر اس نے دھند میں لپٹی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ کمانڈوز کو اس طرف بڑھنے کی ہدایت کی جس طرف فیضان اوغلو کے کہنے کے مطابق تخریب کار چھپے ہوئے تھے۔

اب پوزیشن کچھ اس طرح ہوگئی تھی کہ نہتا فیضان اوغلو آگے آگے تھا۔ میجر ششکن اور دو حوالدار اس کے پیچھے پیچھے اور ان تینوں کے پیچھے کمانڈوز کا دستہ آ رہا تھا۔ وہ سب لوگ اس طرح آگے بڑھ رہے تھے کہ سوائے فیضان اوغلو کے اور کوئی دور سے دیکھنے پر دکھائی نہ دیتا تھا اور یہاں موجود لوگوں کو بھی احساس ہوتا کہ جیسے اکیلا فیضان ہی اس طرح آ رہا ہے۔ راستہ بڑا دشوار اور کٹھا پھٹا تھا۔ وہ لوگ پہاڑیوں اور چھوٹی چھوٹی ٹیکریوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

اچانک ہی وہ حادثہ ہوگیا۔ میجر ششکن کو یوں محسوس ہوا جیسے چلتے چلتے فیضان اوغلو کا پاؤں رپٹ گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ لڑھکتا ہوا پہاڑی ڈھلوان سے نیچے گرنے لگا۔ میجر ششکن زبردست قوت ارادی کا مالک تھا۔ اس نے بغیر کسی خوف جھجک کے اپنے لمبے کوٹ کی جیب سے ٹارچ نکالی اور چاہا کہ اس کی روشنی میں حالات کا جائزہ لے۔

ابھی ٹارچ بمشکل روشن ہی ہوئی تھی کہ ایک گولی عین اس کے سینے میں آن لگی۔ اسکے منہ سے آہ نکلی اور وہ الٹ کر پرے جا گرا۔ ٹارچ اسکے ہاتھ سے نکل کر پہاڑی سلسلے میں لڑھکنے لگی تھی۔

قاسم ایشان زادہ نے اپنی رائفل کے اوپر لگے انفرا ریڈ شیشے میں سے اپنی گولی کو نشانے پر لگتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور اگلے شکار کا منتظر رہا۔

حوالدار نے گولی کی آواز سنتے ہی ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ہمراہیوں نے میجر کو اس طرح گرتے دیکھا تو فوراً روشنی والے گولے (ٹریسر) فائر کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ادھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ یہ الگ بات کہ تخریب کاروں کے بجائے پہاڑی سلسلے کے پتھر ان کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔

روشنی راؤنڈز سے رات میں دن کا سماں باندھ دیا تھا لیکن تخریب کاروں کو تو جیسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ الٹا ان ہی پر قیامت ٹوٹنے لگی۔ وہ لوگ تاک تاک کر انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ بالکل یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے جنگ سے زیادہ یہ کوئی ''چاند ماری'' کی مشق ہو۔

کرنل شولوخوف اور ڈائریکٹر اسفندیار بڑی بے تابی سے آپریشن روم میں بیٹھے کسی خوشخبری کے منتظر تھے۔ جب اچانک ریڈیو سیٹ میں جان پیدا ہوئی۔

''کمانڈ...... کمانڈ...... اوور'' سیٹ سے آواز بلند ہو رہی تھی۔

اسفندیار نے پھرتی سے قریب رکھا مائیک اٹھالیا۔ بٹن دبا کر اس نے رابطہ بحال کیا۔

''کمانڈ اٹنڈنگ یو...... اوور''

''سر! ہم بری طرح گھیرے میں آچکے ہیں۔ ہم پر زبردست فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہ لوگ نظر نہیں آرہے...... اوور''

فائرنگ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کرنل شولوخوف کو یوں لگا جیسے اچانک کسی نے اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا ہو۔ وہ قریباً لڑکھڑاتا ہوا سیٹ تک پہنچا تھا۔

''کیا بک رہے ہو...... اوور'' اسفندیار غصے سے چلایا۔

''سر...... ٹھائیں'' ...... گولی کی آواز آئی اور سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اسفندیار کے حواس ابھی تک بحال تھے۔ اس نے فوراً دوسری طرف سلسلہ جوڑا۔

''کنٹرول۔ کنٹرول۔ مجھے فوراً بگرام سے ملاؤ۔

''بگرام بات کیجئے جناب'' ...... تقریباً آدھ منٹ بعد ہی کنٹرول سے آواز آئی۔

اسفندیار نے فوراً قریب دھرے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو۔ لائن پر کون ہے؟'' ......

اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ایڈجوٹنٹ'' ...... جواب ملا۔

''مجھے فوراً کمانڈنگ آفیسر سے ملاؤ...... میں اسفندیار بول رہا ہوں۔''

''او۔ کے سر۔''

دوسرے ہی لمحے ایک روسی کرنل لائن پر تھا۔

''فوراً کوہ صافی کی طرف گن شپ ہیلی کاپٹر بھیجو۔''

''جناب والا! اتنی دھند میں یہ کیسے ممکن ہے؟'' ...... آواز خاصی بلند تھی۔

کرنل شولوخوف نے اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔ اس نے روسی زبان میں اپنا تعارف کرا کر اسے ڈانٹ پلائی اور فوراً حکم کی تعمیل کے لیے کہا۔

☆☆

تھوڑی دیر بعد ہی بگرام کے فوجی اڈے سے ایک گن شپ ہیلی کاپٹر اور کوہ صافی کے نزدیکی علاقے سے "سٹینڈ ٹو" افواج کا چاق و چوبند دستہ تیزی سے کوہ صافی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں کمانڈوز کی تعداد ایک ایک کر کے گھٹتی چلی جا رہی تھی۔

کمانڈوز کی سو گولیوں کے جواب میں تخریب کاروں کی طرف سے بمشکل دس گولیاں فائر ہوتی تھیں۔ لاری پر مورچہ بند کمانڈوز نے جب فائرنگ کی آواز سنی تو انہوں نے اس کی چھت پر لگی مشین گنوں سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی، لیکن انہیں بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ آخر کس "ہدف" پر نشانہ لگائیں۔ ان کی یہی حرکت ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

شاید اس طرف ابھی تک کسی کا خیال نہیں گیا تھا۔ جب بس کی چھت سے فائرنگ شروع ہوئی تو "تخریب کار" اس طرف بھی متوجہ ہو گئے۔ چھت پر موجود کمانڈوز اپنے کام میں مصروف تھے انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ان کے سروں پر قیامت ٹوٹی یکے بعد دیگرے تین ہینڈ گرنیڈ عین ان کے درمیان پھٹے اور لاری سمیت ان کے پرخچے اڑ گئے۔

اگر وہ لوگ روشنی راؤنڈ فائر نہ کرتے تو اس غضب کی دھند میں ان کی پسپائی کے امکانات قدرے روشن تھے لیکن انہوں نے اب اپنے لیے اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر لی تھی یہ لوگ روسی افواج کے تربیت یافتہ تھے اور انہیں جدید خطوط پر لڑنے مرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ اس صورت حال سے وہ گھبرائے تو نہیں تھے لیکن انہیں کچھ نہ سوجھتا تھا کہ وہ کریں تو کیا؟

جس سمت سے ایک گولی بھی ان کی طرف آتی وہ اس طرف گولیوں کا مینہ برسا دیتے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ انہیں اور کچھ تو نہ سوجھا اب وہ لوگ فائرنگ کرتے کرتے ایک طرف سمٹنے لگے تاکہ اس طرف خود کو ایک ڈھلان کی اوٹ میں محفوظ کر لیں۔

قاسم ایشان زادہ نے اپنی رائفل پر لگے شیشے سے فیضان اوغلو کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ اسے شاید گرنے سے چوٹ آ گئی تھی کیونکہ وہ اٹھنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ قاسم نے چاہا کہ اس ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کر جس پر وہ مورچہ زن تھا اس جگہ تک پہنچے جہاں فیضان اوغلو گرا ہے تاکہ اسے اٹھنے میں مدد دے سکے۔

اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس نے ایک شخص کو سٹین گن لہراتے چھلانگ لگا کر اس کی طرف لپکتے دیکھا تھا۔ وہ شخص مختلف ٹیلوں پر پھلانگتا اندازے سے اسی سمت آ رہا تھا۔ جس طرف فیضان گرا پڑا تھا۔

حوالدار نے گر کر اٹھنے میں خاصی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا وہ جانتا تھا کہ فیضان اوغلو کو مارنے کی ڈیوٹی اس کے ذمے کرنل شولوخوف نے لگائی ہے اور اگر اسے صبح ان لاشوں میں فیضان کی لاش نہ ملی تو کچھ بعید نہیں کہ وہ حوالدار ہی کو گولی مار دے۔ وہ مختلف ٹیلے پھلانگتا اندازے سے اس سمت جا رہا تھا جہاں اس کے خیال کے مطابق فیضان کو ہونا چاہیے تھا۔ جلد ہی اسے ایک دھندلا سا سایہ ایک پتھر کے نزدیک دکھائی دیا۔

یہ فیضان اوغلو کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

حوالدار نے فوراً اسٹین گن سیدھی کی کہ اس طرف برسٹ فائر کر سکے، لیکن ابھی اس کا ہاتھ ٹریگر تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک گولی اس کے ماتھے میں گھس گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

قاسم ایشان زادہ اور فیضان اوغلو نے ایک ساتھ ہی گن شپ ہیلی کاپٹر کی آواز سنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں شمال مشرق کی سمت سے روشنی کا ایک ہالہ اس سمت بڑھتا دکھائی دیا۔ ہیلی کاپٹر کی تیز سرچ لائٹس اس کے پروں کے نیچے روشن تھیں۔ جن میں سے گنز کی نالیاں باہر جھلکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

فیضان اوغلو گرا تو ارادتاً تھا، لیکن لڑھکنے سے اس کی چوٹوں کا درد جاگ اٹھا۔ پسلیوں سے درد کی تیز رو سارے جسم میں دوڑنے لگی۔ وہ بے حال سا ہو کر وہیں پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے عقب میں گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ یہ وہی حوالدار تھا۔

ہیلی کاپٹر کی آواز نے اس کی ضائع شدہ توانائیوں کو جیسے پھر سے اس کے جسم میں لوٹا دیا تھا۔ وہ اٹھا اور ٹیلوں کے عقب میں بنی ماڈرن آبادی کی سمت بھاگنے لگا جو یہاں سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور نظر آ رہی تھی۔

فیضان اوغلو دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ اسے اپنے پیچھے گن شپ ہیلی کاپٹر کی مشین گنوں کا شور بخوبی سنائی دے رہا تھا۔ یہ مقام شکر تھا کہ وہ اس کی روشنی کی زد سے باہر تھا نہ ہی اس طرف کوئی کمانڈو موجود تھا۔ آہستہ آہستہ اس کو سڑک نظر آنے لگی۔ پھر اچانک جیسے زمین نے اسے کے قدم جکڑ لئے۔

سڑک پر ایک دوسرے کے عقب میں روشنیوں کا طوفان وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ گھیرے میں آئے ہوئے کمانڈوز کی مدد کو فوج آ گئی تھی...... فیضان اوغلو نے اپنا رخ بدلا اور قریبی آبادی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اسے وہاں ضرور پناہ مل جائے گی کیونکہ یہ بات اس کے مشاہدے میں آ چکی تھی کہ لوگوں کے دل ''تخریب کاروں'' اور زبانیں ''قوائے دوست'' کے ساتھ ہیں۔

بھاگتے بھاگتے وہ بے دم ہو گیا تھا اور اب تو اسے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ کرفیو کا وقت ہو چکا تھا۔ تب ہی تو سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ اس کے پیچھے فائرنگ کی آوازیں اب خاصی تیز ہو گئی تھیں۔ شاید مدد کو آنے والی فوج نے بھی مورچے سنبھال لئے تھے۔

کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا وہ آبادی کے آخری سرے والے مکان تک پہنچ گیا۔ یہ جدید طرز کا مختصر سا بنگلہ تھا۔

☆☆

درد سے بے حال فیضان اوغلو نے دروازے پر ہاتھ مارا تو وہ کھلا ہوا ملا۔ ارد گرد کے مکانوں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں یہاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یوں تو یہ روزانہ کا معمول بن چکا تھا، لیکن آج شاید معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین دکھائی دیتا تھا۔ اسی لئے تو لوگ اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر فیضان نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ فوراً اندر کی روشنی جل اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ فیضان میں اتنادم بھی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے قدموں ہی پر کھڑا ہو سکے۔ وہ دروازہ کھلتے ہی آگے بڑھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ کمر پر لگنے والی لات اتنی ہی زوردار تھی۔

''ہینڈز اپ......'' کی آواز پر جب اس نے اٹھ کر بیٹھنے کے بعد پلٹ کر دیکھا تو جگدون ارخان اس کی طرف پستول تانے کھڑا تھا۔

فیضان اوغلو جو سیدھا ایک تخت پوش سے ٹکرایا تھا، اب اسی سے پشت جمائے زمین پر دوزانو بیٹھا بے بسی سے اپنی بدبختی کا جائزہ لے رہا تھا: جس نے اسے پلازہ ہوٹل سے ''خاد'' کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچایا تھا اب فرار ہونے کے بعد وہ اسی کے حضور دوبارہ ''خاد'' کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچنے کے لیے چلا آیا تھا۔

''خاد...... جہاں ایک اذیت ناک موت اس کی منتظر تھی!

اچانک ارخان کے پیچھے والا دروازہ کھلا جس کے ساتھ ہی ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔

''پستول پھینک دیجیے۔ آپ میرے نشانے کی زد پر ہیں۔''

بے اختیار فیضان اوغلو کی نظریں اس سمت اٹھیں: بادامی آنکھوں اور لمبے بالوں والی یاسمین شب خوابی کے لباس میں ارخان کی پشت سے ریوالور لگائے کھڑی تھی۔

''یاسمین'' ...... میجر ارخان کی آواز میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔

''یاسمین'' ...... فیضان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔

سرخ آندھی

''ہاں میں یاسمین ہی ہوں فیضان۔''

یاسمین کی آواز پرسکون اور کسی گہرے کنوئیں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔'' مجھے علم تھا کہ تمہارے استقبال کے لیے میرے بابا نے یہ تیاری کی ہے۔''

''میرے لیے تو تمہارے بابا ہی کافی تھے''......

فیضان نے طنزیہ لہجے میں اس کی بات کاٹ کرجگون ارخان کی طرف اشارہ کیا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو فیضان! یہ پستول میں نے اپنے باپ پر تانا ہے''......

یاسمین کا لہجہ مضبوط اور غیر متزلزل تھا: ''شاید تمہیں بھی دوسرے لوگوں کی طرح یقین نہ آئے فیضان! کہ میں اب وہ یاسمین نہیں رہی جو تمہارے ساتھ ماسکو کی ایک یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھی۔''

فیضان اپنی تکلیف بھول چکا تھا۔ اسے بہت سی بھولی ہوئی کہانیاں یاد آ گئیں۔

پہلی مرتبہ جب وہ یاسمین سے اچانک کالج کی سیڑھیوں پر ٹکرایا تھا تو کئی دن تک کھویا کھویا سا رہا۔ اس کے دوست ناظر خان نے اسی روز کالج کینٹین میں بیٹھے ہوئے فیضان اوغلو سے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اس لڑکی کی ملاقات نے ہمیشہ حادثات کو جنم دیا ہے۔''

فیضان اس کی بات مسکرا کر ٹال گیا یاسمین سے اپنے ٹکراؤ کو ٹالنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ جلال آباد سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا اور جلد ہی اس نے محسوس کر لیا کہ جلال آباد اور کابل کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ترقی پسندی کے نام پر ایسی ایسی خواہشات یہاں رواج پا گئیں تھیں کہ خدا کی پناہ! اس نے کبھی زندگی میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی افغان شعائر اسلامی کا مضحکہ بھی اڑا سکتا ہے......لیکن یہاں تو قدم قدم پر نہ صرف ایسے واقعات ہو رہے تھے بلکہ ایسا کرنے والوں کی مکمل حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی تھی۔

پہلے پہل تو اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ افغانستان ہی کے کسی شہر میں ہے یا یورپ میں آ گیا ہے۔ طلبا کے ''محاذ اسلامی'' کے مقابلے میں ''پرچم'' اور ''خلق'' پارٹی کے کمیونسٹ کھل کر آ گئے تھے۔ اس کی ہمدردیاں ضرور طلباء کے محاذ اسلامی کے ساتھ تھیں، لیکن اس نے کبھی سیاست میں سرگرم حصہ نہیں لیا تھا۔

فیضان اوغلو کی دوسری ملاقات یاسمین سے اس وقت ہوئی جب وہ طلبا کے ایک گروہ کی قیادت کرتی وہاں گھس آئی تھی جہاں اسلام پسند طلباء کا جلسہ ہو رہا تھا۔ فیضان یہاں صرف تقریریں سننے آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہنگامہ شروع ہوتے ہی وہ وہاں سے نکل گیا۔

یاسمین کی نظر اس پر پڑی۔ دونوں کی نظریں آپس میں ملیں تو یاسمین کو اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔ فیضان نے اس کی حرکت کو محسوس ضرور کیا لیکن اسے کچھ کہہ نہ سکا۔ اسے یوں لگا جیسے یاسمین نے اس کا تمسخر اڑایا ہو۔!

دونوں جماعتوں کے طلباء آپس میں ٹکرا گئے۔ عورتوں اور مردوں کی تفریق بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ فیضان نے سوچا کہ داؤد آخر یہ کیا انقلاب لا رہا ہے جو افغان قوم کی شرم وحیا اور غیرت اسلام کے لیے سم قاتل بنا ہوا ہے۔

جب پرچم اور خلق پارٹیاں نہیں تھیں تو کبھی ایسے واقعات پیش نہیں آئے تھے۔ اب تو تعلیم بھی مخلوط ہو گئی تھی۔ اس ہنگامے میں یاسمین کے علاوہ بھی لڑکیاں بھرپور حصہ لے رہی تھیں۔ لیکن اسے یاسمین کے رویے پر ضرور دکھ ہوا تھا کہ وہ آخر اپنی نسوانیت کا تقدس کیوں برقرار نہیں رکھنا چاہتی۔

☆☆

رات کو جب وہ ہوسٹل میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹا تو نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی ایک نامحسوس سی بے کلی اسے لگی رہی۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ آخر وہ یاسمین کے متعلق کیوں سوچ رہا ہے۔ اس کا رشتہ کیا ہے یاسمین سے؟ اسے اب اپنے ہی رویئے سے الجھن ہونے لگی تھی۔

اس رات کافی دیر گئے تک وہ جاگتا رہا بالآخر نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں سمو لیا۔

اگلے روز جب وہ کالج کی گراؤنڈ کے ایک کونے میں بنی پتھر کی بنچ پر بیٹھا تھا تو بھی اس کے ذہن پر یاسمین ہی سوار تھی۔ پھر تو جیسے معجزہ ہو گیا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب یاسمین اچانک ہی اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

''ہیلو کامریڈ''......

اسے یاسمین کی آواز سنائی دی اور وہ اس طرف گھوم گیا۔

یاسمین کی اچانک آمد، بیباک لہجہ اور بے تکلفی نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا جواب دے۔

''السلام علیکم''......

وہ بے اختیار کہہ گیا اور یاسمین خواہ مخواہ مسکرا دی۔

''آپ یہاں اکیلے بیٹھے تھے۔ میں نے سوچا آپ کی خیریت دریافت کر لوں''......

اس نے فیضان کے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا جس کے کانوں کی لویں سرخ ہو رہی تھیں۔

فیضان کا دل ایک مرتبہ تو اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا۔ اسے خیال آیا کہ آخر یہ کیوں اس کا حال دریافت کرنے چلی آئی ہے۔ ابھی تو ان کی کوئی باقاعدہ ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ کبھی انہوں نے اکٹھے بیٹھ کر گفتگو بھی نہیں کی۔ بس ایک دفعہ اچانک

ٹکراؤ۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے، جس آگ میں وہ جل رہا ہے، یاسمین بھی اسی آگ کا ایندھن بن چکی ہو۔

اس وقت فیضان کا ذہن اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کے کسی اور پہلو پر بھی نظر رکھتا۔ وہ سیدھا سادا پٹھان تھا اور مضبوط مسلمان اور بس لیکن وہ بھول رہا تھا کہ اس کا طاقتور جسم ہی دراصل ان لوگوں کی کمزوری ہے جن سے یاسمین کا واسطہ ہو رہا ہے۔ وہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے اس کی ہمدردیاں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے خواہ اس کے لیے ایسی بہت یاسمینیں بھی بھینٹ چڑھ جاتیں۔

اس روز وہ آہستہ آہستہ یاسمین سے کھلنے لگا اس نے واقعی یاسمین سے جی بھر کر باتیں کی اور اسی گفتگو میں اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ پہلے ہی ٹکراؤ کے بعد اس کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔

فیضان سیدھا سادا پٹھان تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ جب تک اپنے دلی جذبات یاسمین تک نہیں پہنچا لیتا اسے سکون میسر نہیں آئے گا۔ تب یاسمین نے اس کی اس ''کمزوری'' کو اپنے لیے ''بونس'' ہی سمجھا تھا۔

''آپ کو اس طرح سٹوڈنٹس سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔''

اس نے وڑتے ڈرتے بالآخر یاسمین سے کہہ ہی دیا۔

اس کی اس بات پر یاسمین نے بڑا زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ ''تم بھی آہستہ آہستہ سمجھو گے سب کچھ...... فیضان''...... وہ اس کے اتنا قریب جھک گئی کہ فیضان پر بے خودی سی طاری ہونے لگی۔

''یہ ملاں بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کے لیے تو یہ کینسر ہیں! یہ کینسر آہستہ آہستہ ہماری جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کے ہماری بنیادوں کو زنگ لگ جائے ہمیں اس سرطان کو کاٹ کر پھینکنا پڑے گا۔ آؤ کینٹین پر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

اس نے فیضان کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ فیضان کسی سحر زدہ معمول کی طرف اٹھ کر اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ کینٹین میں بیٹھے کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے چونک کر یاسمین کے اس ''نئے شکار'' کو دیکھا تھا۔

ایسی ہی چند ملاقاتوں کے بعد وہ یاسمین کی زلفوں کا مکمل اسیر ہو چکا تھا اور یاسمین کو اس کے ترقی پسند دوستوں نے ایک ''ملاں'' کو راہ راست پر لانے پر خوب مبارکباد دی تھی۔

جس روز اسے اطلاع ملی کہ وہ اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ماسکو یونیورسٹی میں وظیفہ پانے والے طالب علموں میں منتخب ہو گیا ہے تو بجائے خوش ہونے کے وہ اداس ہو گیا: ''کہ یاسمین کے بغیر اتنی مدت کیسے گزارے گا۔'' لیکن اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب یاسمین نے اسے اس کے کمرے میں آ کر خوشخبری دی کہ وہ بھی اس کورس پر جانے کے لیے منتخب ہو گئی ہے......!

☆☆

فیضان کے والد نے بیٹے کے شوق کے پیش نظر اسے پڑھائی جاری رکھنے کی اجازت دی تھی وگرنہ وہ جانتا تھا کہ بالآخر اس کے بیٹے کو اس کا کاروبار سنبھالنا ہے لیکن جب اس کے چھ ماہ کے لیے روس جانے کی خبر اسے ہوئی تو وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے

کو "کافروں کے ملک" میں جانے دے لیکن اپنی تربیت پر بھی اسے اعتماد تھا اور یہ بات بھی اس کے پیش نظر تھی کہ آج تک فیضان نے اس کا ہر حکم مانا ہے۔ اب وہ اس سے علیحدہ تھے۔ خصوصاً اس ماحول میں جواب "مشاوروں" کے آ جانے اور ان کے ساتھ ہی ان کا بے تحاشا لٹریچر پھیل جانے کے باعث اس کی توقعات سے بھی زیادہ تیزی سے لادینیت کی طرف مائل تھا کچھ بھی متوقع تھا۔

وہ خود اپنے بیٹے سے ملنے آیا اور باتوں باتوں میں اس سے پوچھتا رہا کہ وہاں وہ کیا سیکھنے پڑھنے جا رہا ہے۔ فیضان اپنے مذہبی باپ کے خدشات کو جانتا اور سمجھتا تھا اس نے جلد ہی اپنے والد کو مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ جاتے ہوئے اس کا والد اسے دوبارہ ترکستان سے اپنی ہجرت کی کہانی سنا کر گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کی فیضان اوغلو اس کہانی کو کبھی نہ بھولے۔

ایروفلوٹ کے اس جہاز میں دونوں کی نشستیں ساتھ ساتھ تھیں۔ اپنے کالج سے ایئر پورٹ تک کا فاصلہ انہوں نے یونہی طے نہیں کر لیا تھا۔ اس دوران فیضان کو بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح متعدد بار مختلف روسی افسران کے سامنے انٹرویو کے لیے پیش ہونا پڑا۔ اسے حیرت ہوتی جب یہ لوگ اس کے ساتھ پشتو اور فارسی بالکل اپنی زبان کی طرف بولتے تھے۔

ہر انٹرویو کرنیوالے نے بڑی گہری اور تنقیدی نظروں سے لیکن مسکراتے ہوئے اسکا جائزہ لیا۔ ایک دو مرتبہ اس سے مذہبی قسم کے سوالات بھی کیے گئے، لیکن بڑے نامحسوس طریقے سے۔

فیضان یہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جہاز میں اس کے ساتھ یاسمین کی سیٹ بھی اسی منصوبہ بندی کا حصہ ہے جس کا وہ شکار ہونے جا رہا ہے۔ ایروفلوٹ کی وہ خوبصورت اور انتہائی متناسب اعضاء والی ائیر ہوسٹس تو جیسے اس کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی اس نے فیضان اور یاسمین کی "بھرپور مہمان نوازی" کی تھی اور ماسکو پہنچتے تک فیضان کو یقین ہو چکا تھا کہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب قوم روس میں بستی ہے۔

اس دوران یاسمین نے بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنے قرب کے لمس اور گفتگو کے سحر سے فیضان کو جکڑ لیا تھا۔

جہاز جب ماسکو کے ہوائی اڈے پر اترا تو فیضان ذہنی طور پر تسلیم کر چکا تھا کہ روس سے بڑا افغانوں کو کائی دوست نہیں اور ملاؤں سے بڑا افغانستان کا کوئی دشمن نہیں۔

ماسکو ایئر پورٹ پر آنے والی اس "خصوصی فلائیٹ" کو ایک الگ مقام پر ٹیکسی کیا گیا تھا۔ فیضان نے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ہوائی اڈہ سرخی میں رنگا دکھائی پڑا۔ چاروں طرف سرخ پھریرے لہرا رہے تھے۔

وہی ائیر ہوسٹس ایک مرتبہ پھر ان کے نزدیک آئی اور جھک کر فیضان سے مسکراتے ہوئے کہنے لگی:

"کامریڈ اگر مہمان نوازی میں کمی رہ گئی ہو تو معاف فرما دیں۔"

"نہیں انہیں شکریہ۔ آپ نے تو......" شدت جذبات سے مغلوب سادہ لوح پٹھان بچہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

☆☆

جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ایک بے نام سے احساس سے اس پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری تھی۔ سیڑھیاں اترنے پر وہ باری باری آگے جاتے اور ماسکو یونیورسٹی کی طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئی ہوئی قطار میں کھڑی لڑکیوں سے ہاتھ ملاتے۔ فیضان نے آج تک سوائے یاسمین کے کسی اور لڑکی کا ہاتھ چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا وہ خاصی جھجک محسوس کرتا تھا کسی خاتون سے ہاتھ ملانے میں۔

لیکن اس کو اتنی مہلت میں کب میسر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ آگے بڑھانے سے پہلے ہی مسکراتی ہوئی لڑکی اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر اسے خوش آمدید" کہہ دیتی۔

ان کا جہاز باقی جہازوں سے بالکل الگ تھلگ کھڑا تھا۔ فیضان اور اس کے ساتھیوں کو اپنے جلو میں لیے میزبان لڑکیاں ایک نزدیکی عمارت میں چلی آئیں جہاں ان کے لئے پر تکلف چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس عمارت کے دروازے پر ایک خاصا بڑا بینر "روس افغان دوستی زندہ باد" کے ساتھ سجایا گیا تھا۔

اس ہال نما کمرے میں جہاں انہیں لایا گیا تھا، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے اپنے کیمروں اور مائیک کے ساتھ سرگرم تھے۔ روس میں موجود افغان سفارتخانے کے علاوہ دوسرے روسی حمایتی ممالک کے سفارتی نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے تک وہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے اور پر تکلف چائے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

ان کے گروپ میں کابل سے بیس لڑکے اور دس لڑکیاں آئی تھیں۔ قریباً سبھی لڑکیاں یاسمین کی طرح بڑی "آزاد خیال اور سلجھی ہوئی لڑکیاں" دکھائی دے رہی تھیں وہ یہاں موجود روسی اور دوسرے کیمونسٹ ممالک کے سفارتکاروں کے ساتھ بڑی بے تکلفی اور بے باکی سے مصروف گفتگو تھیں۔

نجانے فیضان کو کیوں آج کسی بھی افغان لڑکی کے بے باکی پر غصہ نہیں آ رہا تھا......؟"

جہاز سے فیضان اور اس کے ساتھیوں کے نیچے اترتے ہی جہاز میں موجود عملہ اپنے کام میں جت گیا۔ باقی لوگوں کی طرح ایئر ہوسٹس جو خاص طور سے فیضان اور یاسمین کی خدمت پر مامور تھی اپنے ہاتھوں میں مختلف اوزار پکڑے مصروف عمل ہوگئی۔

اس نے دونوں کی سیٹوں کی پشت کھول کر ان میں نصب ٹیپ ریکارڈروں میں سے کیسٹ نکال لئے اور جب اس نے دوبارہ سیٹ کی پشت کو بند کیا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ پشت کبھی سیٹ سے الگ بھی رہی ہوگی۔ وہ تو مکمل سیٹ کا ہی ایک حصہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باقی ساتھیوں نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔ وہ سب کسی مشین کے مختلف پرزے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک دوسرے سے خوفزدہ......اپنے اپنے کام میں مصروف!

اس دوران جہاز کا کیپٹن کاک پٹ سے نکل کر وہاں آ چکا تھا۔ اس نے سرسری نظر ان سب پر ڈالی اس کی گہری اور سرد آنکھوں میں نجانے کیسی پراسراری چمک موجود تھی کہ کسی کو اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

کیپٹن کے وہاں آنے تک وہ لوگ اپنے آپریشن مکمل کر چکے تھے۔ کام ختم ہونے پر وہ سب مؤدب نگاہیں جھکا کر کھڑے ہوگئے۔ ایک

چبھتی ہوئی نظر ان سب کے چہروں پر ڈال کر کیپٹن دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سب اس کے تعاقب میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ کیپٹن سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ ہوائی اڈے کا دوسرا عملہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ جہاز کا پیٹ کھل چکا تھا اور اس میں سے مسافروں کا سامان ایک گاڑی پر لادا جا رہا تھا۔

جہاز کے عملے کو لینے کے لیے ایئر وفلوٹ کی ایک ویگن وہاں آ کر رک گئی۔ کیپٹن تو باہر رہا۔ عملے کے باقی لوگ ایک ایک کر کے ویگن میں سوار ہونے لگے۔ وہ ایئر ہوسٹس جو فیضان و یاسمین کے سر پر مسلط رہی تھی جیسے ہی ویگن کے دروازے کے طرف بڑھی کیپٹن کی آواز سنائی دی۔

''ویلنٹینا......!''

ایئر ہوسٹس اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی وہ بمشکل ہی اپنے قدموں پر کیپٹن کی طرف گھومی تھی۔

''تم رک جاؤ......''

کیپٹن کی آواز سنائی دی اور وہ مؤدب ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆

ویگن کا انجن بمشکل ابھی اسٹارٹ ہی ہوا تھا۔ جب رن وے کے ایک کونے سے ایک چھوٹی سی تیز رفتار کار ویلنٹینا کو اپنی سمت آتی دکھائی دی کار کیپٹن کے نزدیک آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور مستعد فوجیوں کی طرف ایڑیاں بجا کر جہاز کے کیپٹن کو تعظیم دے کر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

کیپٹن سر ہلاتا ہوا آگے بڑھا اور ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی لی۔ ڈرائیور نے فوراً دوسری طرف آ کر اگلا دروازہ ویلنٹینا کے لیے کھول دیا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا۔ کیپٹن نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور کار ایک جھٹکے سے فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس دوران وہاں موجود کسی بھی شخص نے اس طرف نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

ہوائی اڈے کی حدود سے باہر نکلنے تک تین مرتبہ ان کی کار کو روکا گیا لیکن ہر دفعہ وہ لوگ کیپٹن کو پہچانتے ہی اسے سیلوٹ مار کر ایک طرف ہٹ جاتے تھے جلد ہی وہ دونوں ہوائی اڈے سے باہر جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

اس دوران کیپٹن نے بات کرنا تو کیا اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی سرد آنکھیں تو جیسے ونڈ سکرین پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ویلنٹینا کو یوں محسوس ہو رہا تھا ابھی چند لمحوں بعد کیپٹن کی تیز اور نوکیلی نظریں اس ونڈ سکرین کو چھید کر اس میں سوراخ بنا دیں گی۔

قریباً آدھ گھنٹے کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد وہ ماسکو کی ایک جدید آبادی میں پہنچ گئے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ کے سامنے پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ یہ عمارت ویلنٹینا کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس جیسے کئی کپتانوں کے ہمراہ وہ اکثر یہاں پہنچ چکی تھی۔ فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر کیپٹن نے ہارن بجایا۔

ایک لمبے تڑنگے لمبوترے چہرے اور خونخوار آنکھوں والے گارڈ نے دروازہ کھولا۔ کیپٹن کار اندر لے آیا دروازہ ان کے پیچھے بند ہو چکا تھا۔ کیپٹن نے انجن بند کر کے چابی نکالنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ ائیر ہوسٹس کے طرف دیکھے اور بغیر ایک لفظ کہے باہر نکل آیا۔ دروازہ اس نے جھٹکے سے بند کیا۔ دروازے سے زیادہ جھٹکا ویلنٹینا کو اپنے جسم کو لگتا محسوس ہوا۔

وہ ہمت کر کے اپنے حواس مجتمع کر کے اٹھی اور کیپٹن کے تعاقب میں باہر نکل آئی۔ یہ فلیٹ جہاں وہ لائی گئی تھی گو کہ ایک علیحدہ گھر نظر آ رہا تھا لیکن ویلنٹینا کو علم تھا کہ اس بلڈنگ کے دوسرے تمام فلیٹ بھی اس کا ایک حصہ ہیں اس کو یہاں کے اکثر فلیٹ دیکھنے کا تجربہ اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

☆☆

کیپٹن نے برآمدے میں پہنچ کر ایک طرف مڑ کر اس پر نظر ڈالی اور ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ویلنٹینا پے تلے قدموں سے اس کا تعاقب کرتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔

ان کے سفر کا اختتام دوسری منزل کے ایک آرام دہ کمرے کے دروازہ پر ہوا۔ کیپٹن نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ دروازہ بند کر دیا۔

''بیٹھو'' اس نے ائیر ہوسٹس کو ایک آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ خود باتھ روم میں جا چکا تھا.............!

ویلنٹینا نے ایک گہری سانس لے کر خود کو قدرے نارمل کیا اور آنے والے وقت کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ گذشتہ آٹھ برس سے یہی خدمات انجام دے رہی تھیں اس کا تعلق، کے۔جی۔بی کے اس خصوصی شعبے سے تھا جو روس کے ''غیر ملکی دوستوں'' سے رابطہ رکھتا تھا۔ اس کی گزشتہ خدمات کے پیش نظر ہی اس کو ''فیضان اوغلو'' کا خصوصی مشن سونپا گیا تھا۔

اس نوجوان کے متعلق کابل کے سیائی ماسٹر کی رپورٹ بڑی شاندار تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر فیضان قابو آ جائے تو عظیم انقلاب کے لیے ہمیں ''طاقت کا پہاڑ'' مل جائے گا۔

وہ فیضان کو جلال آباد اور اس سے آگے پاکستانی علاقے میں واقع افغان مہاجرین کے کیمپوں میں استعمال کرنے کے خواہش مند تھے، لیکن اس سے پہلے ضروری تھا کہ اس کے دماغ سے ''ملائیت'' کا بھوت نکالا جائے اور اسے صحیح معنوں میں ''انقلابی'' بنا دیا جائے۔

یہی مشن کابل میں یاسمین کو سونپا گیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد کیپٹن باتھ روم سے باہر نکلا۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا اور اسکا موڈ بھی لباس کے ساتھ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ چہرے کی وہ کرختگی جس سے اس کے ماتحتوں کی جان جایا کرتی تھی اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بڑی پر اسراری مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔

اس سب کچھ کے باوجود نجانے اب بھی کیوں ویلنٹینا اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی تھی......!

''کیسا رہا کامریڈ فیضان۔''

اس نے کمرے میں دھری ایک بھاری میز کے کونے پر لگے ایک پش بٹن کو دباتے ہوئے ویلنٹینا کو مخاطب کیا۔

''شاندار جناب''......

ویلنٹینا کی بات مکمل ہوتے ہی ایک باادب ویٹر اندر آ چکا تھا۔

''واڈ کا......''

کیپٹن کے منہ سے نکلا اور وہ الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ ''کیسٹ چلاؤ......'' وہ لفظ بڑی کنجوسی سے استعمال کر رہا تھا۔

ویلنٹینا مشین کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور اسی میز کے ایک کونے میں رکھے ٹیپ ریکارڈ پر اس نے کیسٹ چلا دی۔ اس دوران وہ اپنی جگہ جم کر کھڑی رہی۔ کیسٹ ختم ہونے تک اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی تھی۔

''ٹھیک ہے......'' کیپٹن اس کی طرف متوجہ ہوا ''بیٹھ جاؤ۔''

ویٹر اس دوران وہاں ''واڈ کا'' کی بوتل اور سوڈا اور گلاس رکھ کر چلا گیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ بھی یہاں رک کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی...... ویلنٹینا شاید یہاں کے آداب جانتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے بوجھل قدموں کے ساتھ میز تک پہنچی اور ''واڈ کا'' کا ایک جام تیار کر کے اس نے پہلے کیپٹن کو دیا۔ اس کے بعد اپنے لیے شراب تیار کرنے لگی۔

جام لے کر وہ اس کرسی پر بیٹھ گئی۔ شراب کے دو تین گھونٹ پینے کے بعد وہ خود کو قدرے نارمل محسوس کر رہی تھی۔

''تمہاری ڈیوٹی آج سے بدل دی گئی ہے۔ اب تم فیضان پر کام کرو گی۔ جتنی جلدی مکمل ہو اسے تیار کر لو۔ یاسمین ٹھیک ہے...... لیکن نہیں۔ ہم کسی مسلمان اور پٹھان لڑکی کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے کسی بھی وقت یہ لوگ اپنی ''بورژوائی'' ذہنیت کا مظاہر کر سکتے ہیں۔''

''او۔ کے سر......''

''اس ضمن میں جو ''آپریشن'' تم تیار کرو۔ مجھے آگاہ کر دینا۔''

کیپٹن اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''یس سر......''

''آج رات تم میری مہمان رہو گی...... کل صبح سے آپریشن شروع۔ رپورٹ میں خود ہی موصول کیا کروں گا......''

کیپٹن اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

ایسے کئی کیپٹن اس سے پہلے بھی ویلنٹینا کو اس قسم کی ڈیوٹیاں سونپ چکے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ رات یہاں گزارنا بھی اس کی ''ڈیوٹی کا حصہ'' ہے اور کوئی سچا کامریڈ کبھی اپنے ڈیوٹی سے انحراف نہیں کر سکتا۔

وہ رات بھی اپنی زندگی کی پچھلی کئی راتوں کی طرح اس نے ''عظیم انقلاب'' کی نذر کر دی۔ صبح جب وہ کیپٹن کے پہلو سے اٹھ کر باتھ روم تک پہنچی تو اس کا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بن چکا تھا۔

ناشتے کی میز پر کیپٹن اس کے سامنے اس طرح بیٹھا تھا جیسے وہ ابھی ابھی یہاں آئی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک تیز رفتار کار میں ماسکو کی اس آبادی کی طرف جا رہی تھی جہاں اس کی بوڑھی ماں اور دو چھوٹی بہنیں اس کی منتظر تھیں۔ اس کا بوڑھا باپ تو پچھلے تین سال سے سائبیریا میں اصلاحی قید کاٹ رہا تھا۔ اب یہ ویلنٹینا کی ''خدمات'' پر منحصر تھا کہ کب اسکی عظیم انقلاب کے لیے خدمات پارٹی کے سامنے آتیں اور اس کے باپ کو ان خدمات کے عوض رہائی نصیب ہوتی۔

فیضان نے ائیر پورٹ سے یونیورسٹی تک کے سفر میں افغان عوام کے لیے روس دوستی کے ایسے ایسے شاندار مظاہرے دیکھے تھے کہ وہ دنگ رہ گیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ واقعی آج تک وہ جھوٹ سنتا آیا ہے۔ یونیورسٹی کے دروازے پر ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے اور استقبالیہ نعروں سے ان کا خیر مقدم ہوا۔

رات کے پر تکلف کھانے کا آغاز ''واڈکا'' شراب کی پارٹی سے ہوا۔ کابل سے آئے ہوئے اس کے ساتھی روسی طلباء اور طالبات کے ساتھ مل کر ''جام دوستی'' نوش کر رہے تھے۔ یاسمین فیضان سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے گو کہ ابھی تک فیضان کو دعوت نہیں دی تھی لیکن اس کی خواہش ضرور تھی کہ فیضان بھی آگے بڑھ کر دوسروں کی طرح ''جام دوستی'' ہونٹوں سے لگائے۔

فیضان پہلے سے زیادہ ''آزاد خیال'' ہو گیا تھا، لیکن ابھی اس کا ذہن یہ قبول نہیں کرتا تھا کہ وہ شراب پینی شروع کر دے۔ وہ محفل کے دیگر شرکاء سے ہٹ کر کھڑا تھا یاسمین سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی اور ویٹر تو خاص طور سے اس کی حرکات و سکنات نوٹ کر رہا تھا۔ جس کی مستقل ڈیوٹی اس لیے یہاں لگائی گئی تھی۔

''مجھے یہ سب کچھ نجانے کیوں اچھا نہیں لگ رہا......''

اس نے بڑی بیزاری سے لیکن قدرے نیچے آواز میں یاسمین سے کہا۔

''اصل میں ابھی کچھ دیر بعد تم یہ سب کچھ سمجھو گے انقلاب لانے کے لیے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ ہمیں مل کر چلنا ہے۔ اکٹھے آگے بڑھنا ہے۔''

وہ کچھ الجھ سا گیا، لیکن یاسمین سے کچھ نہ کہہ سکا۔ یاسمین نے بھی زیادہ دیر صبر نہ کیا اور جب فیضان اس سے ''ابھی آیا'' کہہ کر اس ہال کے کمرے کے باہر والے لان کی طرف چلا گیا تو وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جشن نا ؤ نوش میں شریک ہو گئی۔

دوسرے ہی روز ان کی پڑھائی شروع ہو گئی۔ انہیں ہوسٹل میں اکٹھے ہی رکھا گیا تھا۔ اس ہوسٹل میں جہاں ان کا قیام تھا زیادہ تر غیر ممالک کے طالب علم ہی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یاسمین کا کمرہ اس کے سامنے والے بلاک میں تھا۔ یہ بلاک وہاں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا اور انہیں آنے جانے میں کوئی زیادہ دقت کا سامنا بھی نہیں تھا۔

یاسمین رات کو کافی دیر گئے تک اس کے کمرے میں موجود رہتی اور دن بھر کی پڑھائی پر اس سے بحث کیا کرتی۔ فیضان کبھی کبھی یہ سوچ کر ضرور پریشان ہو جاتا: ''کہ وہ یہاں کیا پڑھنے آیا ہے؟''

اس کی دانست میں تو انہیں ماسکو یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، لیکن وہ یہاں صرف نظریاتی تعلیم ہی حاصل کر رہے تھے۔ بمشکل دو پیریڈ انہیں انجینئرنگ پڑھائی جاتی تھی، جبکہ باقی کے چھ پیریڈ میں ان کی نظریاتی برین واشنگ کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ان مسلسل لیکچروں سے بور ہو جاتا لیکن یاسمین عموماً ایسے وقت آڑے آتی اور اسے اس بات پر قائل کر لیتی کہ سچے انقلابی کے لیے ان باتوں کو سیکھنا ضروری ہے وہ اب تک اتنی مرتبہ انقلاب کا لفظ استعمال کر چکی تھی کہ اب فیضان کو اس لفظ سے چڑ سی ہونے لگی تھی، لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار یاسمین پر نہ کر سکا۔

ایک بات وہ خاص طور سے محسوس کر رہا تھا کہ نظم وضبط کی آڑ میں ان پر بعض بے حد ناروا پابندیاں عائد تھیں۔ انہیں ہر جگہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن کسی نے کبھی ان باتوں پر احتجاج نہ کیا۔ یہاں کے طالب علم بھی شاید پختہ ذہن لوگ تھے ورنہ عام حالات میں تو فیضان کے خیال میں طالب علم ایسی سختیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

چھٹی والے روز عموماً یاسمین اس کے ساتھ ہی گھومنے جایا کرتی تھی۔ یہاں نزدیک ہی ایک دریا کے کنارے بڑی خوبصورت تفریح گاہ بنی ہوئی تھی، لیکن آج جب بہت انتظار کے بعد بھی یاسمین نہ آئی تو وہ خود اس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جہاں پہنچ کر اسے علم ہوا کہ یاسمین اپنی ایک مقامی سہیلی کے ساتھ اچانک کسی کام سے چلی گئی ہے۔

فیضان کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کام کونسا ہے، جس کے لیے یاسمین اچانک چلی گئی ہے اور جب اسے اپنے سوال کا کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ تو وہ اکیلا ہی اس تفریح گاہ کی طرف چل دیا جہاں دریا کے کنارے سبزہ زار اور درختوں کی چھاؤں تلے رکھے پتھر کے بنچ پر بیٹھ کر اسے بڑا سکون ملا کرتا تھا۔

☆☆

وہ ایک ویران گوشے میں رکھے بنچ پر اکیلا دریا کے پانی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ابھی چونکہ صبح کا وقت تھا اس لیے بہت کم لوگ یہاں نظر آ رہے تھے۔ فیضان اچانک ہی اپنے پیچھے پیدا ہونے والی قدموں کی آہٹ پر چونکا تھا۔ اس نے گردن موڑی۔

ایک مقامی نوجوان لڑکی اسے اس طرف آتی دکھائی دی۔ وہ یہاں کئی دفعہ آ چکا تھا، لیکن تفریح گاہ کے اس حصے کی طرف پہلی مرتبہ آیا تھا۔ لڑکی بڑی باوقار چال چلتی اس کی طرف آ رہی تھی۔ فیضان نے چاہا کہ نظریں اس پر سے ہٹا لے لیکن خدا جانے لڑکی میں ایسی کونسی کشش تھی جس نے اسے جکڑ لیا۔

زیادہ قریب آنے پر اب اس کے نقوش نمایاں ہونے لگے۔ فیضان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے پہلے بھی کبھی یہ چہرہ کہیں دیکھا ہے، لیکن کہاں؟

پھر جیسے یکدم اس کی کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آئی۔ اسے یاد آ گیا یہ تو وہی ایئر ہوسٹس ہے جو ایئر وفلوٹ میں ان کی میزبان رہی تھی۔

”ہیلو کامریڈ......“

اس نے فیضان کو اچانک وہاں دیکھ کر حیرت اور خوشی کے ملے جلے خدمات کا مظاہرہ کیا۔

”ہیلو......“

فیضان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کمال ہے، آپ سے اچانک یوں دوبارہ ملاقات ہوگئی میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“

وہ اتنی صاف فارسی بول رہی تھی کہ خود فیضان کو بھی اس کے روسی النسل ہونے پر شک گزرنے لگا۔

”آپ یہاں آتی ہیں......؟“

فیضان کو اور تو پوچھنے کو کچھ نہ سوجھا۔

”ہاں! ہاں...... میں اکثر یہاں آتی ہوں اور اسی بینچ پر بیٹھا کرتی ہوں۔ آج جب ایک اجنبی کو یہاں دیکھا تو یونہی اس طرف آ گئی، لیکن میرے تو یہ وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں تم سے ملاقات ہوگی......“ وہ اچانک ہی بے تکلفی پر اتر آئی۔

فیضان کو بالکل حیرانی نہ ہوئی کیونکہ وہ اب تک جان چکا تھا کہ یہ لوگ فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ کم از کم یونیورسٹی کی حد تک تو اس نے یہی کچھ دیکھا تھا۔

ایئر ہوسٹس نے اسے اپنا نام ویلنٹینا بتایا اور اس کے ساتھ کافی دیر تک بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں۔ ویلنٹینا اس سے عمر میں چند سال بڑی ہی ہوگی۔ فیضان کو اس کے قرب میں ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے یاسمین کی طرح اب تک ایک لفظ بھی انقلاب کے بارے میں نہیں کہا تھا......!

دوپہر کے وقت وہ فیضان کو اپنے گھر لے گئی۔ اس کا گھر یہاں سے قریب ہی ایک آبادی میں تھا۔ فیضان کو پہلی مرتبہ کسی روسی آبادی میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا یہاں صفائی کا بہت خیال رکھا گیا تھا۔ چھوٹا سا دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ ویلنٹینا نے بتایا یہ فلیٹ اسے ایئر لائن کی طرف سے ملا ہوا ہے اور وہ اکیلی ہی یہاں رہتی ہے۔

فیضان نے اس کے گھربار کے متعلق اس سے جی بھر کر باتیں کیں اور جب سہ پہر کو وہ اس گھر سے نکلا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

یہاں کی مروجہ اخلاقیات کے بالکل برعکس نہ تو ویلنٹینا نے اسے شراب پینے کو کہا تھا نہ ہی اس پر فلسفہ انقلاب کی موشگافیاں واضح کی تھیں اور نہ ہی اسے سچا انقلابی بننے کا مشورہ دیا تھا۔

اس نے سیاست کے متعلق ابھی تک ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔ بس کبھی کبھی جب فیضان اس سے کابل کا ذکر کرتا تو وہ اس بات پر فخر کا اظہار کرتی کہ کابل اور ماسکو کے درمیان مضبوط دوستی قائم ہے اور اس خواہش کا اظہار بھی کرتی کہ افغانستان خوب ترقی کرے گا۔

واپسی پر وہ اپنی گاڑی پر اسے یونیورسٹی کے باہر چھوڑ کر گئی تھی۔ یہ اس ایئرلائن کی چھوٹی سی کار تھی جس میں وہ ملازم تھی۔ ویلنٹینا نے اسے بتایا تھا کہ چھٹی والے روز اسے ذاتی استعمال کے لیے گاڑی مل جاتی ہے اس نے فیضان کو بتایا کہ عموماً اس کی ڈیوٹی اندرون ملک پروازوں پر لگتی ہے اور وہ رات اپنے فلیٹ میں ہی بسر کرتی ہے۔ کبھی کبھی اسے کابل والی فلائیٹ پر جانا پڑتا ہے۔

ویلنٹینا کی متانت اور زندگی سے قریب تر باتوں نے فیضان کو پہلی مرتبہ دیار غیر میں اپنے وطن کی یاد دلا دی۔ اس سے الگ ہونے کے بعد ایک بے نام سی یاسیت نے اسے جکڑ لیا۔

شام کو ان لوگوں کے لیے کھیل کے میدان میں پہنچنا اور کوئی نہ کوئی کھیل کھیلنا ضروری ہوتا تھا، لیکن آج وہ اپنے انچارج سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے لیٹا رہا۔ رات کا کھانا بھی اس نے اپنے کمرے ہی میں منگوایا تھا۔

اس کے دوست بھی اس کی عیادت کو آ چکے تھے لیکن ابھی تک یاسمین نہیں آئی تھی۔ فیضان کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ اچانک یاسمین کو کیا ہو گیا ہے؟ اب تک کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ چل کر یاسمین کا حال دریافت کر آئے لیکن بہر حال وہ پٹھان تھا۔ ہر مرتبہ اس کی انانیت آڑے آئی اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اسے اس بات پر الجھن ہو رہی تھی کہ وہ یاسمین کے پاس یہ پیغام بھی چھوڑ آیا ہے کہ وہ یہاں آیا تھا۔ پھر بھی یاسمین کیوں نہیں آئی؟

رات دس گیارہ بجے تک وہ مختلف کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اٹھا اور اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ بلاک کے دونوں سروں پر لگے کھمبوں سے لٹکتے بلب روشن تھے۔ اور دور دور تک کسی پہریدار کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

یہاں کسی لڑکی کے کمرے میں اگر وہ تمام رات بسر کر دیتا تو اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جاتا۔ بس یہ ضروری تھا کہ وہ مطلوبہ وقت پر مطلوبہ لیکچر میں ضرور حاضر ہو، لیکن اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے یاسمین کے کمرے میں جاتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔ اس نے ماسکو کی برفیلی ہواؤں سے بچنے کے لیے گرم کوٹ پر بھی چادر اوڑھ لی اور بڑی احتیاط سے پھونک کر قدم دھرتا یاسمین کے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆☆

اس نے اس بلاک تک پہنچنے کے لیے اندھیرا راستہ اختیار کیا تھا۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ واقعی کسی نے بھی ابھی تک فیضان کو نہیں دیکھا تھا۔ اس بلاک کے اکثر کمروں میں اندھیرا تھا، لیکن یاسمین اور دو تین اور افغانی لڑکیوں کے کمروں میں ابھی تک بلب جل رہے تھے فیضان یاسمین کے کمرے سے کچھ فاصلے ہی رک گیا...... ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔

اس نے چاہا کہ آج چھپ کر دیکھے آخر اتنی رات گئے تک یاسمین کیا کر رہی ہے؟ اس ارادے سے وہ یاسمین کے کمرے کی پشت پر آ گیا۔ اس بلاک کے تمام کمروں کی کھڑکیاں جس سمت کھلتی تھیں وہاں ایک خوبصورت نظارہ ان کا منتظر ہوتا تھا۔

اس طرف پھولوں سے لدے پھندے درخت اور پودوں کی قطاریں لگی ہوئی تھی۔ یاسمین کے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت پھولوں سے لدی پھندی بیل لپٹی ہوئی تھی اور فیضان اس کی آڑ میں چھپا کھڑا تھا۔ اس غیر اخلاقی فعل پر اس کا ضمیر گو کہ ملامت کر رہا تھا،

لیکن وہ ایک انجانے تجسس سے جس بری طرح جکڑا ہوا تھا اس سے فیضان کا نکلنا مشکل تھا۔

کھڑکی بند تھی، لیکن شیشوں کے پیچھے پردہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اندر کا منظر با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ فیضان نے ایک لمحے کے لیے اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکا اور پھر جیسے سن ہو کر رہ گیا۔

کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

وہ یہ تو ضرور جانتا تھا کہ یاسمین آزاد خیال ہے اور ضرورت سے زیادہ ماڈرن بھی لیکن فیضان خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لیا کرتا تھا۔ ''کہ جدید کابل کی تقریباً ہر دوسری لڑکی اس رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔'' لیکن آج یہاں اس کی آنکھوں نے جو گھناؤنا منظر دیکھا تھا اس کے بعد سے تو اسے یاسمین سے نفرت ہونے لگی۔

اس نے یاسمین کے ساتھ ایک اور افغانی لڑکی کو دیکھا جو اپنے روسی دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ ہی غیر اخلاقی حرکات کر رہی تھیں۔

فیضان کے سینے میں ایک آگ سی دہک اٹھی اس کا جی تو یہی چاہا کہ اندر جائے اور کم از کم ان دونوں کا گلا گھونٹ ڈالے، لیکن وہ بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ وہ بچہ تو نہیں تھا۔ اس تھوڑی مدت ہی کے قیام نے اس پر بڑے اسرار منکشف کیے تھے۔

پہلے روز کے تمام تاثرات جو ہوائی اڈے سے ماسکو یونیورسٹی پہنچنے تک اس کے ذہن میں قائم ہو چکے تھے اب وہ حرف غلط کی طرح مٹنے لگے تھے روز روز کے نظریاتی لیکچروں نے اسے بتا دیا تھا کہ حقائق وہ نہیں جو انہیں بتائے گئے بلکہ وہ ہیں جو اسے دکھائی دیتے ہیں۔

غصے سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا، لیکن اس نے واپسی پر بھی اس احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا کہ اسے یہاں آتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ جس طرح چپ چاپ وہ گیا تھا اسی طرح خاموشی سے لوٹ آیا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی بتی بجھا گیا تھا تا کہ دور سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ سو چکا ہے۔

اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے فیضان اوغلو کو اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے بہت تیز بخار نے آ لیا تھا۔ ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ فجر کے وقت اسے نیند آ ہی گئی۔

صبح انہیں وقت کے مطابق جگا دیا جاتا تھا۔ بمشکل وہ دو ڈیڑھ گھنٹہ ہی سونے پایا تھا۔ جب اسے گراؤنڈ میں ورزش کے لیے لے جانے آ گئے لیکن فیضان نے معذرت کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک مستعد ڈاکٹر اس کے کمرے میں موجود تھا۔ جس نے بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کیا چند دوائیاں دے کر اور انجکشن لگا کر ڈاکٹر چلا گیا۔

فیضان جانتا تھا کہ اب ڈاکٹر کی اگلی رپورٹ تک یونیورسٹی جانے سے اس کی جان چھٹی رہے گی۔

☆☆

دوپہر کی چھٹی کے بعد یاسمین سیدھی اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

وہ شکل ہی سے خاصی پشیمان دکھائی دے رہی تھی۔ پہلے تو اس نے کل نہ آنے پر معذرت کی پھر بے اختیار فیضان کا ہاتھ تھام کر اس کی نبض دیکھنے لگی۔ فیضان نے ہلکے سے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا خلاف توقع ردعمل یاسمین کے لیے بڑا پریشان کن تھا۔

وہ قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا بات ہے فیضان خیریت تو ہے......؟" اس کی آنکھیں سارے چہرے پر پھیل گئی تھیں۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔"...... فیضان اور کیا کہتا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ پھٹ پڑے اور اپنے اندر کا سارا غبار نکال دے لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ فیضان کے لیے ناممکن تھا کہ دل میں چھپی بات زبان پر نہ لائے، لیکن آج پہلی مرتبہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی میں کبھی کبھی انسان کو منافقت بھی اپنانا پڑتی ہے۔ اس نے یاسمین سے کوئی گلہ نہیں کیا نہ ہی اسے اس بات کی خبر ہونے دی کہ وہ کل رات اس کے کمرے میں جھانک کر اس کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔

یاسمین کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ فیضان آج کچھ کھنچا کھنچا نظر آ رہا ہے اس نے لاکھ کرید نے کی کوشش کی کہ فیضان کے دل کی بات جان لے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ فیضان اتنا گہرا نکلے گا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

دوپہر کا کھانا اس نے فیضان کے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔ فیضان نے اس کے بضد ہونے پر دو چار لقمے زہر مار کر لئے۔ اس کے رویے نے یاسمین کو اتنا دل برداشتہ کر دیا تھا کہ اس کی بھوک ہی اڑ گئی۔

سہ پہر کے بعد وہ فیضان کے کہنے پر اٹھ کر آ گئی...... فیضان کو اس کے وجود سے اب کراہت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے آرام کرنے کا بہانہ کر کے اسے بڑی خوبصورتی سے ٹرخا دیا۔

رات گئے تک باری باری اس کے ہم وطن اس کی عیادت کو آتے رہے۔ یہ بات کوئی بھی نہ جان سکا کہ یہ غیور افغان زادہ غیرت کی جس آگ میں پھنک رہا ہے اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

وہ لوگ معمول کے مطابق اس کی تیمارداری کرتے رہے یاسمین بھی رات گئے تک اس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ فیضان کے رویے نے اسے خاصا الجھا دیا تھا۔ وہ بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال اسے ستانے لگا تھا کہ آخر فیضان اس سے کھل کر بات کیوں نہیں کرتا۔ ضرور اس کے دل میں کوئی ایسی بات تھی جسے وہ زبان پر لانے میں پس و پیش کر رہا تھا۔

دو روز تک وہ خاصا نارمل ہو گیا۔ اس دوران یاسمین سائے کی طرح اس سے چمٹی رہی۔ اس نے فیضان کی ہر طرح دلجوئی کرنی چاہی لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب وہ پہلے والا فیضان نہیں رہا۔

تیسرے دن جب وہ یونیورسٹی گیا تو اس نے اپنے ایک پروفیسر کو خاص طور سے خود میں دلچسپی لیتے محسوس کیا۔ پیریڈ سے فراغت کے بعد وہ فیضان کو اپنے ساتھ یونیورسٹی کی ایک گراؤنڈ میں لے آیا۔ وہ یوں ظاہر کرتا تھا جیسے اس سے بڑا فیضان کا کوئی ہمدرد روئے زمین پر موجود نہیں۔

فیضان اب بچہ نہیں رہا تھا۔ اس نے یہاں رہ کر اپنے ذہن کی آنکھیں کبھی بند نہیں ہونے دی تھیں۔ خصوصاً یاسمین کی یہ حالت دیکھنے کے بعد سے تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی قوم کسی گہری سازش کا شکار ہونے والی ہے۔

پروفیسر پہلے تو فیضان کی تیمارداری کرتا رہا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے یہ اندازہ لگانا چاہا کہ فیضان کی نفسیاتی حالت کیا ہے۔ فیضان نے اپنی کسی حرکت یا لہجے سے اسے کوئی شک نہ ہونے دیا پروفیسر نے اسے سمجھایا کہ سچا کامریڈ وہی ہے جو کسی جسمانی یا معاشرتی مشکل کو خاطر میں نہ لائے اور جو عظیم انقلاب کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دے۔

دوپہر کے بعد جب وہ چھٹی کر کے واپس آیا تو کھانا کھانے کے بعد میس سے اپنے کمرے کی طرف نہ گیا۔ اسے علم تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد یاسمین اسے ملنے آجائے گی اور شام تک اس سے چمٹی رہے گی۔

فیضان نے اپنے کمرے کے بجائے ہوسٹل میں لگے ٹیلیفون بوتھ کا رخ کیا اور اگلے ہی لمحے ویلنٹینا کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

☆☆

اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب دوسری طرف ویلنٹینا ہی نے فون اٹھایا۔ فیضان کی آواز سن کر اس نے خاصی گرمجوشی کا اظہار کیا تھا۔ فیضان نے اس سے صرف یہی پوچھا تھا کہ وہ آج فارغ ہے یا نہیں۔ جواب میں ویلنٹینا نے اسے یونیورسٹی کے باہر والی سڑک پر اسی جگہ ملنے کو کہا جہاں اس نے چند روز پہلے فیضان کو ڈراپ کیا تھا۔

ویلنٹینا کی اس فراخدلی نے اسے خاصا متاثر کیا۔ اس نے چاہا کہ ویلنٹینا کا شکریہ ادا کرے لیکن دوسری طرف سے ویلنٹینا نے ''او۔کے'' کہہ کر فون بند کر دیا۔

فیضان او غلو اپنی دھڑکنیں سنبھالتا جب سڑک کے اس موڑ پر پہنچا تو اس نے دور سے آتی ویلنٹینا کی کار کو دیکھ لیا تھا۔ اس کی چھوٹی سی سرخ رنگ کی کار فیضان کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔

فیضان نے خود کو سنبھالا اور کوشش کی کہ وہ نارمل ہی نظر آئے۔ سڑک پر اکا دکا کاریں ہی آتی جاتی تھیں۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح یہاں بے تحاشا کاریں نہیں تھیں ویلنٹینا کے پاس بھی ذاتی کار نہیں تھی۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں فیضان کو بتا دیا تھا کہ یہ کار اسے ایئر لائن کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔

ویلنٹینا نے اس کے نزدیک پہنچ کر گاڑی کھڑی کر دی۔ اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا اور قدرے آگے کی طرف جھک کر فیضان سے ہاتھ ملایا۔ اس طرح اچانک آگے جھکنے سے اس کے جسمانی خطوط جس خوبصورتی اور بے باکی سے اچانک نمایاں ہوئے تھے۔ اس حادثے نے فیضان کو ہلا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔ اپنی سیٹ سنبھالنے اور دروازہ بند کرنے کے بعد کافی دیر تک وہ اس ''خوبصورت حادثے'' کے اثرات محسوس کرتا رہا۔

''کیسے ہو؟'' ویلنٹینا نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کی جہاندیدہ نظروں نے فیضان کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی پہلی ہی ضرب کاری لگی ہے۔

بہت اچھا......'' فیضان نے مختصر سا جواب دے کر ایک مرتبہ پھر اپنے خشک حلق کو تر کرنے کے لئے تھوک نگلا۔

''شکریہ تم نے مجھے یاد رکھا۔''

ویلنٹینا نے اس مرتبہ خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

فیضان اس کے ہاتھ کے لمس سے لرز کر رہ گیا......!

وہ اس سے پہلے ویلنٹینا سے مل چکا تھا، لیکن آج وہ اسے ضرورت سے زیادہ ہی حسین نظر آ رہی تھی۔ گو کہ اس نے بیہودہ لباس نہیں پہنا ہوا تھا لیکن فیضان کئی دفعہ کن اکھیوں سے اس کے جسمانی خدوخال کا چوری چھپے جائزہ لے چکا تھا۔

ہر دفعہ اس کی طرف دیکھتے ہی اسے اپنے خون کی حدت خاصی بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی......

وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی نظروں کی چوری شاید ویلنٹینا نے نہیں پکڑی، لیکن ''بھولا پنچھی'' یہ نہ جان سکا کہ اس کا واسطہ کے جی بی کی ایک تربیت یافتہ ایجنٹ سے ہے جب ویلنٹینا نے کار چلاتے چلاتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو فیضان نے محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھ سے برقی لہریں خارج ہو کر فیضان کے جسم میں داخل ہو رہی ہوں۔

ویلنٹینا کی قربت کا لمس ہی اس کے لیے جان لیوا ہوتا جا رہا تھا......؟

سڑک پر سامنے سے آتا ایک ٹرک دیکھ کر ویلنٹینا نے سٹیرنگ دونوں ہاتھوں سے دوبارہ قابو کر لیا تو فیضان نے قدرے سکون سا محسوس کیا۔

''کیا خیال ہے آج میرے گھر چل کر نہ بیٹھا جائے۔''

ویلنٹینا نے اس کی طرف گھائل کر دینے والے انداز میں دیکھا۔

''ہاں! ہاں ٹھیک ہے''......

فیضان کو اس کے اس فیصلے سے بڑی روحانی مسرت حاصل ہوئی تھی۔

ویلنٹینا نے گھر کے دروازے پر کار روک کر اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اس لمحے ویلنٹینا کی آنکھیں پٹھان زادے پر فسوں پھونک گئیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ آنکھوں کے اس سحر میں یونہی ڈوبتا چلا جائے۔

''آؤ......اس نے کار کا انجن بند کرتے ہوئے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ فیضان سحر زدہ سا اٹھ کر اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ گھر میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہ تھا۔ ویلنٹینا نے اس کے لیے چائے بنائی۔ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس مرتبہ بھی ویلنٹینا نے اس سے ''انقلاب کے بجائے'' انسانوں کی باتیں کی تھیں۔ وہ فیضان کی آتش شوق کو مسلسل بھڑکاتی چلی جا رہی تھی۔

اور فیضان ایک مرتبہ پھر انہی جذبات کا اسیر ہونے لگا تھا جن سے اس کا پالا اس سے پہلے یاسمین سے پہلی ملاقات کے دوران پڑ چکا تھا۔ ایسے ہی جذبات اس نے کبھی یاسمین کے متعلق بھی محسوس کیے تھے اور کھل کر اس کے سامنے اعتراف محبت بھی کیا تھا لیکن اس مرتبہ وہ محتاط رہنا چاہتا

تھا۔ اسے علم تھا کہ روسی لڑکی کسی غیر ملکی سے شادی نہیں کر سکتی لیکن اس کے اندر ایک عجیب سی خواہش نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ ویلنٹینا کو جلال آباد لے جائے......! واقعی وہ ایسی ہی عورت تھی......!

ویلنٹینا نے آج بھی اس سے اس کے گھربار، خاندان اور شہر کی باتیں کی تھیں پھر اچانک اس کی ایک بات نے فیضان کو زبردست ذہنی جھٹکا لگایا۔

☆☆

''فیضان''! وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے پر فیضان کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے فیضان کو ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ ویلنٹینا کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ فیضان تڑپ کر رہی تو رہ گیا۔

''مجھے اپنے ساتھ لے چلو فیضان! ہم یہاں سے دور تمہارے گاؤں میں چلے جائیں گے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ میں بھی انہی پہاڑیوں کے دامن میں بکریاں چراؤں جہاں تمہارا بچپن گزرا ہے۔ تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاؤں......تمہارے......'' جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

آنسوؤں کے دو قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر موتیوں کی طرح دمکنے لگے تھے۔

اس کی آواز تھرا گئی۔ پہلے تو اس نے قمیض کی آستین سے اپنے آنسو پونچھے پھر اچانک اٹھ کر ''معاف کرنا'' کہتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ فیضان کٹ کر رہ گیا۔

وہ مرد تھا اور اس طرح آنسو بہانا اپنی بزدلی سمجھتا تھا۔ ورنہ شاید وہ بھی رو پڑتا۔ فیضان نے وہیں بیٹھے بیٹھے خود سے عہد کیا کہ وہ ضرور ویلنٹینا کو اپنے ساتھ لے جائے گا......بہر صورت......!!

دوسری طرف ویلنٹینا اپنے باتھ روم میں لگے شیشے کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی کہ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اداکاری کرتے ہوئے ''حقیقت'' کا گمان کیوں گزرنے لگا تھا۔ ''کہیں وہ'' واقعی عورت ''تو نہیں بننے لگی۔'' اس نے سوچا۔

اور یہ سوچ ہی بڑی جان لیوا تھی۔

فیضان اس روز بڑے بوجھل دل سے لوٹا تھا وہ ویلنٹینا کے ساتھ کار میں بیٹھا اسی سوچ میں گم رہا کہ آخر اتنا کمزور کیوں ہو گیا کہ اب یہ روسی لڑکی بھی اس کے حواس پر چھانے لگی ہے۔ اس کے ساتھ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھی ویلنٹینا یہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ اچانک ایک فاحشہ اور ''کھلونا عورت'' سے اتنی ''معصوم بچی'' کیسے بن گئی ہے۔

اس نوجوان میں ضرور کوئی ایسی بات ہو گی۔ پراسرار قوت۔ اس نے سوچا جبھی تو کے جی بی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ یہ بات ویلنٹینا سے زیادہ اچھی طرح کون جانتا تھا کہ ایک مرتبہ کے جی بی جس کے پیچھے پڑ جائے اس کا بچنا پھر ناممکن ہو جاتا ہے۔

فیضان کی آنکھیں بچوں کی طرح متجسس اور چمکیلی تھیں اور ویلنٹینا نے محسوس کیا تھا کہ یہ آنکھیں اس کے دل میں اندر ہی اندر اترتی چلی

جاتی ہیں۔ فیضان کے نزدیک بیٹھ کر اسے ہمیشہ اپنا بچپن یاد آ جاتا تھا۔

☆☆

اس کی ماں کسی سکول میں پڑھاتی تھی۔ باپ ایک ریسٹورنٹ میں منیجر تھا۔ کتنی اچھی زندگی بسر ہو رہی تھی ان کی بس ایک روز جب اس کا باپ گھر آیا تو غصے میں نجانے وہ کیا کیا کہہ گیا۔ اس روز رات گئے تک دونوں میاں بیوی آپس میں بحث کرتے رہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز جب ویلنٹینا کالج میں واپس گھر آئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے والد کو پولیس لے گئی ہے اس کی ماں کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھی۔ اور اس میں اچھی طرح بات کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

پھر ایک روز کچھ لوگ رات کو ان کے گھر آئے پہلے وہ اس کی ماں سے علیحدگی میں باتیں کرتے رہے پھر اس کی ماں نے ہی اسے کہا تھا کہ اگر اسے اپنے باپ کی زندگی منظور ہے تو ان لوگوں کے ساتھ چلی جائے اور ان کی باتوں پر عمل کرتی رہے۔

ویلنٹینا کو انہیں لوگوں نے ''ائیروفلوٹ'' میں بھرتی کروایا تھا۔ بطور ائیر ہوسٹس اس کی ٹریننگ کے جی بی کے ایک تربیتی مرکز میں ہوئی تھی جہاں اسے اس کے نئے پیشے کے اسرار و رموز سے آگاہی بہم پہنچانے کے بعد اسے ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا تھا۔

پہلے پہلے تو ویلنٹینا کو خاصی الجھن محسوس ہوتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی چلی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سب کچھ اب اس کی معمول کی زندگی کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ اس دوران تین یا چار مرتبہ اس کی ملاقات اس کی ''خصوصی خدمات'' کے اعتراف میں اس کے باپ سے بھی کروائی گئی تھی۔

جب پہلی مرتبہ اس کے باپ کو ماسکو ویلنٹینا سے ملاقات کے لیے لایا گیا تو ویلنٹینا اسے پہچان ہی نہ سکی۔ اس کا صحت مند باپ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ کے جی بی کے افسران کی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں ہی میں اس نے ویلنٹینا کے ساتھ کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے حال سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

اس نے اپنی بیٹی کو بتایا تھا کہ بورژوائیوں کے ریڈیو پروگرام سننے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اور وہ عظیم انقلاب کے خلاف باتیں کرنے لگا تھا۔ اب اس کا ذہن دوبارہ راہ راست پر آ رہا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی یہی تلقین کی تھی کہ وہ عظیم انقلاب کے لیے اپنا تن من دھن قربان کر دے اور اس کی بالکل پروا نہ کیا کرے۔

وہ سائبیریا میں بہت خوش ہے۔

لیکن...... ویلنٹینا سمجھتی تھی کہ اس کا بدقسمت باپ اس بری طرح ان لوگوں کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے کہ وہ خود پر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج بھی نہیں کر سکتا۔ اسے ہر دم یہی خوف لگا رہتا تھا کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات اس کی بیٹی اور بیوی کے لیے باعث عذاب نہ بن جائے۔ اپنی بیٹی سے ملتے اور پھر جدا ہوتے ہوئے اس کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔

لیکن دم رخصت بھی وہ جبر کر کے اپنی بیٹی کے سامنے مسکراتا رہا۔ اور پھر ایک بند وین میں بیٹھ کر دوبارہ ''عظیم انقلاب'' کی تکمیل کے لیے

سائبیریا کے برف زاروں کی طرف چلا جاتا......!

اس روز بمشکل ویلنٹینا کے گھر سے یہاں یونیورسٹی آنے تک ان کے درمیان دو تین باتوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ دونوں خود ایک دوسرے کا چور محسوس کر رہے تھے۔

ویلنٹینا سے الگ ہوتے ہوئے اس نے اس کی آنکھوں میں سوگواری اور یاسیت کی جو پرچھائیاں لرزتی محسوس کی تھیں انہوں نے فیضان کو تڑپا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔!

☆☆

واپسی پر وہ نہ دیکھ سکا کہ یاسمین سڑک کنارے لگے درختوں کی قطار میں چھپی اسے کار سے اترتے دیکھ چکی تھی اور اس کا تعاقب کرتی ہوئی ہی فیضان کے کمرے تک آئی تھی۔ فیضان ماسکو میں آ کر خاصا محتاط ہو چکا تھا۔ اتنا محتاط کہ اپنے سائے سے بھی چوکنا رہتا تھا، لیکن اس روز فیضان کی جذباتی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اسے اپنے اردگرد کا بھی ہوش نہیں تھا۔

یاسمین اس کے کمرے میں داخلے کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی وہاں آ دھمکی۔

''کہاں گئے تھے تم؟ میں اب تک تین دفعہ آ چکی ہوں تمہیں ملنے کے لیے۔'' اس کے لہجے میں جھلکتی حاکمیت نے پٹھان بچے کو تیخ کر دیا۔

''دیکھو یاسمین! تمہیں ایسے سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں مجھ سے میں کسی کے حکم کا پابند نہیں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ کوئی میرے ذاتی معاملات میں خواہ مخواہ مداخلت کرے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' یاسمین کو اس کے جواب نے بوکھلا ہی تو دیا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مخاطب وہی فیضان ہے جو کبھی یاسمین کے ایک اشارے پر جان دینے کو بھی تیار رہتا تھا۔ جس نے اس کی محبت کے عوض اپنے اصول اور روایات کا بھی سودا کر لیا تھا۔

''اب میں کوئی ایسی زبان بھی نہیں بول رہا۔ فارسی میں بات کر رہا ہوں جو تمہاری مادری زبان ہے۔''

فیضان کے لہجے میں ابھی تک رعد کڑک رہی تھی۔

''تو اس کے مطلب یہ ہے کہ اس فاحشہ نے تمہارا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔''

یاسمین غم اور غصے کی تاب نہ لا سکی اور پھٹ پڑی۔

اس کی اس بات پر فیضان چونکا اور اسے سمجھ آ گئی کہ ویلنٹینا اور اس کی ملاقاتیں یاسمین سے پوشیدہ نہیں رہیں۔

''دیکھو یاسمین!'' اس نے خود پر بڑے ضبط سے قابو پا لیا تھا: ''تمہیں اب اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ میں کہاں جاتا ہوں کس سے ملتا ہوں؟ کیونکہ تمہارے متعلق اگر میرے دل میں کوئی عزت تھی تو وہ جذبات اسی روز مر گئے تھے جب میں نے تمہیں اپنے انقلابی نظریات سمیت اپنے انقلابی دوستوں کے ساتھ بیہودہ حالت میں دیکھا تھا، لیکن میں نے تمہاری طرح اس بات کا طعنہ کبھی نہیں دیا!!

یاسمین دیوانگی کے سے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اس سے پہلے کہ

فیضان مزید کچھ کہے وہ روتی ہوئی اس کے کمرے سے تیزی سے باہر نکل گئی۔

فیضان کو افسوس تو ضرور ہوا کہ اس نے یاسمین کو یہ بات کیوں جتا دی، لیکن وہ اپنے ضمیر پر اب کوئی بوجھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ یہ تو بہر حال ایک روز ہونا ہی تھا لیکن اس طرح اور اچانک اس کے منہ سے یہ بات نکلے گی، اس کا تو فیضان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

یاسمین کو خود سے گھن آنے لگی تھی......!

اپنے پلنگ پر اوندھے منہ گر کر کافی دیر تک اکیلی روتی رہی۔ جب دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تو اس نے اپنے طرز عمل کا جائزہ لیا۔ جو بات آج فیضان نے اس سے کہی تھی وہ بات تو کوئی اور بھی اسے بہر حال کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ترقی پسندی اور انقلاب کے چکر میں ضرورت سے زیادہ ہی آگے نکل گئی تھی۔

 ☆☆

اس روز پہلی مرتبہ اس نے سوچا یہ کیسا انقلاب ہے جو اس سے اس کی نسوانیت چھیننے پر تلا ہوا ہے۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ خود سے نفرت ہوئی تھی اور اس نفرت کا احساس ہی اس کے لیے جان لیوا تھا۔ اب تک وہ اپنی پارٹی کے حکم پر فیضان کو انگلیوں پر نچاتی آئی تھی، لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ تو فیضان سے محبت کرنے لگی ہے۔ زندگی میں پہلی دفعہ اس نے اپنے اندر یہ تبدیلی محسوس کی تھی ورنہ تو آج تک اس نے زندگی میں کسی معاملے کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔

بس یہ انقلابی نظریات ایسے ہی تھے جنھوں نے اسے متاثر کیا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ افغانستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہاں سوشلسٹ انقلاب برپا ہو......!

وہ خود ایک بڑے خاندان کی بیٹی تھی اور جانتی تھی کہ اس کے ملک میں خواتین اور ملک اپنے ملازموں کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔ اپنے عوام کی غربت پر اس کا دل کڑھتا تھا اور ان سرخ جلدوں والی کتابوں کے مطالعے نے اسے یہی بتایا تھا کہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ انقلاب برپا کیے بغیر بھی مزدوروں اور کسانوں کی قسمت نہ بدل سکے گی۔

اپنے کمزور اور سرداری نظام کے شکنجے میں جکڑے غریب اور جاہل عوام کی قسمت بدلنے کے لیے وہ اس میدان میں نکلی تھی لیکن آج اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ انقلاب کے راستے پر ضرورت سے زیادہ ہی آگے نکل آئی ہے۔ آج اس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ اس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ واپس مڑ جائے وہ پہلے ایک غیور مسلمان افغان زادی تھی اور اس کے بعد کچھ اور......

پھر ایک عزم کر کے وہ اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔

اس روز نہانے سے فراغت کے بعد یاسمین نے محسوس کیا جیسے اس کے بدن پر لدا منوں بوجھ اتر گیا تھا۔

وہ خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ فیضان کے چھن جانے کا پچھتاوا اسے ضرور رلا رہا تھا لیکن اس بات کی خوشی بھی بہر حال تھی کہ وہ راہ راست پر آ گئی ہے۔

اس رات یاسمین نے پارٹی کی میٹنگ میں حاضری سے معذرت کر لی۔ اسے ڈنر کے بعد ایک ''خصوصی لیکچر'' سننے کی دعوت دی گئی تھی، لیکن یاسمین طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے لیٹی رہی۔ جب ایک کامریڈ جس نے اس کے ساتھ لیکچر میں شامل ہونا تھا اس کے کمرے میں معمول کی بے تکلفی سے داخل ہوا تو یاسمین نے اسے ڈانٹنے کے سے انداز میں لیکن مہذب لہجہ اپناتے ہوئے کسی خاتون کے کمرے میں داخل ہونے کے آداب سمجھا دیے۔

کامریڈ نے بظاہر ہنس کر اس کی بات ٹال دی لیکن اندر سے وہ خاصا الجھ گیا تھا۔ یاسمین کی طرف سے اچانک طبیعت کی ناسازی کی اطلاع اور خصوصی لیکچر میں شامل نہ ہونے کے فیصلے نے اس کے ذہن میں کچھ شکوک و شبہات کو جنم دے دیا۔

اور...... اس نے اپنے ''انقلابی'' ہونے کے فرائض کا احساس کرتے ہوئے۔ اپنے محسوسات اور یاسمین سے ملاقات کا حال خصوصی لیکچر کے انچارج پروفیسر صاحب تک پہنچا دیا......!

پروفیسر نے بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور بغیر کوئی تبصرہ کیے آگے بڑھ گیا۔

صبح جب یاسمین کالج گئی تو کلاس کے خاتمے پر وہی پروفیسر اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ یونہی گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے رکھے بنچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ پروفیسر بڑی بے تکلفی سے اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ یاسمین کا رویہ آج کچھ بدلا ہوا ہے اور اس نے پروفیسر کی اس بے تکلفی کا برا منایا ہے۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

وہ یاسمین سے یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ جان بوجھ کر اس نے یاسمین سے متعلقہ موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ دوران گفتگو وہ اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ ''شکار'' بھی ہاتھ سے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ یاسمین نے اسے بیماری ہی کا بہانہ کیا تھا...... اور پروفیسر نے اس کے سامنے بظاہر اس کا یہ بہانہ قبول کر لیا تھا۔

اس نے یاسمین کو آرام کا مشورہ دیا اور اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

شام تک اس نے یاسمین کی ''کیس رپورٹ'' اپنے انچارج ماسٹر تک پہنچا دی تھی اور رات گئے تک وہ لوگ یاسمین کی قسمت کے متعلق ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ وہ اس بہترین شکار کو کسی صورت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر یہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو انہیں نئے سرے سے بہت محنت کر کے اس کا کوئی متبادل ڈھونڈنا پڑتا۔

کے جی بی نے اسے بلیک میلنگ کے ذریعہ اپنا مطیع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ اپنی مقصد براری کے لیے بلیک میلنگ سٹف جمع کرنے لگے تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کے جی بی کیا کر گزرتی ہے؟ یہ تو کبھی یاسمین کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔

❀......❀......❀

ضمیر کی آواز

خلاف توقع جب رات کے دوسرے پہر ویلنٹینا کے فون کی گھنٹی بجی تو اسکا دل دھک سے رہ گیا! اسے آج نیند ہی نہیں آ رہی تھی اور اس نے نیند کی روٹھی ہوئی دیوی کو منانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن سوائے کروٹیں بدلتے رہنے کے اور کچھ اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

فون کی اچانک بجنے والی گھنٹی نے اس کے اعصاب میں بجلی دوڑا دی تھی۔ اسے زوردار ذہنی جھٹکا لگا اور وہ لرز کر رہ گئی۔ اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ یہ فون کے جی بی کی طرف سے آیا ہوگا لیکن آخر کیوں؟ اس نے دوسرے ہی لمحے سوچا: ''کہ کہیں اس کے اندر کل آنے والی فیضان کی موجودگی میں جو تبدیلی تھوڑی دیر کے لیے آ گئی تھی۔ اس کا علم تو ان لوگوں کو نہیں ہو گیا؟''

کچھ بھی ممکن تھا: اس نے ایسے سینکڑوں لوگوں کے متعلق دیکھا اور سنا جن کے دل میں ذرا سا شائبہ بھی پیدا ہو تو اس کی خبر ان لوگوں کو ہو جاتی ہے...... پھر ان کا جو انجام ہوا اس کے تصور سے ویلنٹینا کانپ کانپ گئی۔

''ہیلو کامریڈ''...... اپنی آواز میں ہونے والی کپکپاہٹ اسے اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''جاگ رہی ہو ابھی تک؟''

دوسری طرف سے آنے والی آواز کو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

وہ اپنی جگہ دہل کر رہ گئی۔ واقعی وہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور یہ بات خلاف معمول رہی تھی...... اور معمول کی یہ خلاف ورزی اس کا جرم بھی قرار دی جا سکتی تھی۔

''سر آج پیٹ خراب ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد سے درد ہو رہا ہے۔''

اس نے مقدور بھر کوشش کی کہ اپنی آواز پر قابو پا لے۔

''دوائی لے لی ہوتی''......

دوسری طرف سے قدرے ہمدردی کا اظہار ہوا۔ یہ لہجے کی سرد مہری ابھی تک قائم تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے لی تھی سر''

''ٹھیک ہے تم تیار ہو جاؤ۔ ابھی تھوڑی دیر میں کوئی آ کر لے جائے گا تمہیں۔''

دوسری طرف سے یہ حکم دے کر فون بند کر دیا گیا۔

ریسیور کریڈل پر رکھتے ہی ویلنٹینا اچھل کر بستر سے باہر آ گئی۔ اتنی سردی کے باوجود اسے پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنی حالت سنبھالنے

کے لیے ''واڈکا'' کا ایک جام تیار کیا اور ایک ہی سانس میں اسے اپنے حلق میں انڈیل لیا۔۔۔

شراب نے اسے بکھرے اوسان کو سمیٹنے میں قدرے مدد دی اور جب وہ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل رہی تھی تو نارمل ہو چکی تھی۔

اپنے کمرے میں رکھی ایک آرام کرسی پر بیٹھی وہ اب کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد دروازہ پر گھنٹی ہوئی اور ویلنٹینا اپنی جگہ سے یوں اٹھی جیسے طاقتور سپرنگوں نے اسے فضا میں اچھال دیا ہو۔

اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے دروازہ کے سامنے کھڑی ایک وین دیکھ لی تھی جس کے اندر روشنی ہو رہی تھی اور باہر کی تمام بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ اسی روشنی میں اگلی سیٹ پر ایک کرخت چہرے اور کھچے ہوئے اعصاب والا ڈرائیور بھی اسے نظر آ رہا تھا۔

ویلنٹینا کو لے کر وین اسی دفتر کے سامنے آن رکی تھی جہاں وہ اس سے پہلے متعدد بار پیش ہو چکی تھی۔

کمرے کا دروازہ حسب معمول بغیر آواز پیدا کیے کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں کیپٹن دروازے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں کھڑکی کے باہر برف باری پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ویلنٹینا کی طرف گھوم کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

''بہت دیر کر رہی ہو کامریڈ'' وہ اچانک ویلنٹینا کی طرف گھوما اور اس کی آنکھیں ویلنٹینا کو اپنے جسم پر دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''میں...... میں کوشش کر رہی ہوں سر''......

ویلنٹینا نے اپنے حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔

''ابھی صرف کوشش ہی کر رہی ہو......''

کیپٹن کے لہجے میں تمسخر کے علاوہ بھی ایک ایسی دھمکی پوشیدہ تھی کہ جس کے تصور ہی سے ویلنٹینا کی رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا۔ ''اب اس کیس کو ختم کرو۔ کل شام تک بہر حال......'' وہ شاید بہت کم الفاظ بولنے کا عادی تھا۔

''ٹھیک ہے سر''!...... ویلنٹینا نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ اس کی آنکھوں کے حصار سے بچ نکلے لیکن یہ اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

''تمہارے فلیٹ میں پہنچنے تک تمام بندوبست ہو چکا ہوگا...... سمجھتی ہو نا......'' کیپٹن یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے قدرے نزدیک بھی آ گیا تھا۔

''یس سر''...... ویلنٹینا سمجھتی تھی۔ یہ کھیل اس کے لیے ہرگز نیا نہیں تھا۔

''بس ایک ہی داؤ آزمانا ہے...... مہلت نہیں ملے گی...... اور ناکامی کی صورت میں......'' اس نے مسکراتے ہوئے ویلنٹینا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے حلقوم میں چھری چل گئی ہو۔

اگر چند منٹ اور اسے اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہتی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو اسے یہاں سے چھٹکارا مل جائے۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ''......

اس نے اپنا ہاتھ ویلنٹینا کے گلے کے قدرے نزدیک لا کر بڑے عجیب انداز میں اس کے سارے بدن کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔

ویلنٹینا نے بڑی ہمت کر کے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

باہر راہداری میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے اپنی سانسوں کا بکھرتا تانا بانا اکٹھا کیا اور بوجھل قدموں سے اس راہداری کے کونے تک پہنچ گئی۔ جہاں باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے آرام دہ صوفے اور گلدان بڑی نفاست سے سجائے گئے تھے۔ ایک صوفے پر ڈھیر ہو کر وہ ہانپنے لگی۔

اس کے لیے مزید چلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ جو کام اسے کیپٹن نے سونپا تھا۔ وہ اس کے لیے نہ تو نیا تھا نہ ہی مشکل۔ لیکن اس کا دل گواہی دے رہا تھا: ''کہ اس مرتبہ وہ ناکام ہو جائے گا اور ناکامی کا مطلب...... کیا تھا؟'' ''صرف موت'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

آج تک یہ ہوا ہی نہیں تھا کہ کے جی بی نے اپنے کسی ناکام ہو جانے والے ایجنٹ کو معاف کیا ہو! فیضان سے ملاقات اور بے تحاشا باتیں کرنے کے بعد اس کی جذباتی کیفیت اب خاصی بدلنے لگی تھی۔

اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا: جیسے اس کی چھنی ہوئی نسوانیت واپس آنے لگی ہو۔ فیضان کے نزدیک بیٹھ کر اسے کئی مرتبہ اپنے ''بھرپور عورت'' ہونے کا احساس ہوا تھا......!!

یہ احساس اس کے ہاں سے کبھی رخصت ہو چکا تھا کیونکہ اب اس نے اپنے جسم کو اپنا سمجھنا ہی چھوڑ دیا تھا!

......یوں تو دم پیدائش ہی روس میں جنم لینے والے ہر کامریڈ کا جسم اور روح ''عظیم انقلاب'' کے لیے وقف ہو جاتی ہے، لیکن ویلنٹینا نے اس ''حقیقت'' کو اس وقت سے قبول کیا جب اس کے باپ کو سائبیریا کی یاترا کے لیے بھیج دیا گیا تھا، تا کہ اس کا دماغ اچھی طرح ٹھیک ہو جائے۔

اسکا باپ بوڑھا آدمی تھا۔ زندگی سے اس نے کافی کچھ حاصل کر لیا تھا اور ویلنٹینا کو ابھی بڑی لمبی زندگی گزارنی تھی ...... پہاڑ ایسی زندگی۔

وہ اتنی بہادر نہیں تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے سکتی اور زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ''سٹیٹ'' کے لیے جئے اور مرے۔

☆☆

''کوئی خدمت مادام؟'' ...... اسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا جب اچانک ہی ایک کمرے سے ایک باوردی ویٹر نکل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

''ن۔ن۔نہیں...... کچھ نہیں۔ پانی لا دو ذرا'' ...... اس کے لیے اپنی گھبراہٹ چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔

''او۔کے مادام'' ...... باوردی اور مؤدب ویٹر نے قریباً جھکتے ہوئے کہا اور انہیں قدموں پر واپس گھوم گیا۔

جب ویٹر پانی کا گلاس ایک پلیٹ میں سجا کر لایا تو وہ حیران رہ گیا کہ مادام وہاں سے جا چکی تھی۔

وین وہیں موجود تھی جہاں اس نے ویلنٹینا کو ڈراپ کیا تھا......!

وہ کھچے ہوئے اعصاب اور کرخت چہرے والا ڈرائیور بھی اپنی سیٹ پر مستعد بیٹھا تھا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈرائیور نے وین کے

اندر کی لائٹ آن کر دی اور نیچے اتر آیا۔ ویلنٹینا کے لیے دروازہ اس نے خود ہی کھولا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیم بیہوشی کی سی حالت میں اپنی سیٹ پر بے دم ہو کر گری ہوئی تھی۔ وین کے اچانک بریک لگنے سے پیدا ہونے والے جھٹکے نے اسے بیدار کیا اور اس نے دیکھا کہ وین تو اس کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ ہمت کر کے اٹھی۔ ڈرائیو نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے باہر نکلنے پر ڈرائیور نے اسے تعظیم دی اور ویلنٹینا لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنے فلیٹ کی طرف چل دی۔ فلیٹ میں روشنی اس نے باہر ہی سے دیکھ لی تھی اور یہ بھی اسے علم تھا کہ اندر کون لوگ موجود ہیں اور وہ کیا کام کر رہے ہیں۔

اپنے کمرے کا دروازہ اس نے کھولا تو دو آدمیوں کو اپنا منتظر پایا۔ دونوں نے اس کی اچانک آمد پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ بالکل یوں جیسے وہ اس گھر کے فرد ہوں۔ دونوں نے کمرے کی ترتیب خاصی بدل دی تھی اور ویلنٹینا کی مشاق نظروں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں کیا کیا تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔

''مادام!''......ان میں سے ایک نے بڑے ادب سے ویلنٹینا کو مخاطب کیا۔ ''دیکھیے''......

وہ اسے کھڑکی کے ساتھ لگے سوئچ بورڈ پر لے آیا۔

''آج سے پہلے جس سوئچ بٹن سے آپ گھر کے دروازے والی لائیٹ جلایا کرتی تھیں اب اس سے نہیں جلائیں گی۔ جیسے ہی اپ وہ بٹن دبائیں گی کیمرے حرکت میں آ جائیں گے۔ اور ہاں مادام!''......اس نے ایک دوسرے سوئچ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم نے باہر والے بلب کا کنکشن ادھر کر دیا ہے۔ آئندہ آپ باہر کی روشنی جلانے کے لیے اس بٹن کا استعمال کریں۔ ہم آپ کے معمولات میں اس معمولی سی تبدیلی کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن یہ ناگزیر تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''......

ویلنٹینا شدت سے تخلیے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔

''شکریہ مادام''......

دونوں نے بندروں کی طرح دانت نکالے اور اپنے بیگ سنبھال کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ دونوں کے جی بی کے ماہر مکینک تھے اور اب اس کمرے میں ایسا بندوبست کر دیا گیا تھا کہ اگر ویلنٹینا اس پش بٹن کو دبا دیتی تو اس کمرے میں ہونے والی معمولی سی حرکت کو بھی کمرے میں چھپائے گئے کیمرے اپنے اندر موجود فیتے پر منتقل کر لیتے۔

اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ فیضان کے ساتھ ''غلط حرکات'' میں اپنی فلم بنوائے تاکہ بعد میں اس فلم کی آڑ میں اسے بلیک میل کیا جا سکے......!!

ان لوگوں کے لیے شاید یہی فیضان کو قابو کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔

لیکن ویلنٹینا جو اس سے پہلے درجنوں مرتبہ مختلف غیر ملکیوں کے ساتھ اپنے افسران بالا کے حکم پر یہی گھناؤنا کھیل رچا چکی تھی۔ اب واضح طور پر یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ فیضان کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

ساری رات وہ خود سے جنگ لڑتی رہی۔ بوڑھے باپ، معصوم بہن اور ماں کا چہرہ ہر بار سوالی بن بن کر اس کے سامنے آتے اور اسے بے بسی کے آنسو رلاتے رہے۔

بہر طور با دل نخواستہ ہی سہی اسے یہ سب کچھ کرنا تو تھا۔

صبح اس نے فیضان کو یونیورسٹی جانے سے پہلے اسے ہوسٹل میں ٹیلیفون کیا کہ وہ آج شام اس کے گھر چلا آئے۔

فیضان کو آج سے پہلے اس طرح کی دعوت ویلنٹینا کی طرف سے کبھی ملی نہیں تھی گو کہ وہ اب تک کئی دفعہ اس کے گھر جا چکا تھا لیکن آج ویلنٹینا نے جب اسے اچانک یہ دعوت دی اور مزید کوئی تفصیل بتائے بغیر فون بند کر دیا تو وہ کچھ گڑبڑا کر رہ گیا۔

''کہیں خدانخواستہ وہ کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئی؟''

اس نے سوچا اور پھر خود ہی اس سوچ کو ذہن سے جھٹک کر الگ کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔

یونیورسٹی جاتے ہوئے اس نے حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ اس کا آمنا سامنا یاسمین سے نہ ہو اور اسے اپنی کوشش میں کامیابی بھی نصیب ہوئی تھی۔

چھٹی کے بعد اس نے ایک مقامی تھیٹر کا رخ کیا! اسے سب سے زیادہ کوفت اگر کبھی ہوتی تھی تو تھیٹر میں آکر کیوں کہ سوائے سرخ پھریروں اور خونیں کلمات کے اور کچھ اسے سننے یا دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔

☆☆

فیضان نے محسوس کیا کہ آج ویلنٹینا وہ نظر نہیں آرہی تھی جس سے اس کا اب تک سابقہ رہا تھا۔ اس نے آج سے پہلے نہ تو کبھی ایسا بیہودہ لباس پہنا تھا نہ ہی کبھی خود کو نمایاں کرنے کے لیے ایسی اوچھی حرکت کی تھی۔ اپنے فلیٹ کے دروازے پر ویلنٹینا نے گو کہ فیضان کا استقبال مسکراتے ہوئے کیا، لیکن اس مسکراہٹ کے پیچھے کیا کیا طوفان پوشیدہ تھے، اس کا احساس فیضان کو نہ ہو سکا۔ وہ تو حیرت سے ویلنٹینا کو بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو فیضان؟''......

ویلنٹینا نے اس کے سامنے ایک کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہیں دیکھ رہا ہوں! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم تو......''

''ہاں فیضان میں ایسی نہیں تھی......''

ویلنٹینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہی کہنا چاہتے ہو نا تم''......اس کی آواز ابھر آگئی۔

فیضان واضح طور پر یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کا گلا رندھ گیا ہے لیکن اس نے بڑی ہمت سے اپنے آپ پر قابو پایا۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آخر تمہارے اونچے آدرشوں اور عظیم انقلاب کا خواب ان لغویات کے بغیر مکمل کیوں نہیں ہوتا۔ یہ کیسا انقلاب ہے؟ تم لوگ آخر دنیا کو کیا دینا چاہتے ہو کیا ایسی مصیبت آگئی ہے تم لوگوں پر کہ ایک عظیم مقصد کے لیے ایسے گھٹیا اور خلاف انسانیت راستے اختیار کرنے لگے ہو تم؟''

فیضان لاکھ ضبط کے باوجود بھی پھٹ پڑا۔

ویلنٹینا اور تو کچھ نہ کر سکی بے بسی سے رو دی۔

اسے روتے دیکھ کر فیضان خاموش ہو گیا، نجانے اسے کیوں ایک پچھتاوہ سا لگا تھا۔ اس طرح کی گفتگو پر۔ اس نے سوچا کہ اسے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ لیکن اس لمحے واقعی فیضان کو خود پر قابو نہیں رہا تھا۔

اس نے ویلنٹینا کی گفتگو میں کبھی ایسی ''انقلابیت'' محسوس نہیں کی تھی نہ ہی اس نے کبھی یاسمین کی طرح اس کے سامنے فلسفیانہ موشگافیاں بکھیری تھیں۔ وہ تو ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ پھر اچانک یہ تبدیلی......!

فیضان آخر مرد تھا اور محسوس کر سکتا تھا کہ اس طرح جب کوئی عورت کسی مرد کو اپنی خلوت گاہ میں طلب کرے تو وہ اس سے کیا امید رکھتی ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اسے چپ کس طرح کرائے۔ بس وہ اس کے نزدیک کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید عورت کو تسلی دینے کا اس سے بہتر طریقہ اس کے نزدیک اور کوئی نہیں تھا۔

''تم جو جی چاہے کہہ ڈالو فیضان!''......

ویلنٹینا نے حیرت انگیز ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالآخر خود پر قابو پا لیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہارے ساتھ گو کہ میرا ٹکراؤ قدرتی نہیں بلکہ ایک طے شدہ منصوبے کا حصہ تھا پھر بھی تمہارے ساتھ مل کر تم سے باتیں کر کے میں اپنے ''مقصد'' سے دور ہٹتی چلی جا رہی تھی اب میں شاید کبھی پہلے والی ویلنٹینا نہ بن سکوں گی۔ اور یہی میرا ایک کربناک موت کی طرف پہلا قدم ہوگا......''

''تم کیا کہہ رہی ہو...... ویلنٹینا''

فیضان کو ایک دھچکا لگا۔

''ہاں فیضان!'' ویلنٹینا نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آج تمہیں سب کچھ بتا دوں۔ میں نہیں چاہتی کہ زندگی کے کسی مرحلے پر تمہیں یہ احساس ہو کہ میں بھی عام قسم کی لڑکی تھی...... فیضان! کاش تمہیں بتا سکتی کہ میں کس بری طرح اس چنگل میں پھنس چکی ہوں۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا کہہ رہی ہو تم''

فیضان نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں فیضان! واقعی تمہارے لیے یہ سب کچھ عجیب ہوگا۔ کیونکہ تم......''

وہ اچانک خاموش ہو گئی اور پھر دبے پاؤں چلتی کھڑکی تک پہنچی۔

کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا اور مطمئن ہو کر لوٹ آئی۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟"......

فیضان قدرے گھبرا گیا۔

"کچھ نہیں ...... مجھے کچھ شک تھا۔" ویلنٹینا نے کہا۔ "اچھا میں ذرا چائے تو بنالوں تمہارے لیے۔" ...... کہہ کر وہ فیضان کے "نا۔نا" کرنے کے باوجود رسوئی میں چلی گئی۔

پانچ منٹ بعد رسوئی سے برآمد ہوئی تو پہلے والی ویلنٹینا بن چکی تھی۔ یہ پانچ چھ منٹ اس کی زندگی کے سب سے زیادہ اذیت ناک لمحے تھے۔ اس دوران وہ اپنے آپ سے ایک طویل جنگ لڑنے کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو چکی تھی۔

فیضان البتہ ابھی تک انہیں الجھنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ویلنٹینا کے متعلق کیا رائے قائم کرے؟

☆☆

"فیضان! میری ایک بات مانو گے؟"

ویلنٹینا نے چائے کی پیالی اس کے نزدیک سرکاتے ہوئے اسے خیالات کے طلسم سے باہر نکالا۔

"وہ کیا؟"

"تم فوراً واپس چلے جاؤ۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ...... یہ میرے لیے کیسے ممکن ہوگا؟" فیضان گڑبڑا گیا۔

اور "مطلب" سمجھانے کے لیے ویلنٹینا نے اسے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ آج اسے کس مقصد کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یاسمین کو بھی ان لوگوں نے ......"

وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"ہاں فیضان! اسے بھی اسی مقصد کے لیے تمہارے ساتھ نتھی کیا گیا تھا، لیکن ان لوگوں کو شک تھا کہ کسی بھی مرحلے پر شاید وہ پھسل سکتی ہے اس لیے میری خصوصی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔"

"اب وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

فیضان کے اس سوال نے گو کہ ویلنٹینا کے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی تھی، لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات نہ بدلنے دیئے۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گی۔ زیادہ سے زیادہ میرا تبادلہ یہاں سے کسی اور جگہ کر دیا جائے گا لیکن تمہارے لیے کچھ بھی ممکن ہے۔"

"لیکن میں...... ویلنٹینا میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر جانا بزدلی سمجھتا ہوں۔ یہ کسی پٹھان کے شایان شان نہیں......"

"جذباتی باتیں مت کرو فیضان...... ہمارے پاس یوں بھی وقت کم ہے تم ابھی بچے ہو! تجربے کے لحاظ سے...... تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تمہارے ملک پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ واپس چلے جاؤ فیضان اور ان لوگوں کو آنے والے عذاب سے بچانے کی کوشش کرو جس کا شکار وہ بہت جلد بننے والے ہیں۔"

ویلنٹینا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

قریباً ایک گھنٹہ انہوں نے جی بھر کے آپس میں باتیں کی تھیں۔ اس دوران ویلنٹینا نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا: "کہ وہ بہت جلد کابل میں اس سے ملے گی اور اس کے ساتھ ہی فرار ہو جائے گی۔

انہوں نے آپ میں بڑے منصوبے بھی باندھ لیے تھے...... فیضان کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن وہ کبھی نہ سمجھ سکا کہ ویلنٹینا نے تو اسے صرف مطمئن کرنے کیلئے یہ جھوٹ گھڑا تھا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔

اگر اس بات کی ذرا سی بھنک بھی فیضان کے کانوں میں پڑ جاتی تو اس کا ذہن دھماکے سے پھٹ جاتا۔

"اچھا اب تم چلو...... لیکن میری بات پر ضرور عمل کرنا" ویلنٹینا کی آواز لاکھ ضبط کے باوجود بدل رہی تھی۔ دروازے تک وہ اسے خود چھوڑنے آئی...... "آج میں تمہیں ہوسٹل تک چھوڑنے نہیں جا سکوں گی۔ مجھے معاف کر دینا...... خدا حافظ۔"

دروازے میں رک کر اس نے ویلنٹینا کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں کسی بھی لمحے چھلک پڑنے کو تیار تھیں۔

"خدا حافظ ویلنٹینا...... میں تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گا۔ تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

اس کی بات مکمل ہوتے ہی ویلنٹینا نے دروازہ بند کر دیا۔

...... اب اس میں ضبط کا یارا نہیں رہا تھا۔ وہ بے سدھ سی ہو کر صوفے پر گر پڑی اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

☆☆

فون کی گھنٹی بجنے تک وہ بالکل نارمل ہو چکی تھی۔

اس کے دونوں ہونٹ بھنچ گئے تھے اور ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہونے لگی تھیں نفرت کا ایک الاؤ سا اس کے اندر دہکنے لگا تھا اور وہ بزدل سی ویلنٹینا جو اپنے بوڑھے باپ کو سائبیریا کے برف زاروں سے نجات دلانے کے لیے "کے جی بی" کے ہاتھوں میں موم کی گڑیا بنی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے مضبوط ارادے سے فون اٹھایا۔

"لیس"...... کسی نے پوچھا اور اسے متعلقہ نمبر دے دیا۔

"کیا رہا؟"......

دوسری طرف کی آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہی وہ شخص تھا جو اس کی بربادی کا باعث بنا تھا۔ اسی نے اسے سب سے پہلے بلیک میل

کر کے ''کے جی بی'' کی جھولی میں ڈالا تھا۔

''بہت اچھا...... سب ٹھیک ہو گیا''......

وہ پھٹ پڑنے کو تھی، لیکن اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔

''ویل ڈن...... تم نے سٹیٹ کے لیے، عظیم انقلاب کے لیے بہت عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں تمہاری سفارش ہائی کمان سے کروں گا۔ بہت جلد تمہارا باپ تمہیں واپس مل جائے گا۔'' دوسری طرف سے خوشی کا اظہار کیا گیا۔

''سر!''......

ویلنٹینا کو خود پر قابو پانے کے لئے بڑی زبردست جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

''لیں۔''

''میری خواہش ہے کہ یہ فلم 'کونسل' میں خود پیش کروں۔ میں چاہتی ہوں اپنی خدمات کے عوض ان لوگوں سے اپنے باپ کی رہائی کی اپیل کر سکوں۔''

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں...... تم صبح آٹھ بجے بلاک ایف میں آ جاؤ۔ فلم لے کر۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

''اوہ۔ شکریہ کامریڈ!''

سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ویلنٹینا نے خالی فلم کیمرے سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اس کے فون کرنے پر وہی مکینک دوبارہ آئے خاموشی سے اپنے کیمرے اور متعلقہ اوزار لے کر واپس چلے گئے۔ ویلنٹینا نے ان سے کچھ نہ کہا۔ نہ ہی وہ اس سے کچھ پوچھنے کی جرات کر سکتے تھے۔ ان کے وہاں سے دفع ہوتے ہی اس نے فلیٹ کے تمام کمروں کو ڈبل لاک لگا دیے۔

اس نے آج بہت عرصے بعد اپنے خصوصی ٹرنک سے بائبل کا وہ نسخہ نکالا جو اس کے باپ نے یہاں ''چھپایا'' تھا۔ دو تین گھنٹے تک وہ عبادت کرتی رہی اور پھر اسے نیند آ گئی۔

صبح جب ویلنٹینا بیدار ہوئی تو خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ناشتہ کیا۔ بائبل کو احترام سے واپس ٹرنک میں رکھ دیا اور ایک جستی بیلٹ وہاں سے نکال لی۔

اس بیلٹ کا استعمال اس سے زیادہ بہتر اور کون جانتا تھا؟ ریوالور اور بیلٹ کے علاوہ بھی اسے کچھ چیزیں دی گئی تھیں جو ''کے جی بی'' کے ہر قابل اعتماد ایجنٹ کے پاس ہونا ضروری ہوتی ہیں۔

اپنے فلیٹ سے روانگی کے وقت اسے کوئی پشیمانی نہیں تھی نہ ہی کوئی پچھتاوا وہ جو کچھ کرنے جا رہی تھی اس کا فیصلہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا...... ویلنٹینا جانتی تھی کہ بہر حال ایک دن اسے یہی کچھ کرنا تھا۔ جلد یا بدیر۔

وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے اس نے جستی بیلٹ چیک کی اور اپنی کمر کے گرد کپڑوں کے نیچے پہن لی۔ اس جستی پٹی میں سے ایک انتہائی باریک تار نکال کر اس نے اپنی آستین کے اندر ہاتھ تک پہنچا دیا تھا۔ تار کے سرے پر لگا ایک قمیص کے بٹن ایسا بٹن اس کی ہتھیلی کے اتنا نزدیک تھا کہ وہ کسی وقت بھی اسے درمیانی انگلی سے چھو سکتے تھے۔

اپنی کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ماسکو کے برف کے گالوں میں ڈوبتے ابھرتے شہر کو بالکل اسی طرح دیکھا جیسے ان مناظر کو اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہو۔ پھر دو چار لمبے لمبے سانس بھرنے کے بعد وہ کار میں بیٹھ گئی اب اس کی کار ''ایف بلاک'' کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔

ماسکو یونیورسٹی کے نزدیک اس نے گاڑی کو تھوڑی دیر کے لیے روک لیا: اس کی نظریں سیر گاہ کے اس بنچ پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہ اکثر فیضان کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی اور اس سے پہلے کہ اسکی آنکھیں لہو رونے لگیں۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ کار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

ایف بلاک کے سامنے اس نے ٹھیک آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر گاڑی روکی تھی اور ٹھیک آٹھ بجے وہ کانفرنس روم میں داخل ہو رہی تھی۔

ایک لمبی میز کے گرد چار باوردی کلف لگے کالروں والے روسی کرنل بیٹھے تھے۔ اس کا اپنا باس بھی ان لوگوں میں موجود تھا۔ ویلنٹینا نے احترام گزارنے کے بعد اپنے بیگ میں سے کیسٹ نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے خوبصورت ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھوٹنے لگے تھے۔ اپنے ہاتھ کو اس نے بالکل بٹن دبانے کی پوزیشن میں کر لیا تھا۔

کیپٹن نے اٹھ کر فلم کیسٹ کو پروجیکٹر میں رکھا اور پروجیکٹر چلا دیا۔ دو تین منٹ تک جب سامنے لگے پردے پر کوئی رد عمل رونما نہ ہوا تو اسے مشین کی گھر گھر اپنے اندر اترتی محسوس ہونے لگی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟''......

ایک کرنل نے غصے سے اپنا ہاتھ میز پر مارا۔

''سر! سر!'' کیپٹن نے پروجیکٹر بند کر دیا۔ وہ خوف سے کپکپا رہا تھا...... ''سر شاید یہ غلط رول......''

''یہ صحیح رول ہے ذلیل انسان''......

ویلنٹینا پھٹ پڑی۔

''کیا بک رہی ہو تم؟''......

کرنل گلا پھاڑ کر چلایا۔

''شٹ اپ''...... ویلنٹینا کا رواں رواں غصے سے کانپنے لگا۔ ''گھٹیا انسانوں...... اصلی فلم تو تب چلے گی جب تھوڑی دیر بعد یہاں تمہارے جسموں کے چیتھڑے اڑیں گے۔''

''کہ...... کہ...... کیا مطلب ہے تمہارا...... تم پاگل تو نہیں ہو گئی؟''...... ایک دوسرے کرنل نے بظاہر گھبراہٹ کی ایکٹنگ کی۔

''کرنل اگر کسی نے بھی پستول نکالنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا پٹی بم پر میری انگلی دب جائے گی''......

ویلنٹینا کے لہجے میں نجانے کیا چھپا تھا کہ وہ سب اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے۔

"دیکھو پاگل مت بنو! ہم تمہارے باپ کو رہا کرنے کے احکامات جاری کر چکے ہیں۔ اور تمہیں اچانک یہ خوشخبری دینے والے تھے۔"

ایک کرنل نے پانسہ پھینکا۔

"جب تم گھر پہنچو گی تو والد کو اپنے منتظر پاؤ گی۔"......

دوسرے نے لقمہ دیا۔

"ہم تمہاری پچھلی عظیم خدمات کے عوض تمہیں معاف بھی کر دیں گے۔ اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"

تیسرا بولا۔

ویلنٹینا نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولی......

"میرے خیال سے تم موت کے خوف سے پاگل ہو چکے ہو...... ٹھیک ہے، اس طرح موت کی اذیت کم ہو جائے گی۔"

لیکن...... اس سے باتوں کے دوران کرنل نے اپنا پاؤں ایک سرخ رنگ کے بٹن پر رکھ دیا۔ جس کی ویلنٹینا کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

اور ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اچانک کمرے کی بغلی کھڑکی کھلی:

......حملہ آور نے بڑی پھرتی دکھائی تھی! اس کی آٹومیٹک گن سے یکدم کئی گولیاں ویلنٹینا کی طرف لپکیں، لیکن اس کے ٹریگر پر انگلی دبانے اور ویلنٹینا کے بٹن کو چھونے کا عمل ایک ساتھ ہی وقوع پذیر ہوئے۔

جستی پیٹی میں نصب ایک طاقتور بم ایک زوردار دھماکے سے پھٹا۔ ویلنٹینا کے جسم کے پرزے تو اڑنے ہی تھے۔ پورا کمرہ جیسے آتش فشاں کی طرح پھٹ گیا۔

چند منٹ بعد ہی وہاں ایک سجے سجائے کمرے کی جگہ ملبے کا ڈھیر پڑا تھا۔

......اور اس کمرے کے مکینوں کے جسم اس ڈھیر میں دب کر مختلف ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔

......دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ عمارت کی بہت سی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ کئی کمروں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔

☆☆

فیضان نے صبح اٹھ کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ یونیورسٹی جانے کے بجائے اپنے سفارت خانے پہنچ گیا۔ اس نے سفیر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ یکسوئی سے پڑھائی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں۔ پھر یوں بھی اس کا شوق ہی یہاں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس امر کو اس نے بطور خاص ملحوظ نظر رکھا کہ اس کی کسی بات سے سفیر ہرگز محسوس نہ کر سکے کہ خدانخواستہ اس کے "انقلابی خیالات" بدل گئے ہیں اور ملائیت اس میں واپس لوٹ آئی ہے۔ سفیر نے اسے تین چار روز بعد آنے کو کہا اور یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ اس کے متعلق حکومت سے ہدایات لے کر جلد کوئی فیصلہ کر دے گا۔

❁......❁......❁

حیات جاوداں

فیضان پر صبح ہی سے ایک بے نام سی یاسیت طاری تھی۔ وہ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا تھا...... اسی یاسیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور یہ دن اس کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی پریشانی لے کر آتا تھا۔

یونیورسٹی سے ملحقہ باغ میں ٹہلتے ہوئے بھی اس کا ذہن بار بار ویلنٹینا میں الجھ کر رہ جاتا...... اس سے متعلق سوچنا جیسے فیضان کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ جس جذباتیت کا شکار وہ آج ہو رہا تھا اس نے فیضان کو خاصا بزدل بنایا۔ کبھی کبھی تو اسے خود پر ترس آنے لگتا۔

پٹھان زادہ ہو کر وہ اتنا کمزور ہو جائے گا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا.......... !باغ میں بھی سکون نہ پا کر وہ دریا کے کنارے چلا آیا پھر دور تک پیدل چلتا چلا گیا۔

دریا حسب سابق پڑا چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا...... کبھی کبھی تو فیضان کو دریا کی اس پراسراریت سے چڑ سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہ خواہش بڑی شدت سے اس کے من میں انگڑائی لیتی کہ دریا کے ان پانیوں کو زبان مل جائے اور وہ چیخ چیخ کر وہ سب کچھ فیضان کو بتا دیں جو آج تک ان کے سینے میں گرداب کی طرح بل کھا رہا تھا۔

سورج نے ڈرتے ڈرتے ماسکو کی کہر آلود صبح کے پہلو سے جھانکا تھا...... اس کی کپکپاتی روشنیاں منجمد ماحول سے دریا کی شوریدہ سر لہروں کی طرح اپنا سر پٹخ رہی تھیں......!!

دھوپ کے رنگ میں زردی گھل رہی تھی۔ اس زردی مائل دھوپ نے بھی فیضان کو تازگی کا احساس دلایا...... ویلنٹینا کا خیال پھر اچانک اس کے لاشعور کی گہرائیوں سے نکل کر اس کے شعور پر غالب آنے لگا......!!

ایک کلی سی اس کے دل میں چٹخی اور ٹوٹ گئی......!!

''میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہوں......؟''

اس نے خود سے سوال کیا۔ پھر اس سوال کا کوئی جواب نہ پا کر اس نے اپنی نظریں دوبارہ پانیوں پر رقص کرتی سورج کی کرنوں پر گاڑ دیں۔

دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماحول پر طاری اس منحوس سی خاموشی سے اب اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ روس کے لوگوں کی طرح یہاں کا ماحول بھی بڑا منافق اور خاموش ہے۔

کچھ دور اب اسے دریا کے کنارے ٹہلتے دو تین بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ لیکن یہ سب لوگ ایک دوسرے سے اس طرح نظریں چرا

رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے چور ہوں......!

اس لمحے نہ جانے کیوں شدت سے اس کا جی چاہا کہ دریا کی ان لہروں سے ویلنٹینا نکل آئے اور اسے اپنی آغوش میں سمالے......! خاصی دیر تک وہ لہروں پر نظریں جمائے اسی سوچ میں مستغرق رہا لیکن پانی اس کی سوچ کے تابع نہ ہو سکا۔

یاسیت کا احساس بڑھنے لگا ایک پژمردگی اسے اپنے شکنجے میں کسنے لگی۔ پھر اچانک ہی ایک خیال سے وہ مہک اٹھا اور اس کے قدم بے اختیار ویلنٹینا کے فلیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ اپنی دانست میں اس نے یہی چاہا تھا کہ اچانک ویلنٹینا کے دروازے پر دستک دے کر اسے حیران کر دے گا...... آج اس کا دل ویلنٹینا سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے شدت سے چاہا کہ اپنا سینہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دے گا......! اسے بتائے گا کہ وہ کس شدت سے اس کے دام الفت میں الجھ کر رہ گیا ہے۔

تین چار میل کا پیدل سفر اس نے خوابوں کے تانے بانے سلجھاتے اور الجھاتے ہوئے طے کیا تھا...... راستے میں اسے کچھ لوگ ملے ضرور تھے لیکن حسب عادت سب ایک دوسرے کنی کترا کر گزر گئے۔

دھڑکتے دل اور لرزتی تمناؤں کے ساتھ اس نے ویلنٹینا کے دروازے پر دستک دی۔ پہلی کے بعد دوسری پھر تیسری دستک پر اسے مہربان قدموں کی چاپ سنائی دی۔ تو اس کے دل کی دھڑکنیں پھر غیر متوازن ہونے لگیں......!!

دروازہ ایک سپاٹ چہرے والی ڈھلتی عمر کی خاتون نے کھولا۔ اس کا شباب گو کہ استبداد زمانہ کی بھینٹ چڑھ چکا تھا...... لیکن فیضان کے دل نے بے اختیار کہا۔ ویلنٹینا کی ماں اسی کو ہونا چاہیے۔

''تم فیضان ہو؟''......

مہربان چہرے نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس سے پوچھ لیا۔

''جی! جی! ویلنٹینا کہاں ہے؟''......

یوں لگتا تھا جیسے خاتون الفاظ کا چناؤ بڑی احتیاط سے کر رہی ہے۔

فیضان کا دل دھک سے رہ گیا......!!

''ویلنٹینا کہاں گئی؟''......اس کی بیقراری چہرے سے عیاں تھی۔

''اندر آ جاؤ''......

خاتون نے جیسے اس کے سوال سے متعلق جواب نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

عورت کے پیچھے وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اندر آ گیا...... ویلنٹینا کی ماں نے جس کمال ہمت سے اپنے جذبات پر پردہ ڈال رکھا تھا اس کے لیے فیضان کے دل سے بے اختیار واہ نکل گئی۔

''بیٹھو!''......

ستم رسیدہ خاتون نے اس مرتبہ جب فیضان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تڑپتی نمی نے فیضان کو بے چین کر دیا۔

قمیص کی آستین سے آنکھیں پونچھتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ واپسی پر وہ ہاتھ میں ایک لفافہ تھامے ہوئے تھی۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔"

اس نے ہچکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔ آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر پھیلتے چلے گئے۔

فیضان کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔

کسی غیر مرئی عمل کے تابع اس نے ہاتھ بڑھا کر خط تھام لیا۔

"بیٹا یہ خط لے کر جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جاؤ...... دوبارہ کبھی اس طرف نہ آنا"...... آخری فقرے پر اس نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

فیضان کٹ کر رہ گیا......!

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے؟ کسی سحر زدہ معمول کی طرح وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

اس نے چاہا ہمدردی کے دو بول اس محترم خاتون کی نذر گزارے لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

خاتون جسے صورت حال کی نزاکت کا احساس شدت سے تھا اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتی دوبارہ اس کی راہنمائی کرتی باہری دروازے تک آئی۔ دروازے کے قریب رک کر اس نے فیضان کی آنکھوں میں جھانکا...... اس لمحے فیضان کو ویلنٹینا اس محترم خاتون کی آنکھوں سے جھانکتی دکھائی دی۔

خاتون نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور سر اونچا کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر کہا۔ "مجھے معاف کرنا بیٹا! تمہیں بیٹھنے کو بھی نہیں کہہ سکتی۔"

فیضان کی قوت گویائی چھن چکی تھی۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دے۔ خاتون نے آگے بڑھ کر دروازے کا ہینڈل گھمایا...... یہ گویا رخصتی کا اشارہ تھا۔

فیضان کے باہر نکلتے ہی اس نے مزید کچھ کہے بغیر دروازے بند کر دیا۔!!

☆☆

شدت غم سے بے حال ہونے کے باوجود فیضان نے دوسرے ہی لمحے معاملات کی سنگینی کا احساس کر لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کے جی بی نے اسے یہاں نہیں دیکھا تھا ورنہ شاید یہ خط بھی اس تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔

یونیورسٹی جانے کا خیال اس کے دل سے نکل گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ دوبارہ دریائے سرخ کے کنارے پہنچ گیا...... اس مرتبہ اس نے خاص طور سے احتیاط کی تھی کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔

ایک محفوظ کونے میں پہنچ کر وہ دریا کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ دھڑکتے دل اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ چاک کیا......اور سفید کاغذ پر بکھرے الفاظ کے پس منظر سے ویلنٹینا کی شبیہہ نکل کر اس سے مخاطب ہوگئی۔

فیضان!

تمہیں یہ خط اسوقت ملے گا، جب میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ مجھے یہ سب کچھ لکھتے ہوئے روحانی کرب کے جس شدید احساس سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اسکا شاید تم کبھی اندازہ نہ کرپاؤ......

میں جانتی ہوں تمہیں بہت دکھ ہوگا لیکن میں سب کچھ کرنے پر مجبور ہوں۔

سچی بات تو یہ ہے فیضان کہ شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد سے میں نے کبھی خود کو عورت جانا ہی نہیں تھا۔ میں نے ابھی جوانی کی ابتدائی منازل طے ہی کی تھیں جب میرا بدقسمت باپ کے جی بی کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گیا......

وہ بالکل سیدھا سادا انسان تھا...... اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اور یہی اس کا سب سے بڑا گناہ تھا۔ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میرے باپ نے کسی کے سامنے سوشلزم کو برا بھلا کہہ دیا۔

اس روز آدھی رات گئے ہمارے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تو جیسے مجھے خود آنے والی اذیتا کیوں کا ادراک حاصل ہوگیا۔ میری ماں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور سفید کپڑوں میں ملبوس کے جی بی کے درندے ہمارے گھر میں گھس آئے...... پہلے تو انہوں نے وحشیانہ انداز میں میرے والد کو پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں آدھ موا کر کے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

میری والدہ نے روتے ہوئے جب اپنے بے بس خاوند کی مدد کو آگے بڑھنا چاہا تو دو درندے ان پر بھی پل پڑے......انہوں نے ہم دونوں بہنوں کے منہ پر بھی تھپڑ مارے......وہ ہماری بدبختی کا آغاز تھا۔

اگلے روز مجھے وہ لوگ والد سے ملانے لے گئے۔ جس نے مجھے کہا کہ اب اس کی زندگی اس صورت ممکن ہے کہ میں ان بھیڑیوں کے اشاروں پر ناچتی رہوں۔

میں آرٹس کی طالبہ اور خواب دیکھنے والی لڑکی تھی۔ بچپن ہی سے میری ماں نے جو خود بھی اچھا گانے والی عورت تھی مجھے گیت سنا سنا کر میری روح میں ایک نغمگی گھول دی تھی۔ میں نے زندگی کے اس بھیانک روپ کا تو کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

میں نے اپنی ماں کو تھیٹروں میں گاتے اور ہزاروں لوگوں سے داد وصول کرتے پایا تھا۔ میں تو مغنیہ بننا چاہتی تھی...... اپنے گیتوں سے فضاؤں میں رس گھول کر کائنات کے وسیع کینوس میں حسین رنگ بھرنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

یکا یک جیسے کسی نے مجھے آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر تحت الثری کی گہرائیوں میں پھینک دیا!

ان لوگوں نے اپنے مذموم مقاصد کی بجا آوری کے لیے سب سے پہلے مجھے آبرو باختہ کیا...... وہ درندے جانتے تھے مجھ میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے......سب سے پہلے انہوں نے میری نسوانیت کو کچلا۔ مجھے احساس دلایا کہ میں نہ کبھی عورت تھی نہ ہوں۔ میں صرف ایک

سوشلسٹ روسی خاتون ہوں جسے انقلاب کی بجا آوری کے لیے جنم دیا گیا اور جس کی روح اور جسم پر اس کا کوئی حق نہیں صرف اور صرف اس کی سٹیٹ کا حق ہے۔

ان لوگوں نے میرے دامن عصمت کو داغدار کیا۔ میری نسوانی حیا کو نوچا کھسوٹا۔ اتنی بے رحمی سے میرا روحانی پوسٹ مارٹم کیا کہ ساری پاکیزگی کو نوچ کر میرے جسم سے الگ کر دیا۔

میں عورت سے فاحشہ بن گئی۔!!

میری روح تو مر ہی چکی تھی۔ جسم ان لوگوں کی ملکیت بن گیا۔ میں پانچ سال تک اپنا جسم انسان نما درندوں سے سرخ انقلاب کے لیے نچواتی رہی۔

مجھے ائیر ہوسٹس بنا کر یہ ڈیوٹی سونپی گئی کہ تم جیسے سادہ لوح نوجوانوں کو سرخ انقلاب کا گرویدہ بناؤں۔ مجھے بتایا گیا کہ مرد کے دل میں اترنے کے لیے اسے اپنے جسم کا اسیر بنالو...... اور میں کٹھ پتلی کی طرح ان کے اشاروں پر ناچتی چلی گئی۔

میں نے جانے کتنے معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کا خون کیا۔ انہیں انسانیت کی سطح سے گرا کر "انقلابی درندے" بنا دیا...... خود تو میں قعر ذلت کی گہرائیوں میں دفن تھی ہی۔ ان بے گناہوں کو بھی اپنے ساتھ ہی دفن کرتی رہی۔

جس روز میری ڈیوٹی تم پر لگی تھی اور مجھے کہا گیا کہ اس نوجوان کو قابو کر کے کابل میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے آلہ کار بناؤ۔ اس روز مجھے یہ احساس قطعاً نہیں تھا کہ مجھ میں مر جانے والی ویلنٹینا کبھی زندہ بھی ہو جائے گی۔

لیکن تم سے پہلی ملاقات پر ہی مجھے یوں لگا جیسے میری ذات پر چڑھا آہنی خول تڑخ کر رہ گیا ہو......!!

میں فاحشہ سے دوبارہ عورت بننے لگی تھی فیضان...... ! جانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جب تم چپکے سے میرے دل کے کسی زنگ آلود دریچے کو کھول کر اس میں آن بیٹھے۔!

یہی میری بربادی کا آغاز تھا......!!

تم نے اپنی معصوم باتوں اور حرکتوں سے مجھے عورت بنانا شروع کر دیا...... اور میں بے بسی سے اپنے لٹنے کا تماشا دیکھتی رہی...... جانے کتنی دفعہ میرا جی چاہا کہ تمہیں بھی اپنے جسم کا اسیر بنالوں، لیکن تم تو میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئے تھے...... تم نے تو جیسے مجھ پر محبت کا اسم اعظم پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ تمہیں اپنے نزدیک پا کر بجائے اس کے میری حیوانیت جاگے۔ مجھ میں پاکیزہ نسوانیت زندہ ہونے لگتی تھی۔

فیضان!

میں نے کئی مرتبہ چاہا کہ تمہاری محبت کے ان گہرے پانیوں سے نکل کر دوبارہ اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جاؤں، لیکن میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو تمہاری محبت کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جا رہی تھی...... بے خودی کا ایسا ان دیکھا عالم مجھ پر طاری ہو رہا تھا کہ جس میں میری اپنی ذات کی تو کوئی حیثیت جیسے رہ ہی نہیں گئی تھی۔ بس مجھ میں تو تم ہی تم تھے۔

کل مجھے سختی سے حکم دیا گیا کہ تمہارے ساتھ جنس کا گھناؤنا کھیل کھیلوں اور اس کی فلم تیار کر کے اپنے مالکوں کو پہنچاؤں تا کہ اس کے بل بوتے پر وہ تمہیں بلیک میل کر کے اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔

فیضان!

یہ ناممکن تھا......!

میں ان درندوں کو یہ کیسے سمجھاتی کہ ان کی لاکھ کوششوں پر بھی مجھ میں موجود عورت ابھی مری نہیں......!!

اب میرے لیے دو ہی راستے تھے یا تو ساری زندگی کے لیے سائبیریا کے سرد جہنم زاروں میں سڑتی رہوں یا پھر موت کو گلے لگا لوں۔

میں نے دوسرا راستہ چنا ہے......!

لیکن میں اکیلی نہیں مروں گی۔ کم از کم چار درندوں کو ضرور اپنے ساتھ جہنم رسید کروں گی۔

میں جا رہی ہوں فیضان۔ اس دعا کے ساتھ کے میرا عزم متزلزل نہ ہو۔

کاش! تم اس وقت مجھے دیکھتے۔ میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد کتنی مطمئن ہوں۔ کوئی پچھتاوا نہیں مجھے...... میں بہت پر سکون ہوں۔ بس ایک دکھ ہے......

تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا دکھ......!

لیکن سوچتی ہوں زندگی میں سب کچھ پانے ہی کو نہیں ہوتا۔ ہر پھول ایک سی قسمت لے کر دنیا میں نہیں آتا۔

تم محبت کی خوشبو ہو فیضان......!

میں نے تمہیں بہت محسوس کیا ہے...... تمہیں پایا نہیں...... لیکن تمہیں مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا......!!

کوئی نہیں چھین سکتا......!

مجھے علم ہے میری موت کا تمہیں دکھ تو ہو گا...... لیکن اسے روگ نہ بنا لینا۔ ورنہ میری روح کو کبھی قرار نہ آئے گا۔ میں تمہارے لیے صرف ایک پیغام چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ یہ پیغام اپنے ملک کے کونے کونے میں پہنچا دو...... اپنے ملک کے بچے بچے کو بتا دو کہ انقلاب کی آڑ میں ان کی غیرت کا سودا کیا جا رہا ہے...... اگر خدانخواستہ اس انقلاب نے افغانستان میں بھی قدم جما لیے تو ان لوگوں کا حال بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہو گا۔

غلامی کا ایک ایسا طوق ان کے گلے میں پڑ جائے گا جسے اتارنا پھر کبھی ممکن نہیں رہے گا۔

فیضان! میرے لیے کبھی نہ رونا...... کوئی پچھتاوا کبھی تمہارے نزدیک نہ پھٹکے اگر تم نے میرا پیغام اپنے ہموطنوں تک پہنچا دیا تو میں سمجھوں گی تم نے محبت کا حق ادا کر دیا......!

میں تو مر کر یہ قرض اتار رہی ہوں۔

خدا کے لیے جتنی جلد ممکن ہو ماسکو سے نکل جاؤ!

تمہاری ویلنٹینا

وہ خط پڑھ رہا تھا اور آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے......! خط کے خاتمے پر فیضان بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا......!

اسکی آنکھوں کا سارا پانی دریا بنتا رہا...... جانے کتنی دیر تک اسکی آنکھیں خون روتی رہیں۔

پھر جیسے اسے قرار آ گیا۔...... وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خط کو مقدس دستاویز کی طرح اس نے تہہ کر کے اپنی جیب میں چھپالیا۔ اب یہ خط اس کا سرمایہ حیات تھا۔

اچانک ہی ایک کرب اس کے اندر جاگ اٹھا...... اس نے اپنی خونیں نظریں دریائے سرخ پر گاڑ دیں۔

ویلنٹینا! اس نے دل ہی دل میں اپنی محبوبہ کو نذر عقیدت گزاری۔ خدائے لم یزل کی قسم! جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔ میں سرخ لٹیروں کے خلاف لڑتا رہوں گا۔ میں ان کے قدم کبھی اپنی مقدس پر جمنے نہیں دوں گا۔ تمہارے خون کا ایک ایک قطرہ آج سے مجھ پر قرض ٹھہرا۔

خدا کرے اس قرض کی مکمل ادائیگی سے پہلے مجھے کبھی موت نہ آئے...... ایک ولولہ تازہ......

ایک عزم...... ایک جذبہ جہاد لے کر وہ اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا یونیورسٹی کی طرف چل دیا۔ اس کے قدم بڑی مضبوطی سے زمین پر جم رہے تھے۔ ویلنٹینا کی مسکراتی آنکھیں راستے کے دونوں اطراف کے پھولوں میں سے جھانکتی اسے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

❁......❁......❁

گم شدہ اوراق

دریائے موسکوا کی تڑپتی بل کھاتی لہروں پر نظریں جمائے وہ کب سے کھڑا تھا۔

دریا اپنے جوبن پر تھا...... شوریدہ سر لہریں شور مچاتی ساحلوں سے ٹکرا رہی تھیں اور فیضان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان لہروں کی تمام تر شوریدہ سری اس کے اندر در آئی ہے۔

اس کی رگوں کے کھولتے خون میں دریا کی طغیانی سے زیادہ جوش و خروش مچل رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر ویلنٹینا کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے فیضان کو اس کے ملک افغانستان کی بدقسمتی سے متعلق کہے تھے۔

وہ سوچنے لگا تھا: ''کہ اس کے آباؤ اجداد نے جب ان سرکش لہروں کو سر کیا تھا، تب بھی دریائے موسکوا کی طغیانیوں میں یہی جوش و جلال کارفرما تھا؟

اس کا ذہن پانچ سو سال پیچھے لوٹ گیا اور اسے تاتاریوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں ریڈ سکوائر کے ان دفاتر کے سامنے گونجتی سنائی دی جہاں بیٹھ کر آج زار روس کے پیروکار اپنے چہروں پر امن و آشتی کا لبادہ اوڑھ کر تیسری دنیا کے کمزور ممالک کے عوام کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔

اس کے استاد نے کئی برس قبل کابل کے اس سکول میں تاریخ کا سبق پڑھاتے ہوئے اسے بتایا تھا: ''کہ عثمانیوں کے گھوڑوں نے مشرقی اور مغربی یورپ کے قریباً ہر ملک کو اپنے سموں تلے روند ڈالا تھا، اور......

تیمور لنگ نے جب روس کا رخ کیا تو یہاں بستیاں اس کی دہشت سے خالی ہو گئی تھیں اس کے بوڑھے استاد نے یہ بھی کہا تھا: ''بیٹے! تم یہاں سے جب فارغ ہو کر کالج میں جاؤ گے تو تمہیں ایک دوسری خود ساختہ اور جعلی تاریخ پڑھنے کو دی جائے گی لیکن تم اپنی جستجو سے اصلی سچی اور کھری تاریخ تلاش کرنا...... اسے پڑھنا اس تاریخ کو پڑھنا جو استعمار کی جادوگری سے محفوظ رہی ہو! یہ تاریخ تمہیں استعماری قوتوں کے ہتھکنڈوں سے روشناس کرائے گی اور ان کے ہاتھوں زخم خوردہ اقوام کے کلیجوں میں پڑنے والے گھاؤ بھی دکھائے گی۔''......

دریائے موسکوا کے کنارے کھڑے فیضان اوغلو کو آج شدت سے اپنا وہی بوڑھا استاد بار بار یاد آ رہا تھا جسے اس نے نہ جانے لاشعور کے کن کونوں کھدروں میں دفن کر رکھا تھا۔ اس کے سینے سے ایک ہوک سی اٹھی: خدا جانے وہ آج زندہ بھی ہے یا انقلاب کی بھینٹ چڑھ چکا ہے......؟

اس کے معزز استاد نے کہا تھا: ''بیٹا!...... استحصال کا شکنجہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ زیردستوں کے زخم ناسور میں بدل جاتے ہیں...... غصب شدہ قوموں کے اجسام اور روحیں گل سڑ جاتی ہیں...... ان کے افکار، نظریات اور عظیم روایات سب ہی کچھ سامراج کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور سامراج اگر کوئی ملک چھوڑ کر بھی چلا جائے تو اپنے پیچھے وہ انسانوں کی بجائے غلاموں کی ایک ایسی بھیڑ چھوڑ جاتا ہے جو اس کی غیر موجودگی میں

بھی اس کے نظریات وافکار کے گن گاتی رہتی ہے......''!

آج، وہ سوچ سکا: ''......یہی کچھ ہونے والا ہے میرے ملک میں بھی......''!

لیکن آخر یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟ کیا وہ اس قوم کا ایک فرزند نہ تھا۔ جس نے خیبر کی چوٹیوں کو سر کرتے ہوئے......پنجاب کی ہریالیوں کو زیر کیا! سندھ کے تپتے ریگزاروں کو پاٹ کر سومنات کے غرور کو بھی اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا؟

اسکے اجداد نے صدیوں برصغیر پر حکومت کی تھی...... اسلام کے ابدی پیغام کو راس کماری سے کنیا کماری تک پہنچایا تھا......سمرقند وبخارا......اسکی تاریخ تھی! وہ یاد کرنے لگا:

''یہ بہت پرانی بات نہیں تھی...... اکتوبر 1917ء کے انقلاب سے پہلے روس کی بیشتر آبادیاں مکمل طور پر مسلمان بستیاں تھیں......زاران روس کے جبر وتشدد کے باوجود انہیں اس وقت بھی اپنے داخلی معاملات میں کچھ نہ کچھ آزادی بہرحال حاصل تھی......!!

اسے آج بڑی شدت سے تاریخ کا فراموش کردہ وہی باب یاد آ گیا تھا...... وہ بھولا نہ تھا کہ: ''روس کی سولہ جمہوریتوں میں سے پہلی آٹھ خالصتاً مسلم آبادیاں ہیں۔ اور باقی 9 تا 16 جمہوریتوں کے اندر بھی خاصی تعداد میں مسلمان موجود ہیں۔'' وہ انہیں اسی طرح دیکھ رہا تھا۔

جمہوریہ روسیہ کے اندر شمالی قوقاز، جزیرہ نمائے قرم اور ایدل اورال (والگا کے گردوپیش کے علاقے) میں اس کے آباؤ اجداد تاتار اور باشکر آباد ہیں......''

ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قرغیزستان، شمالی آذربائیجان اور شمالی قوقاز...... یہ سب اس کے اپنے لوگ ہیں۔

روسی ترکستان میں ماوراء النہر کا دوآبہ مسلمانوں کے تاریخی نقوش، مراکز بخارا، سمرقند خیوہ (خوارزم) اور فوقند کے نقوش اپنے سینے پر سجائے آج بھی نشان عبرت بنا کھڑا ہے۔ امام بخاری، ترمذی، زمخشری، سرخسی اور فلاسفہ عظام فارابی وابن سینا اسی خطے میں محوخواب ہیں۔

ابن قفال، ابوعبدالرحمٰن سلمی، حافظ ابن مندہ، ابن نصر، عمر بنہ قطاف، حافظ ابوسعید ہیثم بن کلیب شاشی...... اسے ایک ایک بھولی ہوئی کہانی یاد آ رہی تھی۔

سمرقند تیمور لنگ کا دارالحکومت تھا۔ جسے ''جنت روئے زمین است'' کہا گیا...... ''مسجد تیلہ'' مسجد بی بی خانم اور خاندان تیموریہ کے آخری حکمران الغ بیگ گورگان کا مدرسہ ''الغ بیگ گورگانی'' سمرقند کی عظیم اسلامی درسگاہیں اور مساجد اس کے لاشعور میں انگڑائیاں لے کر جاگنے لگیں......!

دریائے موسکوا کی طغیانی سے اس کی رگوں میں کوندتی بجلیاں بہت زیادہ قوت کے ساتھ اس کے شعور کو ڈسنے لگیں۔

تیمور کے چہیتے پوتے ولی عہد سلطان محمد گور امیر کا مقبرہ۔ جس کی نظیر ایشیائے کوچک میں نہیں ملتی۔

سمرقند کی خاک ہی سے امام الہدیٰ، ابواللیث نصر بن محمد السمر قندی علم اخلاقیات کے موجد ابوزید دبوسی سمرقندی، حافظ رجاء، امام ابوداؤد (ابن ماجہ کے مشہور شاگرد تھے) اصحب یقتہ الفقہاء، علاؤالدین محمد بن احمد سمرقندی علم الکلام کے شاہسوار۔ ابومنصور ماتریدی سمرقندی۔

بخارا کا مدرسہ میر عرب۔ مسجد کلاں، مینار کلاں جو وسط ایشیا کا سب سے بلند مینار ہے۔

بخارا ہی کا مدرسہ عبدالعزیز، مدرسہ کلتاش وہ عظیم درسگاہیں تھیں جن سے لاکھوں نے اکتساب فیض کیا جنھیں آج کے زاروں نے کھنڈ رات کا ڈھیر بنا دیا ہے۔

مسجد مغنی عطاء مسجد مصلی اور سلسلہ نقش بندیہ کے بانی خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کا مدفون۔

سمرقند کے مضافات میں محدث جلیل امام محمد بن اسمٰعیل بخاری صاحب ''الجامع الصحیح البخاری'' مشہور فقیہ ابوجعفر محمد بن عبداللہ ہندوانی بلخ کے آئمہ جنھیں فقہ میں غیر معمولی دسترس کی وجہ سے چھوٹے ابوحنیفہ کہا جاتا ہے۔

ماورالنہر کے عظیم امام ابوبکر خواہر زادہ محمد بن حسین، شمش الائمہ عبدالعزیز بن احمد الحلوانی، قاضی خان کے استاد ابواسحٰق ابراہیم بن اسمٰعیل ......ان سب نے خاک بخارا ہی سے جنم لیا تھا۔

خوارزم کے ابوبکر خوارزمی۔ محدث محمد بن محمود خوارزمی (علم کلام، طب، حساب، ریاضی اور فلکیات پر محمود خوارزمی نے ہی سب سے پہلے انسائیکلوپیڈیا تالیف کیا)

اسی طرح جمہوریہ ترکمانستان میں ''مرو'' کے ہزاروں علمائے کرام۔ جمہوریہ قرغیزستان کے ''اوش'' شہر کے امام الحرمین، جمہوریہ قازقستان کے قازق ترک شہسوار اور علماء اسے فراموش کردہ ساری کہانیاں یاد آ گئیں۔

تاریخ زندہ ہو کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

وقت نے دست سوال اس کے سامنے دراز کر کے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا......کہ

تھے وہ آبا تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟

☆☆

اس سوال کا جواب نہ پا کر وہ گورکی پارک میں چلا آیا......!

یہاں سے اس کی یونیورسٹی نزدیک ہی تھی...... یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر مرکزی علوم شرقیہ پر پڑی......اس کا خون کھول اٹھا۔ اسے اچھی طرح سمجھ آ گئی: ''کہ 1953ء میں یہ یونیورسٹی اس لیے قائم ہوئی تھی کہ یہاں تیسری دنیا کے بھولے بھالے، جذباتی اور بدقسمت نوجوانوں کو اکٹھا کر کے ان کے ذہنوں میں مسموم نظریات انجیکٹ کیے جائیں اور انہیں عالمی انقلاب کے بے ہودہ سبق اور جذباتی نعرے دے کر ان کے ملکوں میں موجود نظام ہائے زندگی کی بیخ کنی کے لیے واپس بھیج دیا جائے''!

اس علوم شرقیہ کی عمارت سے اسے ایسے کئی بدقسمت ممالک کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ جن کی شکلیں، عادات، اطوار اور مذاہب تو مختلف تھے لیکن اس ڈیپارٹمنٹ میں ان سب کو انقلاب کی ایک ہی تھیوری رٹائی جا رہی تھی۔

......ایک ہی طرح کا زہر ان سب کی رگوں میں اتارا جا رہا تھا......!!

......ایک ہی قسم کے نظریات ان کے اذہان میں ٹھونسے جا رہے تھے......!

اور یہ سب تیسری دنیا کے وہ بدقسمت اور بدبخت نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھے جو ترقی پسندی کی مذبح گاہ میں بڑی خوشی سے اپنے جسم و جان کا بلی دان دے رہے تھے......ان کی حکومتیں جو بلا شرکت غیرے ان کے دل و دماغ پر بھی حکومت کرنے کی دعوے دار تھیں نے، ان بے چاروں کو چند ٹینکوں، ہوائی جہازوں، سڑکوں، پلوں اور خوراک کے عوض......غیروں کے ہاتھ گروی رکھ دیا تھا۔

"بردہ فروشی کی ایسی بھیانک تصویر اس سے پہلے انسانی تاریخ میں کس نے دیکھی ہوگی......"

اسے ان نوجوانوں کے آقاؤں سے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔

اس کی نظریں یونیورسٹی کی عظیم الشان عمارت کے مختلف بلاکوں کا جائزہ لیتی ہوئی آخر سائنس بلاک پر آ کر جم گئیں......ایک زہر خندہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود پھیلتی چلی گئی۔

وہ جانتا تھا اس بلند و بالا عمارت میں......تعلیم کی آڑ میں تخریب کاری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا......یہاں نوجوانوں کو اپنے ہی ملک، اپنے ہی لوگوں کو تباہ و برباد کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔

یہاں پل اور سڑکیں بنانے کے بجائے انہیں اڑانے کے طریقے بتائے جاتے تھے......انہیں تعمیر کے بجائے تخریب کاری کا درس دیا جا رہا تھا۔

اس نام نہاد درس گاہ میں تاریخ کا وہ شعبہ بھی قائم تھا جہاں تاریخ کی دھجیاں بکھیری جاتی تھیں......جہاں دنیا کے تمام عظیم انسانوں کو محض اس گناہ کے پاداش میں عظیم نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ کمیونسٹ نہیں تھے......جہاں مذاہب کی تضحیک یہ کہہ کر کی جاتی تھی کہ یہ امراء کا ہتھیار ہے۔ افیون ہے جو غریب عوام کو کھلا کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا جاتا تھا۔

اس کا دل کلاس روم میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا......وہ سیدھا لائبریری میں گھس گیا۔

آج اس کا رخ لائبریری کے ان گوشوں کی طرف تھا جس طرف کسی کو بھولے سے بھی جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ جہاں الماریوں میں کتابیں محض اس لیے سجائی گئی تھیں کہ انہیں صرف غیر ملکی وفود دیکھ سکیں اور بس......

فیضان کے قدم بے اختیار اس سمت اٹھ رہے تھے......

اس کی نظریں قد آدم الماریوں میں سجی کتابوں پر رینگتی ہوئیں بالآخر ایک کتاب پر آ کر ٹھہر گئیں......یہ کتاب عثمانیوں کے دور حکومت سے متعلق تھی! کتاب لے کر جب وہ لائبریرین کے پاس اندراج کروانے لگا تو اس نے گھور کر صرف ایک نظر فیضان کی طرف دیکھا اور کتاب اس کے نام جاری کر دی۔

فیضان جب لائبریری کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو اسی لمحے لائبریرین بھی اس کے "ماسٹر" کو فیضان کے گمراہ ہونے کی خبر دے رہا تھا......

اس کتاب کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے صرف الماریوں کی سجاوٹ کے لیے ہی یہاں رکھا گیا تھا مگر کسی نے آج تک اس کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی......

اپنے کمرے میں آ کر اس نے ہولے سے کتاب کا سینہ چاک کیا۔ عثمانیوں کے گھوڑے اس کو مشرقی اور مغربی یورپ کو روندنے کے بعد روس کے دروازوں پر دستک دیتے صاف سنائی دے رہے تھے...... یہ اس کے اسلاف کی قابل فخر تاریخ تھی...... ایک ایسا تابناک باب تھا جو اب گرد آلود ہو گیا تھا۔

☆☆

رات کے آخری پہر تک وہ کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔

ایک ایک ورق پر اس کو رونا آ رہا تھا...... اس کا جی چاہتا تھا کہ گلا پھاڑ کر چلا چلا کر تیسری دنیا کے ان تمام بدبخت طالبعلموں کو بتا دے: کہ وہی قومیں زندہ رہنے کا حق رکھتی ہیں جو اپنے ضمیر کی قیمت نہیں چکاتیں۔

جو چمکتے دمکتے لوہے کو سونا نہیں سمجھتیں...... جو اپنے بل بوتے پر زندہ رہنے کی طاقت کا ادراک رکھتی ہیں اور جنہوں نے ذہنی غلامی قبول کر لی وہ روئے زمین پر اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق کسی غیر کے ہاتھ فروخت کر دیتی ہیں۔

کتاب ایک طرف رکھ کر وہ چارپائی پر لیٹا تو اس کا ذہن اپنے ملک میں پہنچ گیا۔

کوہ ہندوکش اور بامیان کے عظیم سلسلے...... دریائے آمو اور کابل کی روانیاں سرسبز پہاڑ، جنگلات، وادیاں، پھلوں سے لدے پھندے درختوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے اور چپے چپے پر موجود غیور افغانوں کی عظیم روایات کی ثبت کردہ مہریں۔

''نہیں...... خدا کی قسم نہیں۔'' ...... کوئی اس کے اندر چلایا...... ''میں اپنی تاریخ کو کبھی شرمندہ نہ ہونے دوں گا......

...... میں اپنی تاریخ کو اغیار کے قدموں تلے روندتا کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

...... میں حق اور انصاف کیلئے، اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے سے بھی دریغ نہ کرونگا۔

وہ تڑپنے لگا:

''لعنت ہے ایسی ترقی پر! مجھے نہیں چاہئے یہ ترقی...... مجھے صرف ایمان چاہئے۔

...... اپنے لوگوں کے لیے ایمان! ایسی قوت جو ہمیں پھر اللہ تعالیٰ پر یقین کامل کا بھروسہ عطا کرے۔

جو ہمیں ہمت اور قوت عطا کرے......

اور اس کے دل نے گواہی دی:

''تم آج آزاد ہو گئے ہو......''

''آزاد؟''...... اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیروں کے باوجود اس نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔

......وہ عام انسان سے ایک مجاہد بن گیا تھا۔

......غازیانہ روایات کا حامل پٹھان زادہ! جو ظلمتوں کے خلاف پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سن رہا تھا۔

اور یہ آوازیں سنتے سنتے وہ نیند کی دیوی کی بانہوں میں جھولنے لگا۔

☆☆

ماسکو کی صبح پر آج پھر دھند اور کہر نے قبضہ کیا ہوا تھا...... فیضان صبح اٹھ کر یونیورسٹی جانے کے بجائے دوبارہ سفارت خانے میں پہنچ گیا۔

اس نے سفیر سے صاف صاف کہہ دیا: ''کہ وہ یکسوئی سے پڑھائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں!'' اور دوسرے اسے کابل میں نہایت اہم کام بھی سرانجام دینے ہیں۔

''وہ کیا کام ہیں۔'' سفیر اس کی بات سن کر بولا: ''جو کام کابل میں ادا ہونے ہیں کیا وہ ماسکو میں سرانجام نہیں پا سکتے؟''

''جی نہیں! انکی نوعیت ہی ایسی ہے۔'' فیضان بولا۔ ''وہ کام اتنے اہم ہیں کہ مجھ ہی سے متعلق ہیں اور فوری طور پر توجہ کے طالب ہیں۔''

اس نے باتیں کرتے وقت اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا کہ اس کی کسی بات سے سفیر ہرگز نہ جان سکے کہ خدانخواستہ اس کے ''انقلابی خیالات'' بدل گئے ہیں اور ملائیت اس میں دوبارہ لوٹ آئی ہے۔

کافی دیر تک مغزماری کے بعد بالآخر اسے سفیر کو قائل کر لیا اور تین روز بعد یونیورسٹی نے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر اسے ملک سے نکال دیا۔

ماسکو کے ہوائی اڈے پر جہاز میں سوار ہوتے ہی اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب ویلنٹینا بطور ائیر ہوسٹس اس کی اور یاسمین کی خاطر داری میں لگی ہوئی تھی...... لیکن اس وقت وہ کہاں تھی؟

اس نے ہولے سے کھڑکی کا پردہ سرکایا اور خلاؤں میں گھورنے لگا...... ائیر پورٹ پر موت کا سناٹا طاری تھا...... رن وے پر کہر میں لرزتا ایک مسلح محافظ...... دور کھڑا اسے دکھائی دیا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک صورت اسکے سامنے ابھرنے لگی! یہ ویلنٹینا ہی تھی۔

''ویلنٹینا!'' اس کے ہونٹ لرزنے لگے: ''دیکھو...... میں تمہارا ہی مشن پورا کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔''

جانے وہ کتنی دیر یونہی بڑبڑاتا رہا اور اس کے جواب میں ایک نرم و نازک ہاتھ ہواؤں میں لہراتا رہا...... جیسے اسے کوئی الوداع کہہ رہا ہو۔

''خدا حافظ'' اس نے دھیمی سی آواز میں اسے جواب دیا۔ جہاز کے انجن غرانے لگے۔

''خدا حافظ'' اس نے دوبارہ اپنا سلام دہرایا۔ ''میں تو دراصل تاریخ کے گمشدہ اوراق ڈھونڈنے جا رہا ہوں...... ویلنٹینا! ویلنٹینا!! تم گواہ رہنا۔''

جہاز نے تیز رفتاری سے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا تھا...... پھر ایک ہلکے سے جھٹکے سے وہ فضاؤں میں بلند ہونے لگا...... ماسکو سے وہ تیزی سے دور اور کابل سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا......!

❀......❀......❀

مصور اور تصویر

جتنی دیر جہاز محو پرواز رہا، فیضان اپنی سوچوں کا رخ کسی اور جانب نہ موڑ سکا، لیکن...... لیکن جونہی جہاز نے فضاؤں سے اتر کر، کابل کے رن وے کو چھوا، اس کی سوچوں کا دھارا بھی اپنا رخ بدلنے لگا۔

......اس نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس سنبھالا، اور مسافروں کے تعاقب میں جہاز کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کابل سردی کی گرفت میں کپکپا رہا تھا۔ ہوائی اڈے پر جہاز لینڈ کرتے ہی سردی کی شدت بڑھنے لگی تھی...... حالانکہ ابھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔

لیکن نجانے برفیلی ہوائیں کہاں سے اندر گھس آئی تھیں۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ اس کی نظریں کابل ایئر پورٹ کی بلند و بالا عمارات کے عقب سے ابھرنے والے ان نقوش پر جم گئی تھیں جو آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اترنے لگے تھے۔

......وہ بجھ سا گیا۔

پھر جیسے کسی نے اس کے کانوں پر سرگوشی کی: ''کیا تم تاریخ کے انہی نقوش میں رنگ بھرنے کے لیے یہاں آئے ہو جنہیں وقت کی آندھیوں اور طوفانوں نے اس قدر مدہم اور دھندلا کر دیا؟''

''ہاں!'' وہ سنبھلا: ''میں آج تاریخ کی اس تابناک داستان کو دہرانے آیا ہوں، جس کا اس وقت میں وارث ہوں...... اور اگر وقت نے مجھ سے وفا نہ کی تو پھر میرے بعد آنے والی نسلیں ان تصویروں میں رنگ بھر لیں گی۔''

''کہنا تو بڑا آسان ہے، لیکن......؟'' سرگوشی نے پھر اپنا سوال دہرایا: ''برخوردار! اپنے ارادوں کو بروئے کار لانے کے لیے تمہارے پاس آخر کون سے ہتھیار ہیں؟''

''وہ ہتھیار۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''......ایک ہتھیار تو میرا جذبہ ایمانی ہے اور دوسرا میرے بازو!'' اس نے ہوا کی لہروں پر اپنا ہاتھ لہرایا: ''میرے جسم کا تازہ اور جوان خون ان مدہم...... مٹتے ہوئے نقوش کو پھر سے اجاگر کر دے گا۔''

......ان کی چمک واپس آ جائے گی!

اور میرے بازو میرے خوابوں کو کبھی شرمندہ نہ ہونے دیں گے!!

اس کی آواز شاید ہوا کے جھونکوں نے سن لی تھی...... جو اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے اور تیزی سے جہاز کے کھلے دروازے میں سے اندر گھس آئے تھے...... کابل کی فضائیں اپنے جانباز سپوت کے لیے دعا گو تھیں۔

جہاز کے ساتھ سیڑھی لگ چکی تھی۔

اسی گزرگاہ سے وہ دوسروں کے ہمراہ اپنے سفر کا آخری مرحلہ طے کرنے لگا۔ مگر، اس کے قدموں نے کابل کی زمین کو چھوا ہی تھا کہ کسی مضبوط اور طاقتور ہاتھ نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے اس کا سوٹ کیس چھین لیا......اور اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی! گردن موڑ کر وہ اس غاصب کا کھوج لگانے ہی لگا تھا کہ......دوسری جانب سے چار مضبوط ہاتھ اس کی طرف لپکے اور انہوں نے اس کے دونوں بازو جکڑ کر، اسے باقی ہجوم سے علیحدہ کر لیا۔

افغان انٹیلی جنس ''خاد'' صبح ہی سے ہوائی اڈے پر اس کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس کی آمد کا شیڈول یہاں پہنچ چکا تھا......اس کے باغیانہ عزائم کی مکمل کہانی سمیت وہ اسے قریباً گھسیٹتے ہوئے ہوائی اڈے ہی پر بنے ایک کمرے میں لے آئے اور یہاں پہنچتے ہی بغیر کچھ کہے سنے اس پر پل پڑے۔

وہ اسے دیوانہ وار وحشیوں کی طرح پیٹ رہے تھے......

پہلے تو فیضان چیختا چلاتا رہا، مگر......آہستہ آہستہ اس کی مدافعت دم توڑنے لگی پھر......پیٹ میں ایک زوردار گھٹنے کی ضرب سے نڈھال ہو گیا! اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز تیزی سے معدے سے حلق کی جانب سفر کر رہی ہے۔

اس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی مگر ضرب اتنی شدید تھی کہ اسے زمین بوس ہونے میں مزید دیر نہ لگی اور وہ دھڑام سے گر گیا۔ اس کے حواس چھن گئے تھے۔

فیضان کو ہوش ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں آیا تھا......!

اس کے سر پر خاصی اونچائی پر ایک طرف بجلی کا بلب روشن تھا! ہوش میں آنے کے بعد فوراً بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کی تمام ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ اس کی نس نس میں درد کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی۔ اس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا! آہستہ آہستہ اس کے اوسان بحال ہونے لگے۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر ایک عسکر اس کی طرف لپکا۔ اور کوٹھڑی کے دروازے کے نزدیک آ کر رک گیا۔

دونوں ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھتے رہے! فیضان نے کچھ کہنا فضول سمجھا۔ وہ جانتا تھا ''یہاں عسکر کی حیثیت ہی کیا ہو سکتی ہے''...... اسے خاموش دیکھ کر عسکر نے ہی ہمت کی۔

''گھبراؤ نہیں! اللہ خیر کرے گا''......

''اللہ خیر کرے گا!''

اس کے منہ سے اللہ کا نام سن کر پہلے تو فیضان نے اس کے اس فقرے کو دہرایا اور پھر......اسے اس پر غصہ آیا'' کہ ایسے وحشی لوگ بھی خدا کا مقدس نام استعمال کرتے ہیں۔''

لیکن......اس کی پوزیشن کے متعلق سوچ کر وہ اس کے متعلق اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات محسوس کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا'' کہ یہ

بیچارہ آخر کس مجبوری کے عالم میں...... یہاں نوکری کر رہا ہے۔ وگرنہ کسی افغانی کی غیرت اسے کسی غیر اسلامی یا غیر اخلاقی نظریے کے سامنے جھکنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بس بے چارے حصول رزق کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے ہیں......!!"

"مجھے پانی پلاؤ۔"

......فیضان کو اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے عسکر کی ہمدردی کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

"ضرور۔ ضرور" کہہ کر وہ چلا گیا۔

☆☆

عسکر کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ خاص طور سے اس کے لیے کچھ درد کش گولیاں چھپا کر لے آیا تھا۔

عسکر کو فیضان کی حالت پر رحم آنے لگا۔ گو یہ اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ ایسے "گمراہ نوجوانوں" کو اکثر "خاد" والے اسی عقوبت خانے میں ان کے دماغ ٹھیک کرنے کے لیے لا کر بند کر دیا کرتے تھے...... پھر ایک ڈیڑھ ماہ بعد یہاں سے انہیں کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جاتا تھا اور...... اس کے بعد ان پر کیا گزرتی؟ اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔

"جلدی سے پانی پی لو...... خدا کے لیے کسی کو یہ نہ بتانا میں نے تمہیں پانی پلایا ہے۔" عسکر نے خوف سے لرزتے ہوئے اس سے درخواست کی۔

"شکریہ" کہہ کر اس نے عسکر کو بغور دیکھا۔ اور منہ دوسری طرف پھیر لیا...... وہ خود بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی عمل دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنے...... گولیاں کھانے کے بعد چند منٹ بعد وہ قدرے پرسکون ہو گیا۔

عسکر اس کے سامنے ہی کھڑا تھا اور فیضان سوچنے لگا: "ایک پٹھان ہونے کے ناطے اس کی ذہنی کیفیت کیوں اس قدر پست ہو گئی ہے!"

وہ اسکی طرف متوجہ ہوا: "بابا! تمہاری غیرت کیا مر گئی ہے۔ تم ایک بزرگ ہو اور اپنی عظیم روایات کو نہیں جانتے؟" وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں یہاں نوکری نہیں کرتا بیٹا! میں تو مصور ہوں۔ یہاں مصوری کر رہا ہوں۔"

"مصوری؟" فیضان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بوڑھا عسکر اسے کوئی فلسفی دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں! میں تصویریں بناتا ہی نہیں کھوجتا بھی ہوں...... اور کچھ تصویریں میرے پاس خود بخود چلی آتی ہیں۔" وہ مدہم ہوتی ہیں ان کے نقوش میں رنگ بھرنے کی ضرورت ہوتی ہے...... تاکہ تاریخ کے اوراق پر ابھرتی صاف دکھائی دے سکیں۔

وہ تھوڑی دیر رکا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا: "تم بھی میری تصویر ہو۔ لیکن تمہارے رنگ پھیکے ہیں۔ ان میں اپنے خون جگر کی رنگینیاں بھی بھروں گا۔" فیضان اس کی ساری گفتگو کا لب لباب جان چکا تھا۔ اس بوڑھے فلسفی مصور نے اس کے اندر جھانک کر اس کے دل کی دنیا کو کھوج لیا تھا۔ شاید اسے ایسی تصویروں کی تلاش رہتی تھی۔

''ذرا یہ بھی تو بتا دیں کہ ان تصویروں سے آپ کیا کیا کام لیتے ہیں؟'' فیضان نے پوچھا۔

''وہ کام! عسکر بولا: ''جس کی تکمیل کیلئے تم نے ماسکو یونیورسٹی کو خیر باد کہا اور...... آج اس بوڑھے عسکر کی مصوری کا امتحان لے رہے ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر فیضان کی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور پھر آہستہ سے کہنے لگا۔ میری یہ تصویریں میدان جنگ کا رخ کرتی ہیں...... میرے عزیز۔ وہ تاریخ کے ان تابناک اوراق کو روشن کرنے کی فکر کرتی ہیں جنہیں وقت کی آندھیوں اور طوفانوں نے بے نور کر دیا ہے...... اور وہ اپنے گرم اور تازہ لہو سے تاریخ کے اس باب میں رنگ بھرتی ہیں۔''

فیضان حیران ہی تو رہ گیا...... وہ جسے معمولی عسکر سمجھتا تھا۔ وہ تو ایک عظیم مصور تھا جو اس کی نشاۃ ثانیہ میں پھر رنگ بھرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن عسکر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک ضابطہ (لیفٹیننٹ) اور تین عسکر اپنی طرف آتے دکھائی پڑے۔ اس کی کوٹھڑی کے نزدیک پہنچ کر تینوں رک گئے...... ضابطہ نے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے فیضان اوغلو پر ایک نظر ڈالی۔ نفرت سے اس نے ہونٹ سیکڑ لیے۔

''ملا بنتے ہو!'' اس نے دانت پیستے ہوئے فیضان کو گالی دی تو فیضان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو......!!

جواب میں اس نے ضابطہ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''باہر نکالو اسے''...... ضابطہ نے چلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے لٹکتی وسل بجا دی...... دیکھتے ہی فیضان کی کوٹھڑی کے سامنے عساکر کا ہجوم اکٹھا ہو گیا...... ضابطہ کے ہمراہیوں میں ایک نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور پانچ چھ عساکر ڈنڈے لہراتے اندر گھس آئے ایک مرتبہ پھر وہ ائر پورٹ والی اذیت ناک صورت حال کا سامنا کر رہا تھا۔

اس مرتبہ وہ جلدی بے ہوش گیا اور اس کی جان چھوٹ گئی۔!

ہوش آیا تو اس کی نظر عسکر پر پڑی، جو...... ایک مصور کے روپ میں کچھ عرصہ قبل اس سے باتیں کرتا رہا تھا! وہ جب اس کوٹھڑی کی سلاخوں کے ساتھ سر جوڑے، اس بات کا منتظر تھا کہ کب...... اس کی تصویر میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئی تو وہ فیضان سے مخاطب ہوا:

''میرے بیٹے! میں تمہارے اس جذبہ حریت کو سلام کرتا ہوں...... اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ایمان کو مزید قوت عطا کرے''

لیکن...... بیٹا!

جہاں میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ ''مادر وطن کو تم ایسے فرزند کبھی کبھار ہی نصیب ہوتے ہیں، وہاں تمہیں میں یہ یاد دلانا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ:...... چاہے تمہارا جسم فولاد ہی میں ڈھالا گیا ہو، آخر وہ کب تک ان ظالموں کی سختیوں کا متحمل ہو سکتا ہے؟

اور پھر ایک دن ایسا آئے گا، جب تمہارے مردہ یا نیم مردہ جسم کو رات کی تاریکیوں میں دریائے کابل کی لہروں کی نذر کر دیا جائے گا۔ دریا کے ان پانیوں کے سپرد کر دیئے جاؤ گے جسکی لہریں تم جسے غیور افغانیوں کے خون سے اب لہو رنگ ہونے لگی ہیں...... لیکن وہ انتظار کر رہی ہیں جب کوئی بندہ مومن آئے گا اور...... ان لہروں کو یہ پیغام دے گا: ''ماضی کی وہ تاریخ، جس کے خدوخال دھندلے پڑ گئے ہیں، آج پھر روشن ہو گئی ہے۔''

وہ تھوڑی دیر کیلئے رکا اور پھر کہنے لگا۔'' اگر...... یہی صورت پیش آئی تو پھر کیا ہوگا؟''

''پھر کیا ہوگا؟''

فیضان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر میں اپنے خدا کے سامنے شرمندہ تو نہ ہوں گا......''

''اور...... وہ مشن؟'' عسکر بولا: ''جس کے لیے تم نے اتنی صعوبتیں اٹھائیں، وہ کیسے پورا ہوگا؟''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک مصور اپنے شاہکار کو اس صورت زمین بوس ہوتے دیکھ سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے نقش و نگار کو یوں آگ میں بھسم ہوتے دیکھنا گوارا کر سکتا ہے اور......

کیا مادر وطن کا ایک فرزند اس طرح بے بسی کی موت قبول کر سکتا ہے۔

''نہیں، ہرگز نہیں'' بوڑھا عسکر خود ہی اپنے سوالوں کا جواب دینے لگا تھا...... وہ بول رہا تھا اور فیضان اپنا دل کرید رہا تھا۔

''کیا اس طرح بے بس ہو کر مر جانا، میرے مشن کی واقعی توہین نہیں ہے؟''

محض جذباتی بن کر اگر میں آج اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا، تو...... کیا یہ میرے ارمانوں کی ایک المناک شکست تصور نہ ہوگا؟

وہ چونکا اس کے دل نے آواز دی: عسکر سچ کہتا ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

وہ عسکر کی طرف دیکھنے لگا...... عسکر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے مدوجزر صاف پڑھ رہا تھا! اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا!

عسکر کی مسکراہٹ سے فیضان کو بڑا حوصلہ ملا۔

''ہاں ہاں! بزرگوار'' ...... وہ تڑپ کر رہ گیا...... ''واقعی میرا مشن ادھورا رہ گیا تو میری روح کو کبھی قرار نہیں ملے گا۔''

''تو بیٹا! مصلحت اختیار کر...... اللہ تعالیٰ تیرا حامی و ناصر ہوگا...... اپنا رویہ بالکل بدل لے۔ ان لوگوں پر یہ ظاہر کر کہ تیرا دماغ وقتی طور

خراب ہو گیا تھا..... اب بالکل ٹھیک ہے۔ تجھے کسی نے ورغلا دیا ہے..... اب تو راہ راست پر آ گیا ہے۔''

اس نے ایک طویل سانس لی.....!

فیضان اپنی کوٹھڑی کی سلاخوں سے لگا اس کی باتیں سن رہا تھا..... عسکر بات کرنے سے پہلے احتیاطاً ارد گرد کا جائزہ ضرور لے لیتا تھا۔

''یہ لوگ فوراً تیرے کہنے میں آ جائیں گے۔ ایسی کئی مثالیں یہاں موجود ہیں تیرے جیسے کئی نوجوانوں نے اسی طرح جان بچائی ہے..... بیٹا! غور سے سن!''

فیضان ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''تجھے تربیت دے کر مجاہدین کے خلاف لڑنے کو بھیجا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تیری نگرانی روسی مشاور بڑی سختی سے کریں گے لیکن تدبر سے انہیں دھوکا دے کر نکل جانا..... کسی بھی سرحدی علاقے سے فرار ہونا تیرے لیے قطعاً مشکل نہیں ہو گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔''

فیضان کے لیے یہ بوڑھا عسکر تائید غیبی بن کر آیا تھا.....!

اس نے وہی کیا جو اس کے رہبر نے بتایا تھا..... اگلے ہی روز اس کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی تفتیشی ٹیم کا رویہ بدلنے لگا.....!!

☆☆

دو ماہ تک وہ لوگ فیضان کا جائزہ لیتے رہے۔ لیکن اس نے اپنی کسی حرکت سے انہیں شک میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ دو ماہ بعد پل چرخی جیل سے ''خاد'' کے ہیڈ کوارٹر میں یہ پیغام پہنچا دیا گیا کہ فیضان اونغلو راہ راست پر آ گیا ہے۔!!

اس پیغام کے دوسرے ہی روز جیل کے ایک الگ تھلگ کمرے میں اس کی ملاقات جگرون ارخان سے ہوئی۔ ''خاد'' کے میجر ارخان نے اسے پیش کش کی تھی! کہ اگر وہ فوج میں بھرتی ہو کر مجاہدین کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جائے تو اس کی چھینی ہوئی خوشیاں واپس لوٹا دی جائیں گی۔ بصورت دیگر اس جیل سے رات کے اندھیرے میں اس کی لاش باہر نکلے گی اور اسے دریا برد کر دیا جائے گا۔''

فیضان جانتا تھا کہ جگرون ارخان جو کہہ رہا ہے وہ خالی خولی دھمکی نہیں۔ واقعی ''مشاوروں'' کی آمد کے بعد سے حکومت کا انقلاب کے بارے میں رویہ بہت سخت ہو گیا تھا اور یہ بات بھی کابل کے گلی کوچوں میں عام طور پر کہی اور سنی جانے لگی تھی کہ ایک مرتبہ پل چرخی جا کر زندہ واپس لوٹ آنا معجزے سے کم والی بات نہیں۔

کابل کے اکثر باشندوں نے رات کے اندھیرے میں کرفیو کے اوقات میں اس جیل سے پراسرار ٹرک برآمد ہوتے اور انہیں دریائے کابل پر پہنچ کر اپنے بوجھ گراتے دیکھا تھا لوگ جانتے تھے'' کہ ان ٹرکوں میں ان بے بس، بے گناہ، مظلوم اور غیور افغانوں کی لاشیں جاتی ہیں جو تشدد کی تاب نہ لا کر اپنی جان جان آفریں کو سونپ دیتے ہیں، لیکن اپنی غیرت کا سودا نہیں کرتے۔''

فیضان اونغلو بے غیرت نہیں تھا.....!!

لیکن پل چرخی جیل سے نکلنے کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہ جذبات کے بجائے عقل استعمال کرتا...... اور اس نے ایسا ہی کیا۔

فیضان اوغلو نے خاد کے جگرن ارخان کی بات تسلیم کر لی اور فوج میں شمولیت پر رضامندی ظاہر کر دی۔

فیضان کو وہ لوگ پل چرخی سے اب کابل میں لے آئے تھے۔ یہاں آ کر اسے ایک مرتبہ پھر ایک انکوائری بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑا...... اسے اپنے بوڑھے عسکر راہنما کی ہدایت ازبر تھی......

دشمن نے اس کی قوم کو پھانسنے کے لیے جو جال پھیلایا تھا اس میں کابل کی جدید آبادی کے لوگ آہستہ آہستہ پھنستے چلے جا رہے تھے...... اور اسے اپنے لوگوں کو اس جال سے نکالنا تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔

فیضان نے انکوائری کمیٹی کے سامنے عذر پیش کیا کہ اس سے جو کچھ بھی ہوا، نادانستگی میں ہوا اور اب وہ اپنے گزشتہ طرز عمل پر بہت شرمند ہے، آئندہ کبھی "بورژوائی" خیالات اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکیں گے۔

اسے یہاں سے کابل چھاؤنی منتقل کر دیا گیا......

کابل چھاؤنی سے ٹریننگ اکیڈمی جہاں محض چھ ماہ کی تربیت کے بعد ہی وہ "ضابط" بن گیا۔

اپنے فوجی تربیتی مرکز میں اسے بمشکل کوئی ایسا کیڈٹ ملا تھا جو اپنی مرضی سے فوج میں آیا ہو...... ورنہ تو سب ہی وہ لوگ تھے جنہیں زبردستی فوج میں شامل کیا گیا تھا۔

کبھی کبھی جب وہ اپنی موجودہ صورتحال پر غور کرتا تو اسے قدرے الجھن بھی ہوتی لیکن اس کا پر اسرار محسن مصور کے روپ میں ہمیشہ اس کے سامنے موجود رہا۔

جب کبھی کوئی بغاوت کی چنگاری فیضان کے دل میں سلگی...... فوراً بوڑھے مصور نے اس کے لاشعور سے نکل کر اس چنگاری کو دلائل کی آگ سے ٹھنڈا کر دیا۔

وہ شاید نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بنائی ہوئی کسی بھی تصویر کے رنگ پھیکے پڑیں۔ اس نے بہر حال اپنی اس "عظیم ڈیوٹی" کے لیے اپنے خدا کے حضور جواب دہ بھی تو ہونا تھا......!

☆☆

بالآخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب اس کو "پاس آؤٹ" ہونا تھا......! کابل فوجی چھاؤنی میں ایک تقریب منعقد کی گئی تھی......

شہر کے روسا، بزعم خویش، ترقی پسند معاشرے کے کرتا دھرتا غیر ملکی سفیر...... اور حکام سب ہی یہاں موجود تھے۔ نئے تیار ہونے والے ضابط، قطار باندھے کھڑے تھے۔ پھر روایتی سلامی دی گئی......

کیڈٹوں نے مارچ پاسٹ کیا۔

اور وہ جونیئر ضابط بن کر محاذ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس ہجوم کے ایک کونے میں وہ بوڑھا عسکر بھی موجود تھا...... اس کی بوڑھی چمکیلی آنکھیں بڑی بے چینی سے اپنی بنائی ہوئی تصویر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

کہیں کوئی رنگ پھیکا تو نہیں پڑگیا؟ بار بار یہی سوال وہ خود سے کر رہا تھا۔

پھر جب اس نے فیضان اوغلو کو وردی پہنے اپنے سامنے موجود چبوترے کے نزدیک سے سلامی دے کر گزرتے دیکھا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔

''خدایا! اپنے اس کمزور بندے کو اتنی طاقت نصیب کر کہ یہ اپنے عظیم مشن کو پورا کر سکے۔'' ایک دعا اس کے دل سے فیضان کے لیے نکلی اور وہ ہجوم سے چپ چاپ باہر نکل آیا۔

شعلہ اور شبنم

پاسنگ آؤٹ پریڈ سے فراغت کے بعد انہیں کابل چھاؤنی بھیج دیا گیا!

چھاؤنی پر سرد موت کہرے کی طرح جمی ہوئی تھی۔ دن میں تو معمول کی مصروفیت جاری رہتی، لیکن شام ڈھلتے ہی پچھم سے پورب کی طرف ایک پراسرار یخ بستہ ہوا سرسرانے لگتی اور پھر ہوا کے پیٹ میں اندھیرا کچھوے کی طرف رینگنے لگتا۔

بالآخر اسے میدان کارزار کی طرف روانہ کر دیا گیا......!

آج وہ کابل سے لوگر جا رہا تھا۔ اس کی کمپنی کے سب ہی لوگ کنوائے کی شکل میں پہاڑوں کے درمیان بنی سڑک پر چل رہے تھے۔

راستہ صاف کرنے کے لیے سڑک سے ملحقہ پہاڑیوں پر پہلے ہی سے مورچہ بندیاں کر لی گئی تھیں۔ تاکہ مجاہدین اچانک حملہ نہ کر سکیں...... کنوائے کی حفاظت کے لیے دو ہیلی کاپٹر بھی ان کے آگے آگے اڑ رہے تھے۔

فیضان جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی جیپ ایک ڈھلتی عمر کا برف جیسے منجمد چہرے والا افغانی عسکر چلا رہا تھا...... اس کی نظریں ونڈ سکرین کے سامنے والے راستے پر جمی تھیں۔

کبھی یہ راہ گزر شجاعتوں، جانثاریوں کی پیامبر رہی تھی! خلوص اور مہر وفا کے سجدوں کی جگمگاہٹ ان راستوں کا امتیازی نشان تھی کئی راہ گم کردہ قافلوں کی راہبر بنا کرتی تھی لیکن آج اس پر موت کی سرخ آندھی نے اپنے سحر پھونک کر اسے اپنے خونی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ پر جلال، پر ہیبت اور پر شکوہ سربلند پہاڑوں کے وسیع و عریض سلسلے اس کے دونوں اطراف پھیلتے چلے جا رہے تھے...... جن پر لگے درختوں کی شاخیں آلوچوں، چناروں اور خوبانیوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ ان درختوں سے پھوٹنے والی خوشبو نے فضا کو بھی مسحور کر رکھا تھا، لیکن......:

چناروں کی اس خوشبو کے ساتھ ساتھ فیضان کو اب ان جلالت مآب پہاڑیوں کی کوکھ میں ان شیر خوار پھولوں کے گرم کچے لہو کی مہک بھی محسوس ہو رہی تھی جنہیں شکم مادر سے چھین کر غاصبوں نے اپنی خونی زبانوں سے چاٹ لیا تھا۔

پہاڑ کے دامنوں کی وسعت میں حد نظر تک سرخ چناروں اور آلوچوں کے درختوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا...... چناروں کے یہی درخت اب شہادت کے استعارے بن گئے تھے۔ فیضان کو یوں لگ رہا تھا جیسے ان پہاڑوں پر جہاں جہاں بھی غیور افغانوں کے جسموں سے خون کے قطرے ٹپکے تھے وہیں چنار کے پیڑوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ اسے ان لہو رنگ چناروں میں شہیدوں کے بدن کی وہ آگ دہکتی دکھائی دے رہی تھی جس نے استعماریت کے عزائم پر اپنا لہو نچوڑ کر اسے سرد کرنے کی کوشش کی تھیں۔

پہاڑی راستہ اب چکر کھا کر اونچا ہونے لگا تھا۔ کھڑکی سے نیچے اس نے نگاہ ڈالی۔ سورج کی سنہری کرنوں نے پہاڑیوں کے دامن میں

سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے رینگنے والے پہاڑی چشمے کو لکیر کی شکل میں بدل کر ان پر آتشیں رقص شروع کر دیا تھا......

پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پہاڑوں کی یہ وسعت اس کے جذبوں کے سامنے سمٹنے لگی ہو۔ ہوا کی خنکی جو اس کے جذبوں کے دہکتے آتش کدے پر برف بن کر برس رہی تھی۔ اس کے جذبات کو سرد کرنے کی بجائے ان کی گرمی کو دو چند کرنے لگی۔

اس کی رگوں میں اچانک ہی خون کی جگہ سیال آتش گیر مادہ رینگنے لگا۔

پہاڑوں کو ڈھانپنے والے سبزے نے اس کے جذبات میں آگ لگا دی۔

آگے آگے جانے والے ہیلی کاپٹر سے اشارہ ملنے پر سارا کنوائے رک گیا...... شاید پائلٹ کو کوئی شک گزرا تھا اور اب اس کی تصدیق تک ان لوگوں کو یہیں رکنا تھا۔

فیضان جیپ سے باہر نکل آیا۔ سامنے پہاڑ کی کوکھ میں اسے ایک چوٹی پر مٹی سے بنے ہوئے چند مکانات دکھائی دیے۔ ان مکانات سے رسی کی طرف بل کھاتا ایک پتھریلا راستہ اس طرف آ رہا تھا۔

اس کی جیپ سے کچھ فاصلے پر ایک چشمہ بہہ رہا تھا!

فیضان سمجھ گیا کہ رسی کی طرح بل کھاتے راستے سے اس طرف آنے والے بچے اور عورتیں پانی لینے آ رہی ہیں...... اس کی نگاہیں اسی راستے پر جم کر رہ گئیں۔

پانچ چھ بچے اور دو تین عورتیں اس طرف آ رہی تھیں...... کنوائے پر نظر پڑتے ہی وہ سب لوگ سہم کر ایک دم رک گئے...... پھر کچھ سوچ کر عورتیں تو وہاں رک گئیں اور بچے ان کی طرف آنے لگے...... فیضان کی نظریں ان کے دہکتے سرخ و سپید لیکن قدرے خوفزدہ چہروں پر جمی تھیں...... درماندگی ان کے چہروں پر نوحہ الاپ رہی تھی...... بچے چلتے ہوئے ان کے قریب سے گزر گئے۔ فیضان کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا...... پہاڑوں کی چوٹی ان بچوں کی حالت پر غمگین تھی۔

ہر پتھر حزیں تھا۔

سرسراتی ہوا اب نوحہ الاپنے لگی تھی......

بچوں نے چپ چاپ اپنے برتن پانی سے بھرے اور پتھروں پر مضبوط قدم دھرتے جس راستے سے آئے تھے اسی راستے پر واپس لوٹ گئے۔

کنوائے کو چلنے کا اشارہ مل گیا تھا......!!

سورج جس نے سہم کر اپنا منہ آسمان میں چھپا رکھا تھا۔ ان بچوں کے جذبہ حریت کو سلام کرنے آسمان کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

کنوائے ایک مرتبہ پھر بل کھاتی سنگلاخ سڑک پر رینگنے لگا...... سورج نے خود ننگا ہو کر پہاروں کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

خوبانیوں کے درختوں کے پتوں پر ٹکے شبنم کے قطرے مقدس آنسوؤں کی صورت زمین پر ٹپکنے لگے تھے۔

چڑھائی کے بعد اب وہ اترائی کی طرف گامزن تھا..... راستہ بڑا پیچیدہ اور ٹیڑھا میڑھا تھا..... لیکن کنوائے بڑے اطمینان سے کچھوے کی چال اس راہ گزر پر رینگتا ہوا ''لوگر'' کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فیضان سوچ رہا تھا.....!

یہی راہ گزر تھی جس پر کبھی غزنوی اور غوری کے جانباز قافلے سفر کرتے ہوئے خیبر کی طرف جایا کرتے تھے..... پہاڑوں کی انہی چوٹیوں نے کبھی غازیاں صف شکن کے وہ پر جلال چہرے بھی دیکھے ہوں گے جن پر ایمان وعزم کی تابناکیاں جگمگایا کرتی تھیں۔ مگر آج وہ اس راہ گزر پر شرمندہ شرمندہ اور سر جھکائے اپنے حالات پر نوحہ کناستم رسیدہ انہیں قافلوں کی اولاد کے وہ چہرے دیکھ رہا تھا جن پر بدبختی کی ایک طویل داستان رقم تھی۔ پہاڑی راستہ اب اسے بہت نیچے لے آیا تھا

دھوپ نکھرنے لگی تھی..... فطرت کی گود میں بیٹھ کر سفر کرتے مسافر کو قدرے روحانی اور جسمانی سکون کا احساس ہونے لگا..... بلند و بالا پہاڑوں کے اوپر کھلا نیلا آسمان اور نکھری نکھری دھوپ ٹھٹھرے ہوئے جسموں کے لیے آغوش مادر کا کام کر رہی تھی.....!!

بلندی سے نیچے آنے والی چمکتے پانی کی لکیر جو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی پھر یکدم ان کے سامنے آ گئی..... پتھروں سے لڑتا جھگڑتا اور جھاگ اڑاتا تیز رفتار پانی پورے جوش و خروش کے ساتھ حالات کے دھارے پر بہتا چلا جا رہا تھا۔

پہاڑوں پر رسیلے پھلدار درختوں کا سلسلہ اب ختم ہونے لگا تھا..... وہ جوں جوں لوگوں کے نزدیک آ رہے تھے..... پہاڑوں کی ہیئت بدلنے لگی تھی: فیضان کو بمباری سے جلے ہوئے درخت اور پہاڑوں کا خاک شدہ سبزہ بخوبی دکھائی دینے لگا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے پامیرے کوہ سفید تک..... کہساروں کی ساری ہریالی اور سبزے نے اچانک آگ پکڑ لی ہو..... کہسار جل رہے تھے.....!!

افغانستان جل رہا تھا.....!!

اور پہاڑوں کی یہی آگ آخر الاؤ بن کر فیضان کے دل میں دہکنے لگی تھی۔ انہی جذبوں کے دوش پر وہ سفر کرتا بالآخر لوگر چھاؤنی میں داخل ہو گیا۔

''لوگر'' میں ان کا قیام دو ماہ تک رہا، پھر انہیں ہوائی جہازوں کے ذریعے ''خوست'' روانہ کر دیا گیا..... خوست ولایت پکتیا کی چھاؤنی تھی جسے دو سال سے مجاہدین نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

☆☆

خوست پہنچنے پر ایک سرد چہرے اور بھنچے ہوئے جبڑوں والے روسی کرنل نے ان کا خیر مقدم کیا۔ رات کو آفیسرز میس میں انہیں معمول کے مطابق افغان مجاہدین کے خلاف پروپیگنڈہ مقاصد کے لیے بنائی جانے والی فلمیں دکھائی گئیں۔ ان فلموں میں مجاہدین کو وحشیوں اور درندوں کے روپ میں دکھایا گیا تھا اور یہ ثابت کیا گیا تھا۔ یہ وحشیوں کا ٹولہ غیر ملکی طاقتوں کے اشارے پر ''عظیم انقلاب'' کو سبوتاژ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

اگلے روز "دربار عام" میں ایک افغان کرنل نے ان سے خطاب کیا۔ مجاہدین کے خلاف بڑی دھواں دھا تقریر کرنے کے بعد اس نے پاکستان، چین، امریکہ اور دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک کو گالیاں دیتے ہوئے عساکر کو بتایا کہ یہ ممالک افغانستان کو پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتے......اور مجاہدین ان کے اشارے پر ان کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔

اسی دربار میں اسے بتایا گیا کہ یہاں سے دس پندرہ میل کے فاصلے پر مجاہدین کا مضبوط ترین مرکز "ژاور" موجود ہے۔ اس مرکز سے ولایت پکتیا اور کابل تک مجاہدین کا رابطہ ہے غزنی، پغمان اور نزدیکی تمام ولایتوں میں سرگرم جہاد مجاہدین کے لیے "ژاور" سپلائی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے......ان لوگوں نے اس مرکز کو تباہ کر کے مجاہدین کی کمر توڑنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

اس کے لیے بڑا زبردست منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ افغان فوج نے اپنے کمانڈوز کو مجاہدین کے مورچوں کے گرد پھیلی اونچی پہاڑیوں پر اتارنا تھا......اس کے لیے...... پہلے افغان فضائیہ اور بھاری توپ خانے کے ذریعے تباہ کن بمباری کا پروگرام بنایا گیا تھا تا کہ مجاہدین کے مورچے تباہ کئے جا سکیں۔

کمانڈوز کے اترنے کے ساتھ ہی پیدل فوج نے خوست سے "ژاور" کی طرف ایڈوانس کرنا تھا ژاور اور مرکز پر قابض ہو کر اسے تباہ کرنا اور یہاں اپنی مورچہ بندیاں قائم کرنی تھیں تا کہ مستقبل میں ہمیشہ کے لیے اس خطرے سے نجات حاصل کر لی جائے۔

حفاظتی اقدامات کے پیش نظر ابھی عساکر کو حملے کی حتمی تاریخ سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا...... کیونکہ روسی اور افغان حکام جانتے تھے کہ ان میں مجاہدین کے بہت سے جاسوس موجود ہیں...... اگر نہ بھی ہوں تو کوئی عسکر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں سے نکلے گا اور مجاہدین تک حملے کی اطلاع پہنچا آئے گا۔

ایسا تجربہ انہیں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا......!!

اس کے باوجود فیضان جانتا تھا کہ اگلے ہفتے میں کسی بھی وقت یہ حملہ متوقع ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پر لگا کر اڑ جائے اور "ژاور" میں مجاہدین تک یہ اطلاع پہنچا آئے۔

اگلی رات جب وہ میس سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو اچانک ہی ایک تیز رفتار جیپ کو اس نے اپنی طرف آتے دیکھا۔

ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور جیپ کا ڈرائیو اسے انتہائی رفتار سے چلاتا ہوا اس طرف لا رہا تھا...... فیضان کے نزدیک پہنچ کر اس کے بریک زوردار آواز سے چرچرائے اور جیپ رک گئی۔

اگلی سیٹ پر ایک روسی میجر بیٹھا تھا...... جیپ کا ڈرائیور بھی روسی فوجی تھا پچھلی نشست پر ان لوگوں نے ایک عسکر کو دو افغان فوجیوں کی گرفت میں بٹھایا ہوا تھا۔ اس عسکر کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے تھے اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ضابطہ فیضان اونچل تھم گیا یہ اس کی یونٹ کا عسکر تھا......!!

میجر اتر کر باہر آ گیا...... اس کے کندھوں پر نظر پڑتے ہی فیضان کی دونوں ایڑیاں بج اٹھیں

''اپنی کمپنی کو ''فال ان کرلو''......

روسی میجر نے اسے حکم دیا۔

ضابط فیضان اوغلو نے دوبارہ ایڑیاں بجائیں اور واپس بیرکوں کی طرف گھوم گیا۔ بمشکل پانچ منٹ بعد ہی اس کی کمپنی کے جوان وہاں ''فال ان'' تھے۔ پانچ عسکر گنتی میں کم تھے......!!

''کہاں گئے یہ لوگ'' میجر نے درشت لہجے میں ضابط فیضان اوغلو سے پوچھا۔

''یہ میری ڈیوٹی نہیں کہ ان کی مصروفیت کا پتہ لگاتا پھروں''...... فیضان کے ضبط کا یارا ختم ہوتا جا رہا تھا۔

''شٹ اپ......'' روسی میجر غرایا......

''یہ لوگ فرار ہو چکے ہیں۔'' اس نے گلا پھاڑتے ہوئے فیضان کو مخاطب کیا۔

''یہ بھی ان کا ساتھی تھا''............

اس نے تو گرفتار کی طرف اشارہ کیا۔ جسے اب اس کے حکم پر جیپ سے باہر لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

جیپ کے یہاں پہنچتے ہی روسی فوجیوں کا ایک سیکشن اپنی بارک سے نکل کر وہاں اس یونٹ کے ساتھ ہی آ کر ''فال ان'' ہو گیا تھا۔ روسی میجر نے ان کی طرف دیکھا۔

اس کا اشارہ سمجھ کر دو روسی فوجی اس کے نزدیک آ کر کھڑے ہو گئے۔

''اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹاؤ''............ اس نے حکم دیا۔

عسکر کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ خوف سے عسکر کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔

''کس راستے سے گئے ہیں وہ لوگ''............ اس نے بڑی شُستہ فارسی میں عسکر کو مخاطب کیا۔

''کون لوگ؟''............ فیضان نے محسوس کیا جیسے اچانک ہی عسکر کی آنکھوں میں زندگی واپس لوٹ آئی ہو۔

''بتاؤ اسے............ اس نے دونوں روسی فوجیوں کو مخاطب کیا۔

دونوں نے ایک ساتھ زوردار ٹھوکریں اس کی پسلیوں میں رسید کیں۔ عسکر درد کی شدت سے بلبلا اٹھا لیکن اس نے اپنی زبان نہ کھولی............ دونوں روسی اسے وحشیوں کی طرح دیوانہ وار پیٹنے لگے۔ اب میجر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

دس منٹ بعد ہی عسکر قریباً نیم جان ہو کر گر پڑا لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کے فرار کے راستے کا انکشاف نہ کیا۔

نیم بے ہوش غیور افغان پر جھک کر روسی میجر نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے اس کے بالوں کو زوردار جھٹکے دیتے ہوئے میجر نے متعدد مرتبہ اپنا سوال دہرایا............ آخری مرتبہ عسکر نے زور سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

روسی میجر تن کر کھڑا ہو گیا!

اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اپنے دائیں ہاتھ کھڑے روسی فوجی سے اس نے کلاشنکوف پکڑ لی اور دوسرے ہی لمحے وہ گالیاں بکتا ہوا دیوانہ وار غیور افغان پر گولیاں چلا رہا تھا۔

پوری میگزین اس نے افغان زادے پر خالی کر دی..........!!

افغان فوجیوں کی یونٹ پر موت کی طرح بے رحم سکوت طاری تھا۔ غم و غصے سے ان کی حالت غیر ہو رہی لیکن وہ جانتے تھے کہ کوئی بھی غیر احتیاطی قدم ان کو بھی اس انجام سے دوچار کر سکتا ہے۔

''اباؤٹ ٹرن'' .... کے حکم پر پوری کمپنی اپنے پاؤں پر گھوم گئی۔ انہیں بیرک میں واپس جانے کا حکم مل چکا تھا۔

روسی سیکشن ابھی تک وہاں موجود تھا۔ افغانوں کے واپس جاتے ہی ان لوگوں نے مردہ عسکر کی لاش کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا.........لاش کی بے حرمتی کرتے وہ اسی طرح اسے قلعے کے دروازے تک لے آئے۔ پھر باہر کوڑا کرکٹ پر پھینک دیا۔

☆☆

یہ یہاں کا معمول تھا..........

کسی بھی بھگوڑے عسکر کو گرفتاری پر اسی انجام سے دوچار ہونا پڑتا تھا.........افغان فوج میں فرار ہونے کی کم از کم سزا موت تھی۔

میس کی طرف واپس لوٹتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے اپنے دلی جذبات پر قابو پایا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ قلعے کی چوٹی پر نصب تمام مشین گنوں کا رخ ان روسی سپاہیوں کی بیرک کی طرف موڑے لیکن ابھی اسے مصلحتاً خاموشی اختیار کرنا تھی۔ ''وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس بدقسمت افغان عسکر کی طرح وہ بھی اسی بے بسی کی موت سے دوچار ہو۔''

بوڑھے مصور نے اسے زندگی کے جس اسلوب سے آگاہ کیا تھا وہ راستہ ہی دراصل اسے اپنی منزل کی طرف لے جا سکتا تھا۔

بوجھل قدموں سے چلتا وہ اپنے کمرے تک آیا اور بے دم سا ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ اس نے اپنی وردی تبدیل کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ دروازے کو اس نے اندر سے کنڈی لگا دی اور لوہے کی چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگا کر لیٹ رہا۔

اس کی ہزار کوششوں پر بھی دم توڑتے افغان عسکر کا لہولہان چہرہ اور روسی میجر بھیڑیے کی طرح دہکتی آنکھیں اس کے سامنے سے الگ نہیں ہو رہی تھیں.........وہ چاہتا تھا کہ آج کے حادثے کو بھلا دے لیکن جب بھی وہ اپنی سوچوں کا دھارا کسی اور سمت موڑنے کی کوشش کرتا شہید افغان عسکر کی لاش اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر تڑپنے لگتی: کئی سوال اس کے چہرے پر جنم لیتے اور فیضان کی طرف جواب کے طالب ہوتے لیکن فیضان کے پاس شہید کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا.........

اور آخر کار.........کسی نہ کسی طرح اسے اونگھ سی آ ہی گئی۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے کسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی ہو..........

اس نے چاہا کہ اٹھ کر دروازہ کھول دے لیکن اس کے جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا.........فیضان کو اپنا جسم بالکل بے جان محسوس

ہونے لگا تھا۔

پھر دروازہ خود بخود آہستگی سے کھل گیا۔

فیضان حیران رہ گیا اس نے سوچا: ''میں نے تو دروازے کو اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ پھر وہ کیسے کھل گیا؟''

اندر آنے والے کے نقوش اندھیرے کی وجہ سے ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہوئے تھے لیکن فیضان نے اندازہ لگا لیا: ''کہ یہ تو کوئی عورت ہے۔''

اس نے دروازہ بند کر کے جیسے ہی فیضان کی طرف دیکھا حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں: یہ ویلنٹینا تھی۔

''ویلنٹینا تم''...... بمشکل اس کے منہ سے نکلا...... خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اس کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا تھا۔

''ہاں فیضان میں......''

ویلنٹینا نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''لیکن تم تو مر چکی تھی......''

فیضان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ہاں فیضان میں مر چکی ہوں لیکن میری روح تمہارے ساتھ ساتھ بھٹک رہی ہے۔ جب تک تمہیں اپنی منزل کی طرف گامزن نہ دیکھ لوں میری روح کو قرار نہیں آئے گا۔''

اس سے پہلے کہ فیضان کچھ کہتا اس نے اپنا مرمریں ہاتھ فیضان کی طرف بڑھا دیا۔

''فیضان! میں نے کہا تھا ناں کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں میں رہا کروں گی۔ میں تمہاری بھیڑیں چرایا کروں گی!! یقین مانو...... مجھے تمہاری چراگاہوں، پہاڑوں اور پہاڑوں کے دامن سے جنم لیتی زندگی یہاں سے کہیں جانے نہیں دیتی۔ آؤ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔''

فیضان نے کسی معمول کی طرح اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا، پلک جھپکتے ہی وہ دونوں کابل کے ایک خوبصورت مرغزار میں کھڑے تھے! وہ حیران رہ گیا یہ تو وہی جگہ تھی جہاں سے ''لوگر'' کی طرف جاتے ہوئے اس کا کنوائے گزرا تھا۔

ماحول کے حسن کو ویلنٹینا کی موجودگی نے چار چاند لگا دیے تھے...... فیضان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہونٹوں پر ایک صحرا بچھ گیا ہو۔ اور یہ پیاس اب اس کے سارے بدن میں اترنے لگی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ویلنٹینا شبنم کی طرح اس پر برسے اور اس کی تشنگی کو موت کی نیند سلا دے...... لیکن وہ اپنی اس خواہش کا اظہار ویلنٹینا پر نہ کر سکا۔

دونوں خوبانی کی خوشبو سے لدے ایک پودے کے نزدیک پتھریلی زمین پر بیٹھ گئے۔ فیضان کو یوں لگا جیسے اس کے گرداگرد پھیلے پھلوں اور پھولوں سے لدے ان کہساروں نے اس سے کچھ کہا ہو۔ کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ہو۔ پھر آواز اسے بڑی واضح سنائی دینے لگی۔

''فیضان! اگر تم یوں ہی زندہ رہے تو آنے والا سہانا موسم تمہاری بے بسی کا مذاق اڑائے گا۔ شبنم سے بھیگی ہوائیں تمہارے آنسوؤں پر طنز

کریں گی۔ ویلنٹینا کی پاکیزہ محبت کی دلفگار یادیں تمہاری زندگی میں نفرتوں کا زہر گھول دیں گی۔ اگر تم نے بہت جلد اپنے مقصد عظیم کو لبیک نہ کہا تو دوریاں عذاب بن کر تم پر مسلط ہو جائیں گی۔"

آواز خاموش ہو گئی تو سوچنے لگا:

"کیا بوڑھے مصور کو رات کے اس حصے میں بھی چین نہیں آ رہا۔"

وہ سہم کر ویلنٹینا کی طرف دیکھنے لگا جس کی ساحرانہ آنکھیں ابھی تک فیضان پر گڑی ہوئی تھیں..........

وہ فیضان کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی مسکراتا ہوا خواب ہو یا پھر ان فلک بوس پہاڑوں کے اوپر فضائے بسیط میں مینہ کی بوندوں سے بوجھل کوئی بادل کا ٹکڑا.......... جو برس کر اس کے اندر دہکتے نفرتوں کے الاؤ کو ٹھنڈا کر دے گا:

"فیضان!"

اسے ویلنٹینا کی مدھ بھری آواز سنائی دی.......... "میں تمہیں مبارکباد دینے آئی ہوں فیضان! تمہارے مقدس سفر کے آغاز کی مبارکباد.......... اس سفر کی!! جس پر تمہارے روانہ ہونے کا، جانے میں کتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔"

فیضان نے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا..........

خوبانی کے پودے سے اچانک ہی شبنم کے بے شمار قطرے مینہ کی شکل میں اس کے ہاتھ پر گرے، اس نے چاہا اپنا گیلا ہاتھ صاف کر لے مگر جیسے ہی اس نے ہاتھ الگ کیا۔ ویلنٹینا فضاؤں میں گھل گئی۔

"ویلنٹینا! ویلنٹینا!!" وہ بے قرار ہو کر تڑپا..........

لیکن، اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی!

کھڑے ہو کر اس نے چاروں سمت نظریں دوڑائیں، مگر ویلنٹینا کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا.......... خوشبو کی طرح رعنائیاں بچھا کر وہ کہیں اوجھل ہو گئی تھی! اس نے اپنا سر جھکا لیا اور گہری سوچوں میں گم ہو گیا۔

.... کہ اچانک اسے اپنے کندھے پر کسی دست شفقت کا احساس ہوا! اس نے گھوم کر دیکھا!.......... بوڑھا مصور اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

بیٹا! یہ لو خوبانی کا چھوٹا سا پھول، جو میں راستے سے تمہارے لئے توڑ لایا ہوں، دیکھو شبنم کے قطرے اس پر جگمگاتے کتنے بھلے محسوس ہوتے ہیں؟"

"شبنم کے قطرے؟"

فیضان حیران ہو کر مصور کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"بیٹا! شبنم تو بکھرنے کے لئے ہوتی ہے، لیکن میرے بچے تم تو شعلہ ہو۔"

..........شعلہ! برق تپاں جو کبھی یہاں تڑپتا ہے کبھی وہاں چمکتا ہے۔

..........اسے سکون نہیں! لیکن سکون اس کے نصیب میں کہاں۔

"یہ چیز اسے کب میسر آتی ہے بابا؟"

فیضان بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا وہ کہہ رہا تھا:

"بیٹا جب چاروں طرف آگ برس رہی ہو گی تو لوگ جہاد جہاد پکارتے اس آگ میں کود پڑیں گے اور یقیناً اس وادی میں داخل ہو جائیں گے جہاں خوبانیوں کے پودوں پر شبنم گرتی ہے اور کبھی نہیں پگھلتی۔

"کبھی نہیں پگھلتی بابا؟"

فیضان بوڑھے مصور کی طرف دیکھنے لگا جو دروازے کے باہر جا رہا تھا، البتہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"بیٹا! وہ ایسی وادی ہے جہاں تمہیں بھی دائمی سکون نصیب ہو گا۔"

..........ظلم اور جبر سے ہمیشہ کے لئے نجات بھی مل جائے گی اور

..........جہاں تمہاری خواہشات کبھی تشنہ تکمیل نہ رہیں گی۔

بوڑھا مصور چلا گیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے.......... حد نگاہ تک انہیں سرخ چناروں کا سلسلہ ابھرنا شروع ہو گیا جنہوں نے غیور افغانوں کے جسموں سے خون چوس کر پرورش پائی تھی اور جواب.......... سر اٹھا کر بڑی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

الجہاد

اچانک اسے یوں لگا جیسے دروازہ دوبارہ کسی نے آہستگی سے کھٹکھٹایا ہو پھر کوئی دبے قدموں اندر چلا آیا.......... آنے والا ہیولے کی شکل میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے نقوش واضح نہیں تھے لیکن فیضان بخوبی اندازہ کرسکتا تھا کہ یہ کون ہے..........؟

پھر ہیولا بھی غائب ہو گیا..........! جیسے اس کی اگلی منزل کی نشاندہی کے لئے وہ یہاں آیا ہو۔

فیضان کو یوں لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہو۔

سرگوشیاں اب نمایاں ہونے لگی تھیں۔

پھر ایک واضح آواز سے ہر طرف گونج سنائی دی۔

''الجہاد! الجہاد! الجہاد! الجہاد!..........''

آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

چھاؤنی کے باہر خوست شہر کی مسجد کے سپیکر سے اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اس نے برف جیسے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور کمرے کے ایک کونے ہی میں مصلہ بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی۔

نماز یہاں لوگ انفرادی طور پر ہی ادا کرتے تھے کیونکہ نمازی کو روسی اور ترقی یافتہ ماسکو نواز افغان آفیسر اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔

نماز کے اختتام پر جب اس کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے تو جیسے اچانک ہی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں.......... جانے کب سے یہ آنسو اس کے اندر منجمد ہو رہے تھے جو اب اس کے جذبات کی تپش سے پگھل گئے تھے۔

''خدایا!''.......... اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا.......... آج کی رات کو یہاں میری آخری رات بنا دینا.......... الٰہی! میں تیرا ناکس وناتواں بندہ آج تیرے در پر دامن پھیلائے تیرے حضور دست سوال دراز کرتا ہوں۔''

''اے مولائے کل! مجھے ہمت عطا کر.......... مجھے توفیق دے کہ میں جو عزم لے کر ماسکو سے یہاں آیا تھا اس پر پورا اتر سکوں.......... میرے مالک! مجھے استقامت اور پامردی عطا کر.......... میرے لئے تنگ راہیں کشادہ کر دے.......... میرے مولا! میری راہیں بھی آسان فرما.......... مجھے ہمت دے کہ میں.......... کہ میں.......... ''اس کا گلا رندھ گیا۔ آنسو اس کے اندر بھی گرنے لگے تھے۔ اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی.......... اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بیقرار ہو کر وہ سجدہ ریز ہو گیا۔

اس کے آنسوؤں سے مصلے بھیگنے لگا تھا.............پھر جیسے یکا یک اس کے آنسو تھم گئے۔ اسے اپنا وجود بڑا ہلکا پھلکا دکھائی پڑنے لگا۔ جیسے اس کے سر پر لدا منوں بوجھ کسی نے بڑی آہستگی سے اتار کر نیچے رکھ دیا ہو۔

کوئی نادیدہ طاقت اسے احساس دلا رہی تھی کہ خدا کے حضور اس کا گڑگڑانا قبولیت کا شرف پا چکا تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا..............!

ابھی اس نے مصلے تہہ کر کے رکھا ہی تھا جب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے اجازت دینے پر ایک مستعد عسکر اندر آیا............جس نے کچھ ٹائپ شدہ کاغذ اس کے سامنے رکھ کر کسی اطلاع پر اس کے دستخط لئے تھے۔

اسے ناشتے کے فوراً بعد ایک اہم کانفرنس میں طلب کیا گیا تھا۔

اس کانفرنس میں خوست چھاؤنی میں موجود جونیئر ضابطہ سے اوپر کے تمام عہدیداروں کو طلب کیا گیا تھا.........یہاں ان لوگوں کو بڑے بڑے نقشوں کی مدد سے اس علاقے کی پوزیشن سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا گیا کہ افغان فوج اور مجاہدین دونوں فریقوں نے کہاں کہاں بارودی سرنگیں حفظ ماتقدم کے لئے بچھا رکھی ہیں۔!!

اس کے ساتھ ہی محفوظ راستوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی تھی۔

یہ سب کچھ اس بڑے حملے کی تیاری کا حصہ تھا جو ان لوگوں نے اگلے چند روز میں مجاہدین کے مضبوط مرکز ''ژاور'' پر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

جب روسی فوج کا ایک کرنل دیوار گیر نقشوں پر چھڑی رکھ رکھ کر ان لوگوں کو بارودی سرنگوں والے مشتبہ راستوں کی نشاندہی کر رہا تھا تو فیضان کا دل احساس تشکر کے جذبات سے لبریز ہو چکا تھا.......اس کی رو رو کر خدا کے حضور کی گئی التجائیں اتنی جلدی قبولیت کا شرف حاصل کر لیں گی؟

اس احساس نے اسے جہاں جذبہ تشکر عطا کیا تھا وہاں اس کے جذبہ حریت کو بھی مہمیز لگائی تھی۔

اس کی ایک بہت بڑی مشکل اللہ نے خود بخود حل کر دی تھی..............اسے محفوظ راستوں کا ادراک حاصل ہو گیا تھا............اب دنیا کی کوئی طاقت میدان جہاد کی سمت اس کے اٹھنے والے قدموں کو روک نہیں سکتی تھی..............!''

آج کی رات واقعی اس کی قید میں آخری رات تھی..............کل صبح وہ آزاد ہونے والا تھا۔ یہ سوچ اس کے لئے بڑی فرحت بخش تھی۔

اس کانفرنس سے ایک اور سنگین حقیقت کا علم بھی اسے ہوا تھا کہ جس طرح افغان فوج میں مجاہدین کے ہمدرد موجود ہیں جو ان کی قلعہ بندیوں سے دشمن کو آگاہ رکھتے تھے۔ یہ اطلاعات تو اسے تھیں کہ فریقین ایک دوسرے کے ناگہانی حملوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے گرد اگرد بارودی سرنگیں بچھا کر رکھتے ہیں لیکن ان کی پوزیشنوں کا علم نہیں تھا..............اس طرح یہ خطرہ بہر حال موجود تھا کہ ان بارودی سرنگوں سے بچ کر بھی وہ منزل مراد پا بھی سکے گا یا نہیں..............!!اب قسمت نے خود ہی اس کے فرار کی راہ ہموار کر دی تھی۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ کن راستوں سے گزر کر افغان فوج مجاہدین پر حملہ آور ہونے والی ہے..............یہی محفوظ راستے تھے اور اس نے انہیں راستوں کے ذریعے فرار کی ٹھانی تھی۔

اس روز شام کے بعد اسے ایک سیکشن ساتھ لے کر ''ریکی'' کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس سیکشن میں اس کے ساتھ ایک حوالدار اور ایک عسکر تھا۔ یہ حوالدار ڈھلتی عمر کا آدمی تھا اور مقامی علاقے کا ہونے کی وجہ سے ان راستوں سے کافی واقفیت بھی رکھتا تھا۔

فوجی اصولوں کے مطابق ان لوگوں کو دشمن کے علاقے میں ''ریکی'' کر کے صورتحال کا جائزہ لینا تھا............ ان ''ریکی'' کرنے والے گشتی دستوں کی رپورٹ کے بعد ہی پھر حملے کی جزئیات طے کی جاتی ہیں۔

اس ڈیوٹی کو ضابطہ فیضان اوغلو نے عطیہ خداوندی جان کر قبول کیا تھا............!

شام ڈھلے اپنے دونوں ہمرائیوں کے ساتھ وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے ایک ساتھی کو ایل ایم جی اور دوسرے کو راکٹ لانچر لے جانے کا حکم دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے ذریعے مجاہدین تک بہتر اسلحہ تو پہنچ جائے۔ دونوں محافظوں نے بلاچون وچرا اس کے حکم کی تعمیل کی...... یہ کام فیضان نے اتنی پھرتی اور ہوشیاری سے کیا تھا کہ ان لوگوں کے قلعہ خوست سے باہر نکلنے تک اعلیٰ افسران کو علم ہی نہ ہو سکا کہ یہ لوگ کس قسم کا اسلحہ لے کر جا رہے ہیں...... یوں بھی وہ کمپنی کمانڈر تھا اور اپنی کمپنی کی حد تک کئی معاملات میں خود مختار بھی تھا۔

خوست بازار کے باہر سے چکر کاٹ کر وہ لوگ باڑی کی طرف روانہ ہو گئے انہیں اسی علاقے میں ''ریکی'' کرنا تھا...... دونوں عساکر اس کے آگے آگے چل رہے تھے اور کلاشنکوف ہاتھوں میں تھامے وہ ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

حوالدار بڑا محتاط اور اس علاقے کے چپے چپے سے واقف نظر آتا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا۔ یہاں سے ان لوگوں کو گھوم کر واپس قلعہ خوست میں جانا تھا۔

''رکو نہیں............ آگے کی سمت چلتے رہو'' .... جیسے ہی عساکر نے گھومنا چاہا انہیں ضابطہ فیضان اوغلو کا حکم سنائی دیا۔ دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا............ فیضان نے کلاشنکوف ان کی طرف تان رکھی تھی۔ جس کا لاک روانگی پر ہی کھول لیا گیا تھا۔

''مجھے تم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں...... میں کافر کی نوکری پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں مجاہدین کے ساتھ مل کر پرچمیوں، خلقیوں اور روسیوں کے خلاف جہاد کروں گا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ میرا ساتھ دو۔ لیکن تمہارے پاس جو ہتھیار ہیں وہ میں واپس ان کافروں کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا............ تمہیں یہ ہتھیار اٹھا کر میرے ساتھ چلنا ہو گا............ جیسے ہی مجھے احساس ہو گا کہ ہتھیار مجاہدین کے ہاتھ لگ سکتے ہیں تمہیں واپس جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے'' .... فیضان کی بات ختم ہوتے ہی بوڑھے حوالدار نے فارسی میں کہا۔

''ہم آپ کے ساتھی ہیں'' .... دوسرا عسکر پکارا۔

زمین پر اپنے ہتھیار رکھ کر تینوں آپس میں باری باری بغلگیر ہوئے...... خوشی سے تینوں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی منزل مراد کی طرف گامزن تھے۔

دونوں عساکر خدا کا شکر اس لئے گزار رہے تھے کہ ان کی دلی مراد بر آئی تھی .... اور فیضان اس لئے مسرور تھا کہ دونوں اس کے لئے

مسئلہ نہیں بنے تھے......... اب وہ خود ان کی راہنمائی کرتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا.......... چھاؤنی کے کانفرنس روم کا ایک نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا اور فیضان اپنی یادداشت کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔

☆☆

رات کے اندھیرے میں صحیح سمت راہنمائی کے لئے وہ بار بار مڑ کر بوڑھے حوالدار کی طرف دیکھ لیتا تھا جو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ساری رات وہ لوگ پہاڑیوں کے بیچوں بیچ سفر کرتے رہے اور صبح دم ایک پہاڑ پر چھپ کر بیٹھ رہے ابھی تک انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں ہیں؟

ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ مجاہدین کے علاقے میں پہنچ چکے تھے.........!

کابل کے ایک مرکز سے قاسم ایشان زادہ اور میر داد خان اگلے ہی روز یہاں پہنچے تھے......... حاجی امان اللہ نے کابل کے گردونواح میں جدوجہد تیز کرنے کے لئے وہاں کمانڈروں کی ایک خصوصی میٹنگ طلب کی تھی۔

''باڑی مرکز'' پر قاسم ایشان زادہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر یونہی ٹہلتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ رائفل اس نے اپنے کندھے سے لٹکا رکھی تھی اور ہاتھوں میں وہ دوربین تھام رکھی تھی جو آج ہی حاجی امان اللہ نے اسے اپنے مرکز لے جانے کے لئے دی تھی۔

اپنی دانست میں قاسم ایشان زادہ نے صرف پہاڑوں کا نظارہ کرنے کے لئے ہی دوربین آنکھوں سے لگائی تھی۔ اس کا رخ ''توڑ غار'' کی طرف سے آنے والے راستے کی طرف کر دیا......... دوربین کو شمالاً جنوباً گھماتا چلا گیا اور اچانک ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔

اسے تین افغان فوجی چھپ چھپ کر اس طرف آتے دکھائی دیئے تھے۔

پہلا خیال قاسم ایشان کے ذہن میں یہی آیا کہ یہ دشمن کی پٹرول پارٹی ہے جو راستہ بھول کر اس طرف آ نکلی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے کچھ سوچا پھر مرکز کی طرف واپس بھاگ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میر داد خان اور تین دیگر مجاہدین کے ساتھ وہ اس سمت روانہ ہو گیا......... دوربین کی مدد سے انہوں نے آنے والوں کی سمت اور راستے کا تعین کر لیا تھا۔

تینوں مجاہدین بلی کی طرح قدموں کی آواز پیدا کئے بغیر پہاڑی سلسلے میں غائب ہو گئے۔ وہ آنے والوں کے راستے پر گھات لگانے جا رہے تھے۔ میر داد خان انہیں ہدایت نہ بھی کرتا تو بھی وہ اس وقت تک گولی نہ چلاتے جب تک کہ مخالف سمت سے کوئی غلط حرکت نہ ہوتی۔

میر داد خان خود قاسم ایشان کے ساتھ ہی وہیں دبک کر بیٹھ گیا......... دوربین اس نے اپنی آنکھوں سے لگائی تھی......... پھر اس نے دوربین ہٹا لی۔ کیونکہ سامنے سے آنے والے بے دھڑک اور سیدھے ان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ قاسم ایشان نے کلاشنکوف کا لاک کھول کر گن سیدھی کر لی۔

''اس کی ضرورت نہیں قاسم!''......... میر داد خان نے ہاتھ اوپر ہٹاتے ہوئے قاسم سے کہا......... ''یہ اپنے لوگ ہیں۔ میرا دل گواہی

دیتا ہے کہ اللہ نے ہم پر خصوصی مہربانی کی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی تینوں افغان فوجی مجاہدین کے سامنے تسلیم کر چکے تھے.......... حاجی امان اللہ نے اسی دم راکٹ لانچر اور ایل ایم جی ملنے پر دو نوافل شکرانے کے گزارے......... فیضان اوغلو کی آمد کو وہ اللہ کی نصرت شمار کر رہے تھے۔ مجاہدین کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ یاد آ گیا تھا..........!!

دوپہر تک وہ باتیں کرتے رہے پھر حاجی امان اللہ کے اصرار پر لیٹ گئے اس کی خواہش تھی کہ انہیں آرام کا موقعہ دیا جائے۔ سہ پہر تک کا وقت تینوں نے سوتے جاگتے گزارا۔ فیضان کو کبھی کبھی اپنے گھر والوں کی یاد ضرور آتی.......... وہ جانتا تھا اس کے فوج سے فرار کے بعد "خدمت اطلاعات دولتی" (خاد) نے اس کے خاندان کے لوگوں اور بہی خواہوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہوگا۔

لیکن..........!

قرآن کا وہ حکم کہ اللہ اپنے راستے پر گامزن ہونے والوں کو امتحان سے ضرور گزارتے ہیں اور ان کی راہ میں ثابت قدم رہنے والے ہی بامراد ٹھہرتے ہیں اس کو تسلی دلانے کے لئے کافی تھا۔

افغان فوج کے "ضابطہ" کے مجاہدین کے سامنے تسلیم ہونے کی اطلاع مجاہدین کے نزدیکی مراکز پر پہنچ چکی تھی اور نزدیکی مراکز کے کمانڈر جوق در جوق اس مجاہد کو دیکھنے اور.......... دشمن کی تازہ ترین منصوبہ بندیوں کے حالات جاننے کے لئے باڑی مرکز پہنچ رہے تھے۔

مغرب کے بعد ضابطہ فیضان اوغلو جس نے افغان فوج کی وردی اتار کر اپنے ہاتھوں جلا دی تھی مجاہدین کی طرف سے فراہم کردہ کپڑے ان لوگوں کو تازہ مورچہ بندیاں دشمن کے عزائم اور حملے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجاہدین کو کچھ اطلاعات تو اپنے بہی خواہوں کی طرف مل چکی تھیں، لیکن اتنی تفصیلات کا علم ہونے پر وہ مزید ہوشیار ہو گئے۔

فیضان کی بات ختم ہوتے ہی حاجی امان اللہ نے مجاہدین کو فوراً نئی مورچہ بندیاں قائم کرنے کے احکامات جاری کئے۔ فیضان کا ساتھی بوڑھا حوالدار ان لوگوں کے ساتھ ہی راکٹ لانچر اٹھائے خوست کی طرف سے آنے والی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ لوگ اس راکٹ لانچر کے ذریعے ٹینکوں کی ممکنہ یلغار روکنے جا رہے تھے۔ روانگی سے پہلے بوڑھا حوالدار ایک مرتبہ پھر فیضان سے بغلگیر ہو گیا۔ بیٹا تم نے میری عاقبت سنوار دی۔ اس نیکی کا اجر خدا تمہیں ضرور دے گا۔ دعا کرنا۔ اب جو میں جا رہا ہوں تو سرخرو ہو کر یہاں سید ھا اللہ کے دربار میں پہنچ جاؤں"

فیضان کا دل بھر آیا، لیکن اس نے زبان سے صرف "آمین" ہی کہہ کر رخ موڑ لیا۔

حاجی امان اللہ کے ساتھ رات کے اندھیرے میں وہ "ژاور مرکز" کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات کے پہلے پہر "ژاور مرکز" پر اس علاقے میں مصروف جہاد مجاہدین کے تمام گروپوں کے کمانڈر اکٹھے ہو چکے تھے۔ جہاں ضابطہ فیضان اوغلو نے انہیں دوبارہ تمام تفصیلات سے آگاہ کیا..........!

اس نے تجویز دی کہ دشمن کے حملے سے پہلے ہی اس پر حملہ کر دیا جائے۔

لیکن! وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ مجاہدین کے پاس سوائے جذبے کے اور کچھ نہیں ہے......اسے یہاں آ کر علم ہوا تھا کہ دنیا بھر میں کیا جانے والا یہ پروپیگنڈہ بالکل غلط تھا کہ مجاہدین کو امریکہ سے بے تحاشا اسلحہ مل رہا ہے......دوسرے ممالک بھی مدد کر رہے ہیں، حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی......مجاہدین کے پاس دشمن سے چھینا ہوا اسلحہ تھا یا پھر وہ ہلکے ہتھیار جو مسلمان مخیّر حضرات نے خرید کر ان تک پہنچائے تھے۔ باقی ممالک کی امداد صرف زبانی تھی یا اخلاقی! اس اجلاس میں ضابطہ فیضان اوغلو نے تجویز پیش کی کہ درمیانے اسلحے کے حصول کے لئے خواست بازار میں موجود ایک اسلحہ کے ڈپو کو لوٹ لیا جائے......اس کی اس تجویز سے اتفاق کیا گیا اور اگلے روز رات کا وقت اس مہم کے لئے منتخب ہوا۔ حاجی امان اللہ کی تجویز پر ضابطہ فیضان اوغلو کو ہی حملہ آور مجاہدین کی مان سونپی گئی۔

اگلا روز اس کی زندگی کا عظیم انقلاب لے کر نمودار ہوا، کل تک وہ افغان فوج کا ضابطہ تھا......اور آج مجاہدین کا کمانڈر بن کر حملہ کرنے جا رہا تھا......!

شام ڈھلے وہ لوگ اپنی مہم پر روانہ ہوئے۔ خوست بازار کے باہر ہی فیضان نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا......وہ خود حالات کا جائزہ لینے کے بعد کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

فیضان کے ساتھ آنے والے مجاہدین کی تعداد چار تھی اور ان کے پاس صرف دو رائفلیں تھیں یا پھر کینوس کے تھیلے جس میں وہ لوگ یہاں لوٹا ہوا اسلحہ لے کر جانا چاہتے تھے۔

فوجی تربیت کے مطابق اس نے پہلے خود اسلحہ کے ڈپو کا جائزہ لیا جو قلعے کے باہر ایک قدرے محفوظ مقام پر بنایا گیا تھا۔ یہاں تین پہریدار موجود تھے......! فیضان جانتا تھا کہ ان لوگوں کے اشارے پر فوج ان کی مدد کو آ سکتی ہے......اسے سب سے پہلے فوج کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ کرنا تھا۔ جس کا بندوبست اس نے روانگی پر کر لیا تھا۔

اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر وہ ڈپو کے نزدیک پہنچا پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پٹرول کی بوتل نکالی جو اسی مقصد کے لئے اس نے دم رخصت اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ بوتل کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس نے کپڑے کو آگ دکھائی اور بوتل کو پورے زور سے ڈپو سے کچھ فاصلے پر کیموفلاج کی گئی گاڑیوں پر پھینک دیا......بوتل کینوس کی چادروں پر گری جنہوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔

جلتی ہوئی کینوس کی چادریں جب وہاں موجود ڈبیکلو پر گریں جن پر پٹرول کے کین رکھے ہوئے تھے تو جیسے قیامت آ گئی......پل بھر میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

چند ہی منٹوں میں وہاں کہرام مچ گیا۔

الارم بجنے لگے......ڈپو کے پہرے دار اسی طرف دوڑ پڑے......دوڑتے پہریداروں کو مجاہدین نے نشانے پر رکھا ہوا تھا......ان کے زمین چاٹتے ہی وہ لوگ فیضان کے اشارے پر ڈپو میں جا گھسے۔ چند منٹ بعد چاروں مجاہدین نے اپنے جسموں پر اسلحہ کے گٹھے

لاد لئے تھے...... فیضان ان کی راہنمائی کے لئے آگے آگے چل رہا تھا۔ آگ کی روشنی سے بچنے کے لئے انہوں نے لمبا لیکن محفوظ راستہ اختیار کیا۔ اس کی دانست میں انہیں کسی نے دیکھا نہیں تھا لیکن وہ یہ نہ جان سکا کہ اسے بھاگتے ہوئے اس کی کمپنی کے ایک عسکر نے دیکھا ضرور تھا...... یہ الگ بات کہ وہ اپنے "سابقہ ضابطہ" پر گولی چلانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اور اس کے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی فیضان اس کی زد سے نکل گیا!

آگ کی لپٹوں نے قلعے میں موجود فوج کو بوکھلا کر رکھ دیا......! اس کے ساتھ ہی کسی نے چلا کر کہا مجاہدین حملہ آور ہو گئے ہیں......!!

مجاہدین ان لوگوں کے اعصاب پر دہشت بن کر سوار ہو چکے تھے۔ گزشتہ دو سال میں انہوں نے ایسے ایسے محیر العقول اور دلیرانہ کارنامے انجام دیئے تھے کہ اب ان کی کسی جگہ موجودگی ہی روسی اور افغان فوج کے لئے باعث خوف بن جایا کرتی تھی۔ روسی فوجی تو کبھی ایسے مواقع پر باہر نہیں نکلتے تھے...... اب بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔

افغان فوجیوں کو "دشمن" سے نمٹنے کے لئے باہر بھیجا گیا، لیکن "دشمن" ان کی دسترس سے بہت دور جا چکا تھا۔ ضابطہ فیضان اوغلو اور اس کے ساتھی بڑی تیز رفتاری سے سفر کرتے پہاڑی سلسلے میں گم ہو چکے تھے...... دم رخصت اس نے اس ڈپو سے حاصل کردہ دستی بموں کے ذریعے ڈپو کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا تھا۔

☆☆

رات کے اندھیرے میں مجاہدین کا تعاقب کرنے کی حماقت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ تمام فوجی جانتے تھے کہ اپنے فرار کے راستے پر مجاہدین نے گھات ضرور لگائی ہوتی ہے تاکہ تعاقب میں آنے والی فوج سے نمٹا جا سکے۔ اور رات کے اندھیرے میں گولی کی سمت کا اندازہ کرنے سے پہلے ہی موت ان کا مقدر بن سکتی ہے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے وہ لوگ اپنے مرکز میں پہنچ چکے تھے اور اس محاذ پر پہلی مرتبہ مجاہدین کے ہاتھ اسلحے کا اتنا بڑا ذخیرہ لگا تھا۔ فیضان کے پہلے ہی کارنامے نے اس کا احترام سب کے دلوں میں قائم کر دیا تھا۔

دوسری طرف......!

صبح ہونے تک آگ کی طرح یہ خبر دشمن کیمپ میں پھیل گئی تھی کہ رات مجاہدین نے حملہ ضابطہ فیضان اوغلو کی کمان میں کیا تھا اور فیضان یہاں سے فرار ہو کر مجاہدین کے ساتھ شامل ہو چکا ہے۔

میر داد خان واپس کابل مرکز آیا تو حاجی امام اللہ نے فیضان اوغلو کو بھی اس کے ساتھ روانہ کر دیا...... وہ سمجھتا تھا کہ ایسے مجاہدین کی زیادہ ضرورت کس محاذ پر ہو سکتی ہے۔

❁......❁......❁

تائید غیبی

اخوندزادہ کے قتل پر اس کی گرفتاری اسی میجر ارخان کے ہاتھوں ہوئی تھی جس نے اسے ماسکو سے واپسی پر بزعم خویش ''انقلابی'' بنانے کے جتن کئے تھے اور آج جب وہ ''خاد'' کے چنگل سے نکلا تو قسمت اسے پھر ارخان کے دروازے پر لے آئی تھی .... لیکن یاسمین؟............

اس نے سوچا .... یاسمین سے زندگی نے دوبارہ ملایا بھی تو کس روپ میں!!

یاسمین نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ جو خواب وہ دیکھتی آئی تھی یہاں آکر بالکل چکنا چور ہو گئے تھے۔ خصوصاً فیضان کی اچانک بیوفائی نے اسے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا دل پڑھائی سے بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ فیضان جاتے ہوئے اسے مل کر بھی نہیں گیا تھا۔ اس حادثے نے تو اسے اندر سے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے اب پارٹی میٹنگوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ ایک بے نام سا پچھتاوا اس کی جان کو آ گیا تھا۔ منتشر ذہن کے ساتھ تعلیم تو وہ کیا حاصل کر پاتی جسمانی عوارض نے اسے گھیر لیا۔

پارٹی اجلاس سے مسلسل غیر حاضری نے اس کے ساتھیوں کے دلوں میں پرورش پاتے ان خدشات کو مستحکم کر دیا تھا کہ یاسمین ''منحرف'' ہو گئی ہے۔ اگر وہ روس کی شہری ہوتی تو اسے اس گناہ کی قیمت بہر حال ادا کرنا پڑتی .... لیکن وہ غیر ملکی طالبہ تھی۔ اور عین ممکن تھا کہ اس کے ساتھ کی جانے والی کوئی زیادتی ان لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتی۔ اسی لئے بطور احتیاط فیضان کی روانگی کے بمشکل دو ڈھائی ماہ بعد اسے بھی ''نالائق اور کند ذہن'' قرار دے کر واپس کابل بھیج دیا گیا۔

جگون ارخان کی بیٹی یاسمین جب اپنے ملک میں واپس آئی تو وہ پہلے والی یاسمین نہیں رہی تھی۔ فیضان کی جدائی کا سانحہ اس کی جان کو آ گیا تھا۔ اس کی ہنسی اور قہقہے کبھی کے رخصت ہو چکے تھے۔ کابل کی اونچی سوسائٹی کے گھرانوں میں اس کا آنا جانا بالکل ختم ہو گیا تھا۔

تقریبات میں بھی وہ خال خال ہی نظر آتی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث وہ اسے ضرورت سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ارخان نے کبھی اس پر کسی کام کے لئے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ یاسمین کی ماں نے حتی الوسع کوشش کی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو روایتی مسلمان اور افغان زادی بنا سکے۔ وہ خود ایک قدامت پسند مذہبی عورت تھی۔ ایک روایتی مسلمان افغان عورت جسے اپنی بیٹی کا کھلے بندوں گھومنا پھرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

ایک روز جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی بیٹی شراب نوشی کی محفلوں میں بھی شرکت کرنے لگی ہے۔ اس نے رو رو کر میجر ارخان کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ وہ بیٹی کو شمع محفل بننے سے بچا لے .... لیکن ارخان پر جدید نظریات ضرورت سے زیادہ ہی غلبہ پا چکے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کو حسب سابق ڈانٹ دیا اور بیچاری بڑھیا کٹ کر رہ گئی۔

یاسمین کی ماسکو روانگی نے تو اسے چارپائی سے لگا دیا تھا لیکن وہ مری نہیں تھی۔ اپنی بیٹی کی آمد کی منتظر رہی۔ اب جب اس کی بیٹی ''مسلمان افغان زادی'' بن کر لوٹی تو اس نے خاصی دیر لگا دی تھی۔ اس کی ماں کی روانگی وقت ہو رہا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھنے اور مسلسل غم کرتے رہنے کی وجہ سے اس کے دل میں سیاہ شگاف پڑ گیا تھا۔

حالات کی تاریکیوں نے اس شگاف کو مزید گہرا کرنا شروع کر دیا اور جب ایک روز اسے دل کا دورہ پڑا اور ارخان اسے ہسپتال لے کر گیا تو اسے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مریض کے علاج میں زبردست کوتاہی کی گئی ہے اور معاملہ اب دوا سے زیادہ دعا پر آ گیا ہے..........!

یاسمین نے پانچ چھ ماہ تک حتی المقدور کوشش کر ڈالی کہ اس کی ماں زندہ رہے لیکن وہ اپنی ماں کو مرنے سے نہ بچا سکی۔

مرتے وقت اس کی ماں کم از کم اس لحاظ سے مطمئن اس دنیا سے جا رہی تھی کہ: اس کی بیٹی نے کسی مرحلے پر ہی سہی بہر حال سیدھی راہ تو اپنا لی تھی۔

ماں کی موت نے تو یاسمین کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے۔ اس نے جب کبھی صدق دل سے حالات کا جائزہ لیا تو خود کو ہی ماں کی موت کا ذمہ دار گردانا۔ اس کی بے جا اور حد سے بڑھتی ہوئی ترقی پسندی نے اسے جنم دینے والی ماں کی جان لے لی تھی۔ اس انکشاف نے اسے کئی مرتبہ رلایا۔ جوں جوں وہ اس پر غور کرتی۔ نام نہاد ترقی پسندی اور سوشلزم سے اس کی نفرت بڑھتی چلی جاتی۔

ایک روز جب اس نے سنا کہ روس کی فوج ہی اس کے ملک میں ''دوستی نبھانے'' کے لئے گھس آئی ہے تو وہ تلملا کر رہ گئی۔ لیکن بے چاری معصوم لڑکی کیا کر سکتی تھی۔

اس دوران کابل کے دو سربراہان مملکت یکے بعد دیگرے اس انقلاب کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ ملکی حالات بالکل بدل گئے تھے۔ ساری ساری رات کابل کرفیوں کی لپیٹ میں رہتا۔ لوگ ایک دوسرے سے خوف زدہ اور سہمے سہمے نظر آنے لگے تھے۔ یہ بڑے صاف دل اور پکے مسلمان تھے۔ دل کی بات کبھی دل میں نہ رکھ سکے۔ ان کے اندر روس کے خلاف پلنے والی نفرت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ یاسمین کے دیکھتے ہی دیکھتے کئی نوجوان کابل سے غائب ہو کر پہاڑوں میں چلے گئے۔

جانے والے رائفلیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہ اس عزم سے نکلے تھے کہ اپنے گھروں کو تب ہی لوٹیں گے جب اپنا ملک آزاد کروالیں گے۔ ان جانے والوں میں چند ایسے بھی تھے جن کے نام اور کارناموں سے جلد ہی کابل کے در و بام گونجنے لگے۔

انہی میں ایک نام فیضان کا بھی تھا..........!

☆☆

فیضان کا نام یاسمین نے پہلی مرتبہ اپنے باپ سے سنا تھا جب وہ ایک روز کرنل شواخوف سے ڈانٹ کھا کر خاصا آگ بگولا اور غصے میں پھنکتا گھر آیا تھا۔ کرنل شواخوف نے اس کی بہت بے عزتی کی تھی اور فیضان کے نکل جانے پر اسے نکھٹو اور کام چور ہونے کے طعنے دیئے تھے۔

ایک روز اخبارات میں اس نے فیضان کی تصویر اس خبر کے ساتھ دیکھی کہ اس نے ایک روسی مشاور کو کابل کے ایک بھرے پرے بازار

میں گولی ماردی تھی اور ہجوم میں فرار ہوگیا تھا۔اس کے کارناموں کو پڑھ کراور سن کر یاسمین کو بہت خوشی ہوتی تھی۔اس نے بار باران باتوں پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ فیضان ماسکو والوں کے نرغے سے زندہ نکل کر واپس آ گیا ہے۔

پچھلے دنوں تو اس کا تذکرہ قریباً آئے روز اس کے گھر میں ہونے لگا تھا۔گھر میں وہ اپنے والد اور نوکروں کے ساتھ ہی رہتی تھی لیکن اس ماڈرن آبادی کے اکثر لوگوں کا ان کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔کابل کے ہر گھر میں انہی مجاہدین کی کہانیاں زیر بحث رہتی تھیں۔

کچھ لوگ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور کچھ نفرت،لیکن ہر دو طبقے ان کی جرأت اور قوت ایمانی کے قائل ضرور تھے۔دوست دشمن بارہا ان لوگوں کو خراج عقیدت پیش کر چکے تھے جنہوں نے ایک جابر اور قاہر قوت سے نہتے ہونے کے باوجود ٹکر لی تھی۔

یاسمین نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک فیضان زندگی میں دوبارہ کبھی اس سے ٹکرا جائے گا۔فیضان نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ جس گھر میں پناہ لینے جا رہا ہے وہاں یاسمین بھی اس کی منتظر ہوگی۔

جگرون ارخان کے ہاتھ سے پستول گر چکا تھا۔اس نے اپنی بیٹی کی دھمکی میں بڑا واضح وزن محسوس کر لیا تھا۔اس کے تجربے نے اسے انسانی لہجوں میں چھپے حقائق کو پڑھنے کا اچھا خاصہ گر سکھا دیا تھا۔جس طرح یاسمین نے اچانک اس پر پستول تانا تھا عجب نہیں تھا کہ اگر وہ مدافعت کرتا تو یاسمین گولی چلا دیتی۔

''فیضان پستول اٹھالو۔''اس نے حیرت زدہ فیضان کو اپنے باپ کے پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فیضان نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا پھر پستول اٹھا لیا۔

''بابا''...........یاسمین نے اپنے والد کو مخاطب کیا...........''مجھے افسوس ہے میں نے آپ پر پستول تانا ہے۔لیکن میری جگہ کوئی باغیرت پٹھان لڑکی ہوتی تو وہ یہی کچھ کرتی...........یہ شخص ہمارے گھر پناہ لینے آیا ہے اور پٹھان پناہ لینے والے کو کچھ نہیں کہا کرتے خواہ وہ ان کے باپ کا قاتل ہی کیوں نہ ہو...........یہ ہمارا مہمان ہے۔''

''یاسمین''...........میجر ارخان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''تم جانتی ہو اسے؟''

''اسے کون نہیں جانتا بابا...........یہ لوگ تو ہماری پہچان ہیں۔یہ ہماری عظیم روایات کے امین ہیں انہوں نے ساری دنیا کو باور کرا دیا ہے کہ افغان اپنے عظیم پہاڑوں کی طرح نا قابل تسخیر ہیں یہ باتیں کہتے ہوئے اس کا گلا رندھ گیا۔

''بیٹی میری بات کا جواب تم نے ابھی تک نہیں دیا...........''جگرون ارخان نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''ہاں بابا!ہم دونوں کالج میں اور پھر ماسکو میں بھی اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔''یاسمین نے بالآخر اقرار کر ہی لیا۔

''آپ لوگ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔میں جلدی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

فیضان نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں مداخلت کی۔

''نہیں فیضان!تم ایسے نہیں جاؤ گے...........تم میرے مہمان ہو۔نوکری ثانوی چیز ہے۔میں پہلے مسلمان اور پھر افغان ہوں۔کاش

میری آنکھیں بھی آج سے پہلے کھل گئی ہوتیں اور میں تمہاری گرفتاری نہ کرنے جاتا.............اے کاش۔"

"میں آپ لوگوں کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔" فیضان نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ فی الحال تم آرام کرو۔ میں ایک نظر ذرا باہر کا جائزہ لے آؤں۔" یہ کہہ کر جگلون ارخان باہر نکل گیا۔

اس کے اچانک باہر جانے پر فیضان بالکل نہیں گھبرایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جگلون ارخان اسے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ مسلمان کی غیرت ہی کو جگانا ہوتا ہے۔ اور وہ محسوس کر سکتا تھا کہ ارخان کی سوئی ہوئی غیرت آج بیدار ہو گئی ہے۔

یہ تائید غیبی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے احساس دلایا.............خدایا تو ہی دلوں کے حال جاننے والا اور دلوں کو پھیرنے والا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے یاسمین.............اپنے رویے سے میں نے تمہیں خاصا دکھی کیا ہے" اس نے ارخان کے جاتے ہی یاسمین سے کہا۔

"نہیں فیضان تم تو میرے محسن ہو! اگر اس روز تم ایسی کھلی باتیں نہ کرتے تو نجانے آج میں ذلالت کی کس راہ پر گامزن ہوتی.............تم نے تو مجھے ان درندوں کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا فیضان.............!"

دونوں وہیں ماسکو کی باتیں کرتے رہے۔

☆☆

کرنل شولوخوف غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہوئے تمام فوجیوں کو گولی سے اڑا دے۔ جن کی بزدلی اور نااہلی کی وجہ سے نہ صرف فیضان ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا بلکہ اس کے ساتھی بھی پندرہ بیس فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد غائب ہو گئے تھے۔

سمجھ نہیں آتی تھی کہ ان لوگوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہے؟

"گدھوں کی طرح کیا سر جھکائے کھڑے ہو............"

اس نے اپنے سامنے کھڑے فوجیوں کو مخاطب کیا۔ جاؤ اور فیضان کو ڈھونڈو۔ سارے کابل میں میں نے ناکہ بندی کروا رکھی ہے وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ یہیں ہے۔ کابل ہی میں کہیں اس نے پناہ لے رکھی ہے۔"

اور تمام گدھے وہاں سے جان بچی سو لاکھوں پائے کا ورد کرتے ہوئے کھسک گئے۔ کرنل شولوخوف وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا.............پھر اچانک ایک خیال سے چونک پڑا۔ بڑی تیز رفتاری سے چلتا ہوا وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں آ کے انٹرکام کے ذریعے اس نے میجر بوناکوف کو اپنے پاس طلب کیا۔

چند منٹ بعد میجر وہاں موجود تھا۔

"بوناکوف!".............اس نے بڑے سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا............."تمہارے سیل میں ایک غدار ضرور موجود ہے۔ باغیوں کا

کوئی آدمی..........اور ہم نے بہر حال اسے تلاش کرنا ہے۔ اس کام کے لئے میں بہت وقت نہیں دے سکتا! خیال رکھنا۔''

بونا کوف کا کوئی جواب سنے بغیر اس نے ''آؤٹ'' کہہ دیا اور میجر بونا کوف پاؤں پٹخ کر باہر نکل گیا۔

اس کے روانہ ہوتے ہی کرنل شولوخوف نے مغز کھپائی شروع کر دی۔ اچانک اپنے نزدیک پڑے فون پر اس نے ایک نمبر ملا دیا۔ گھنٹی کابل کے مضافاتی علاقے کی ایک چھاؤنی میں بجی تھی۔ دوسری طرف سے فون اٹھانے والا اس علاقے کا روسی کمانڈر تھا، کرنل شولوخوف نے اسے کچھ سمجھایا اور حکم دیا..........''فوراً اس علاقے کو گھیرے میں لے لو۔''

محض دس منٹ بعد دس پندرہ ٹینک گڑگڑاتے ہوئے چھاؤنی سے باہر نکل رہے تھے۔

میجر ارخان یونہی باہر نہیں نکل آیا تھا اس کی ساری زندگی فوج میں گزری تھی۔ اور اس کے حساس کانوں نے ٹینک کی گڑگڑاہٹ محسوس کر لی تھی۔ باتیں کرتے کرتے یاسمین اور فیضان اچانک چپ ہو گئے۔ کیونکہ مختلف قسم کے فوجی ٹرکوں اور ٹینکوں کی آوازیں اب خاصی نمایاں ہو گئی تھیں۔

دونوں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے جیسے ان میں سے ہی کوئی ایک اس صورت حال کا ذمہ دار ہو۔

جگرون ارخان جس تیز رفتاری سے گیا تھا اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اس کی واپسی ہوئی۔ اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ صورت حال کی وضاحت کس طرح کرے......اس کی حالت بالکل نومسلموں کی سی ہو گئی تھی۔ جنہیں ایمان لاتے ہی اللہ تعالیٰ نے کسی بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہو۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی راہ گم کردہ بیٹی اسے راہ راست پر لائی تھی اور آج ہی اس کا امتحان قدرت لینے پر تل گئی تھی......!

میجر ارخان جانتا تھا کہ فیضان کو گرفتار کروانے کی صورت میں اسے کسی بھی اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا جاتا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی اس نے فیضان پر قابو پایا تھا کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کرنل بنا دیا جائے لیکن کیا وہ اپنے ضمیر کی طرف سے خود پر برپا ہونے والے عذاب کا سامنا کر سکے گا؟......نہیں..........اس نے سوچا۔ یہ ناممکن ہوگا..........!

''فیضان میرے بیٹے!''..........اس نے اندر داخل ہوتے ہی فیضان کو مخاطب کیا۔''ان لوگوں کو شاید تمہارے یہاں موجود ہونے کا شک ہو گیا ہے۔ تمہاری حالت اس قابل نہیں کہ اب مزید بھاگ دوڑ سکو۔ اس بستی میں محفوظ ترین ٹھکانہ تمہارے لئے اگر کوئی ہے تو یہی گھر۔ جس میں تم بیٹھے ہو۔ بیٹا! تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ یہ افغان فوج کے میجر کا نہیں ایک مسلمان کا وعدہ ہے۔''

فیضان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا صرف ایک لمحے کے لئے یاسمین کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

''فیضان! تم مطمئن رہو۔'' اس کے لہجے میں بلا کی خوداعتمادی تھی۔

فیضان نے چند سیکنڈ کے لئے کچھ سوچا۔ آرمی وہیکلز کی آوازیں اب خاصی نمایاں ہو رہی تھیں۔ فضا میں کوئی ہیلی کاپٹر بھی چنگھاڑنے لگا

تھا اور اس کی چنگھاڑ اب لحہ بہ لحہ تینوں کو قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ فیضان کے دل نے باپ بیٹی کے الفاظ کی صداقت پر صاد کر دیا۔ اس نے مطمئن ہو کر گردن جھکالی۔

ارخان نے اپنا ریوالور اس کی طرف بڑھا دیا اور گولیوں کی پیٹی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''بیٹے خدا نہ کرے اگر کوئی برا وقت آ بھی گیا تو تم اکیلے نہیں ہو گے۔ ہمارے پاس دو اور ریوالور بھی موجود ہیں۔''

فیضان اوغلو کو ان لوگوں نے سٹور میں چھپا دیا۔ چند ہی منٹ بعد فوج کے متعدد دستے اس ماڈرن آبادی کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ وہ بے دھڑک کسی بھی مکان میں گھس جاتے تھے جگرن ارخان اپنے بنگلے کے دروازے پر آ گیا تھا ایک جیپ اس کے قریب آ کر رک گئی۔

جیپ میں حواس باختہ افغانی میجر اور اس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ یہ لوگ ''خاد'' کی طرف سے آئے تھے اور فیضان کی گرفتاری کی اس مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ بوکھلائے ہوئے افغانی میجر نے جگرن ارخان کو اطلاع دی کہ فیضان بھاگ گیا ہے۔ ارخان کو اپنی اداکاری کی صلاحیتوں پر کبھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ لیکن آج وہ خود اپنے آپ کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے چہرے پر غصے کی کیفیت طاری کر لی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑ بڑا کر رہ گیا۔

اس کے ساتھی میجر ارخان کی جذباتی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ارخان نے کس طرح جان جوکھوں میں ڈال کر فیضان اوغلو کو گرفتار کیا تھا اور اس کے فرار کے بعد تو اب یقیناً اس کی جان غیر محفوظ ہو گئی تھی جو لوگ اخوندزادہ کو بھرے بازار میں گولی مار سکتے تھے ان کے لئے جگرن ارخان کو مار دینا کچھ بعید نہیں تھا۔

فوج کے مختلف سپاہی اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے رہے لیکن کسی نے اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کی۔ قریباً ایک گھنٹہ کی ناکام مغز ماری کے بعد وہ لوگ بے نیل مرام لوٹ گئے۔

☆☆

کرنل شولوخوف پر دیوانگی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ فیضان کا اس طرح ہاتھوں سے نکل جانا خود اس کیلئے بھی خطرے کی گھنٹی تھی۔ اسے مجاہدین سے زیادہ خطرہ اپنے افسران کی طرف سے تھا۔ کے جی بی اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بادل نخواستہ یہ اطلاع اوپر پہنچائی تھی اور اب اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر یہاں بیٹھا تھا۔

فیضان اوغلو کو ارخان نے زبردستی چھ سات روز اپنا مہمان رکھا تا کہ اس کے زخم مندمل ہو جائیں۔ اس دوران یاسمین نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیئے اس کا علاج دونوں باپ بیٹی نے خود ہی کیا تھا۔ پھر ایک روز رو بہ صحت ہو کر وہ میر داد خان کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

میر داد خان تک پہنچنے کے لئے اسے کسی خاص تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ یاسمین جس کو دیکھ کر بھی اسے گھن آتی تھی۔ آج اس کے لئے روحانی تسکین کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یاسمین میں فیضان نے انقلابی تبدیلی محسوس کر لی تھی۔

اس نے جان لیا تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے صبح کی بھولی یاسمین گھر لوٹ آئی ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک واضح ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ وہ روایتی حیا جو اس سے ترقی پسندی نے چھین لی تھی۔ دوبارہ اس کا حصہ بن گئی تھی اور اب یاسمین کے نزدیک فیضان کی حیثیت ایک مجاہد کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک ایک مجاہد جو اس کے دین، ملت اور ناموس کی بقا کے لئے جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ جانے بوجھے بغیر کہ اس اندھی لڑائی کا انجام کیا ہوگا۔ اس دوران جگن دن ارخان اسے ''خاذ'' کی پل پل خبر دیتا رہتا تھا۔ اس نے فیضان کو بتا دیا تھا کہ کس طرح اس نے کرنل شولوخوف کو گمراہ کرنے کے لئے تفتیش اور تلاش کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔

جب اس روز علی الصبح فیضان نے باپ بیٹی سے جانے کی اجازت لی تو یاسمین کا دل ایک دم سے بیٹھ گیا۔ فیضان نے اسے اپنی اگلی منزل نہیں بتائی تھی لیکن یہ یقین ضرور دلا دیا تھا کہ وہ کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھے۔

ارخان کے لئے یہ امر باعث برکت تھا کہ فیضان اوغلو ایسے سر بکف افغان مجاہد نے یاسمین کے لئے سہارا بننے کی آرزو ظاہر کی تھی۔

امیر داد خان اور دیگر مجاہدین نے صلاح مشورے کے بعد اسے وقتی طور پر کابل سے ہٹا لینے کا فیصلہ کر لیا وہ جانتے تھے کہ کے جی بی اور ''خاذ'' پاگل کتوں کی طرح فیضان کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور کابل میں وہ لوگ خود کو زیادہ محفوظ بھی تصور نہیں کرتے۔

مختلف ذرائع سے سفر کرتا فیضان اوغلو اپنے پرانے ٹھکانے جلال آباد میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے یہاں آ کر دم نہیں لیا تھا اور آتے ہی اپنی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ جلال آباد میں اسے مجاہدین کے مقامی کمانڈر کی حیثیت حاصل تھی جلد ہی کے جی بی کے ایوان اس کی جلال آباد میں موجودگی اور کارناموں کی خبر سے لرزنے لگے۔

شمشیر خان کی آمد

اس روز وہ خاصا تھکا ہوا تھا اور ابھی اس نے لیٹنے کو کمر سیدھی ہی کی تھی جب غار میں بنے اس خفیہ ٹھکانے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور ناظر خان اس کے سامنے موجود تھا۔

''ناظر خان تم''؟

بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور وہ ناظر خان سے لپٹ گیا۔ اتنی مدت کے بعد دونوں ملے تھے کہ ایک دوسرے سے الگ ہونے کو تیار ہی نہیں تھے۔

''دوسرے مہمان سے بھی تعارف حاصل کرلو''

ناظر خان نے اسے کسی اور کی موجودگی کا احساس دلایا۔

اور.........

فیضان اوغلو نے پہلی مرتبہ بڑے غور سے اس کے ہمراہی کا چہرہ دیکھا جس نے بڑا سا کپڑا اپنے منہ سے الگ کرلیا تھا کیونکہ یہاں غار کے اندر سردی کا احساس کچھ کم ہونے لگا تھا۔

''آپ''؟

اس نے ناظر خان کی طرف دیکھ کر مہمان کا تعارف چاہا۔

''شمشیر خان.........''

ناظر خان نے اس کا تعارف کروایا۔

''شاید آپ کا تعلق.........''؟

فیضان اوغلو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''شیستان سے ہے'' ....

ناظر خان نے اس کا تعارف کروایا۔

''اللہ اکبر'' ....

فیضان اوغلو بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔ چیچنیا کا نام تو اس نے سنا تھا۔ اپنے اجداد سے اس نے امام شامل ؒ کے کارنامے بھی سنے تھے۔

قفقاز اور داغستان کے ان جانبازوں کے قصے آج بھی ان کے بزرگوں کو ازبر تھے جنہوں نے امام شامل ؒ کے شانہ بشانہ روسیوں کے خلاف جہاد کیا اور اپنے خون کے انمٹ نقوش تاریخ کے صفحات پر رقم کر گئے۔

افسوس ان کا جہاد ثمر آور نہ ہو سکا............ کیونکہ کسی مسلمان ملک کے حکمران کی غیرت نہ جاگی لیکن یہ ضرور تھا کہ شیشان اور داغستان کے گھروں میں آج بھی مائیں اپنے بچوں کو امام شامل ؒ کے کارنامے ضرور سنایا کرتی تھیں۔

شمشیر خان فارسی میں اس سے بات کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں موجود پُر اسرار سی چمک فیضان اوغلو کو اپنی آنکھوں کے رستے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

افغانستان کے اسی جہاد میں دنیا بھر کے مسلمان حصہ لے رہے تھے لیکن کسی شیشانی مجاہد سے یہ اس کا پہلا تعارف تھا اور اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ شمشیر خان آخر یہاں تک پہنچ کیسے گیا............

اسے بطور خاص یہاں فیضان اوغلو کے پاس بھیجا گیا تھا۔ دونوں میں قدر مشترک روسی زبان سے آشنائی تھی اور کابل شہر میں کسی بڑی کاروائی کے لئے شمشیر خان بڑی مناسب مدد دکھائی دے رہا تھا۔

''مہمان کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گے''؟

ناظر خان نے اسے احساس دلایا تو وہ چونکا ورنہ تو ابھی تک وہ شمشیر خان میں ہی کھویا ہوا تھا۔

تینوں تھوڑی دیر بعد اس غار نما کمرے میں قہوے کی پیالیاں سامنے رکھے بیٹھے تھے شمشیر خان اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ بھی فیضان اوغلو کی طرح ماسکو یونیورسٹی کا فارغ التحصیل تھا اسے بھی روسی نظریاتی تعلیم کے لئے اپنے ساتھ ماسکو لے گئے تھے۔

''ارغون'' سے منتخب ہونے والے بیس نوجوانوں میں وہ بھی شامل تھا یہ انتخاب ان کی مرضی سے نہیں بلکہ جبر سے ہو رہا تھا۔

اس کے دادا قاضی کا کلیجہ پھٹنے کو آ رہا تھا جب اسے علم ہوا کہ شمشیر خان کو زبردستی ماسکو لے جایا جا رہا تھا کیونکہ اس نے شمشیر خان کی تربیت ایک خاص مقصد اور مشن کے لئے کی تھی اور اس کا نام بھی افغانیوں جیسا رکھا تھا کیونکہ وہ خود اپنی جوانی کے سات قیمتی سال افغانوں کے ساتھ گزار چکا تھا اور افغانستان میں روسیوں کے خلاف ہونے والی مزاحمت کی خبریں سن کر اس کا دل گواہی دینے لگا تا کہ اب وہ ساعت سعید آ گئی ہے جس کا اسے مدتوں سے انتظار تھا۔ وہ جانتا تھا کابل میں طلوع ہونے والے آزادی کے سورج کی روشنی سے جلد ہی اس خطے کی تمام مسلم ریاستیں جنہیں جبراً روس کا حصہ بنایا گیا تھا آزاد ہو جائیں گی اور ایک مرتبہ پھر وہ امام شامل ؒ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن............

یہ خبر بجلی بن کر گری تھی کہ اس کے پوتے کو ماسکو لے جایا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ نجانے کیوں پُر امید تھا۔

بچپن سے وہ شمشیر خان کو افغان شہسواروں کے قصے سناتا آیا تھا۔ اس نے اپنی خاندانی زبان فارسی کو کبھی نہیں بھلایا تھا۔ روسی حکومت کے بے پناہ تشدد پابندیوں اور آہنی ہتھکنڈوں کے باوجود شیشان کی بیشتر مسلم آبادی کے بزرگ نہ صرف اپنے گھروں میں اذانیں دیا کرتے تھے بلکہ اپنے بچوں کو فارسی پڑھایا اور لکھایا کرتے تھے............

فیضان اوغلو کے سامنے بیٹھا شمشیر خان اپنی کہانی اسے سنا رہا تھا اور فیضان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اسے گردوپیش کی کوئی خبر نہیں رہی تھی..........

شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کی نماز کے لئے مؤذن نے اذان دینا شروع کر دی تھی جب وہ تینوں غار سے برآمد ہوئے اس دوران فیضان اور شمشیر خان بہترین دوست بن چکے تھے۔

دونوں نے ماسکو کی درسگاہوں کے قصے ایک دوسرے کو سنائے تھے اپنی یادیں تازہ کی تھیں۔

گو کہ فیضان کی ماسکو سے بڑی تلخ یادیں وابستہ تھیں وہ ویلنٹینا کو کبھی بھلا نہیں پایا تھا۔ ماسکو کے ذکر کے ساتھ ہی نجانے کیوں ویلنٹینا اسے ضرور یاد آ جاتی تھی۔

ناظر خان نے اسے کمانڈر مجددی کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا جس پر اس نے شمشیر خان کی مدد سے عمل کرنا تھا۔ دونوں کو اگلے دو تین روز میں کابل جانا تھا۔ انہیں روسی فوجیوں کی چھاؤنی میں گھس کر نہایت اہم مشن انجام دینا تھا..........

اور وہ دونوں بڑے پُرامید تھے کہ انشاءاللہ یہ مشن ضرور انجام دیں گے۔

☆☆

تیسرے روز دونوں اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ خفیہ راستوں سے سفر کرتے اور مجاہدین کے مختلف ٹھکانوں پر قیام کرتے وہ دونوں اگلے دو روز میں اپنے ٹارگٹ تک پہنچ گئے تھے۔

انہیں کابل کے "شہرنو" میں اس مضبوط روسی کیمپ کو اڑانا تھا جس نے اب قریباً گاؤں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہاں ہر وقت روس کے تازہ دم کمانڈوز موجود رہتے تھے جن کی تعداد کبھی پچیس اور کبھی پچاس ہو جاتی تھی۔ ان کمانڈوز کو بطور خاص کابل میں مجاہدین کی ممکنہ مزاحمت کا مقابلہ کرنے کے لئے رکھا جاتا تھا اور انہیں "دہشت گردی" سے نمٹنے کے لئے بطور خاص تربیت دی گئی تھی۔

فیضان اور شمشیر منصوبے کے عین مطابق اور طے شدہ وقت پر یہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے روسی زبان کا سہارا لیا اور روسی "سپاہیوں" کی وردیوں میں ملبوس دونوں مجاہد چھاؤنی کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں شمشیر خان نے جو "بارود" لگانے کی بطور خاص تربیت حاصل کر چکا تھا اس طرح چھاؤنی میں بارود لگایا کہ جب اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچ کر انہوں نے ریموٹ کے ذریعے بارود کو پھاڑا تو ان دھماکوں سے سارا کابل لرز گیا۔

☆☆

پندرہ منٹ میں روسی کمانڈوز کی یہ چھاؤنی راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی اور اگلے تین گھنٹے بعد وہ دونوں بخیر و عافیت اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔ یہ دونوں کی دوستی کی ابتدا تھی..........

اس کے بعد انہوں نے کئی معرکوں میں اکٹھے حصہ لیا۔ وہ روسیوں کے ٹھکانوں میں گھس کر کاروائیاں کرتے رہے۔ روسیوں کے لئے ان

پُراسرار مجاہدین کی سرگرمیاں بڑی پریشان کن تھیں۔ ایسی ہر کاروائی کو مغربی میڈیا میں بھرپور کوریج دی جا رہی تھی اور روسیوں کو بسا اوقات بہت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ آخر یہ کون سا گروپ ہے جسے بطور خاص اس بات کی تربیت دے کر بھیجا گیا ہے۔

روسیوں نے حسب عادت یہ کاروائی بھی سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے کھاتے میں ڈال دی اور کابل کی مرکزی کمانڈ کی طرف سے کے جی بی ہیڈکوارٹر کو ایک تفصیلی رپورٹ اس ضمن میں بھیج دی گئی جس میں کچھ مفروضات قائم کرنے کے بعد ان کاروائیوں کا ذمہ دار ان دونوں ایجنسیوں کو ٹھہراتے ہوئے مدد کی درخواست کی گئی تھی۔

اب کے جی بی کی مرکزی کمان نے اس معاملے کو خود ہینڈل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد وہ لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کام انہیں اپنے دیرینہ دوستوں سے لینا چاہئے............اور ان کا یہ دیرینہ دوست بھارت ہی تھا۔

بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ان کے لئے پہلے بھی افغانستان میں کئی مشن انجام دے چکی تھی۔ اور کے جی بی کی طرح ان کے بھی افغانستان میں اڈے اور ایجنٹ ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ پھر اگلے ہی روز روس کے ایک ''خصوصی مشن'' کو لے کر ایک روسی مگ ماسکو سے دہلی کی طرف محو پرواز تھا.............!!

جال

پالم پور پر چھائے سکوت کو روسی مگ کی آواز نے ہی توڑا تھا۔ جیسے ہی وہ ریڈار کی رینج میں آیا۔" پالم پور کا A-T-C (ائیر ٹریفک کنٹرول) بیدار ہو گیا۔ کرنل سارنگ خود کنٹرول روم میں بیٹھا تمام امور کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہوائی اڈے کی عمارتوں میں سوائے پہرے والوں کے گشت کرنے کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کرنل سارنگ کے سامنے رکھے ہوئے ٹرانسمیٹر میں جیسے ہی زندگی کی لہر دوڑی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کافی کے مگ کو ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ پوری طرح متوجہ تھا۔

"کمانڈ اسٹینڈنگ۔ اوور.............!"

"ریڈ سکوائر۔ داخل ہو گیا سر! اوور۔"

"آل رائٹ۔ نو کنٹیکٹ۔ اوور۔ آؤٹ"

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں آرمی انٹیلی جنس آفیسر بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اب وہ تینوں کنٹرول روم میں موجود تھے۔

"ریڈ سکوائر۔ ریڈ سکوائر۔ پالم پور ہوشیار رہے اوور".............!!

جیٹ سے پیغام آ رہا تھا۔

"ریڈ سکوائر" پالم پور موجود ہے اوور۔" کرنل سارنگ نے مائیک اپنے منہ کے قریب کر لیا تھا۔ اس اثناء میں اس کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک جس نے گروپ کیپٹن کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس بڑی سی سکرین کے سامنے مائیک تھام کر کھڑا ہو چکا تھا جس میں مختلف لہریں ابھرا ابھر کر غائب ہو رہی تھی۔

"راہنمائی پالم پور۔ اوور" جیٹ سے پیغام آیا۔

اس کے ساتھ ہی گروپ کیپٹن نے کنٹرول سنبھال لیا۔

"ریڈ سکوائر۔ نارتھ۔ 45 ڈگری۔ اوور۔"

"لیس پالم پور۔ اوور۔"

اب سکرین پر لہریں کافی واضح ہو رہی تھیں۔

"70 ڈگری ایسٹ۔ ریڈ سکوائر۔ اوور۔"

"مجھے ہوائی اڈے کی عمارت نظر آ رہی ہے۔ اوور۔" جواب ملا۔

"ریڈ سکوائر۔ 50 ڈگری شمال کی طرف آؤ اور ریڈنگ کرو۔ اوور.........

"او کے پالم پور۔ اوور"

اب صرف ایک ہی لہر باقی رہ گئی تھی جو تیزی سے حرکت کر رہی تھی اور ساتھ ہی ایک تیز آواز ابھرنے لگی۔

"پالم پور اٹمشن پلیز۔ ففٹی + فورٹی + تھرٹی + ٹوئنٹی + ٹن + زیرو۔"

"ڈاؤن........." گروپ کیپٹن نے تیزی کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی لہر پر نظریں جما رکھی تھیں۔

دوسری طرف کرنل سارنگ اور اس کا دوسرا ساتھی جس نے آرمی میجر کی وردی پہن رکھی تھی۔ آنکھوں سے دوربین لگائے رن وے پر جلتی بجھتی بتیوں کو دیکھ رہے تھے۔ دیو ہیکل جیٹ کی گڑگڑاہٹ ان کو صاف سنائی دے رہی تھی چند لمحوں کے بعد ہی جہاز نظر آ گیا۔

"ریڈ سکوائر، تم ٹھیک آ رہے ہو۔ ٹیکسی ٹریک نمبر 5 تمہارے سامنے ہے۔ اوور۔" گروپ کیپٹن نے کہا۔

"لینڈنگ، پالم پور۔ اوور۔" جواب آیا۔

"گڈ لک آؤٹ۔"

گروپ کیپٹن نے اپنے سر کے گرد اگرد لپیٹا ہوا مائیک اتار کر سامنے میز پر رکھ دیا۔

☆☆

"کیپٹن! تعاون کا شکریہ۔ مجھے امید ہے کہ ہائی کمان کے احکامات تم نے سمجھ لئے ہوں گے۔ کرنل سارنگ اور اس کا ساتھی گروپ کیپٹن ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے۔ وہ دونوں باہر پہلے سے موجود ایک کار میں تیز رفتاری سے جیٹ کا تعاقب کر رہے تھے جو اب رن وے کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ انجن ابھی تک سٹارٹ تھے۔ پھر یک لخت انجن بند ہو گئے۔

کے جی بی کی خاص ہدایت تھی کہ طیارے کے نزدیک کوئی گاڑی یا ہوائی اڈے کا کوئی رکن نہیں آئے گا۔ اس لئے کرنل سارنگ اور اس کا ساتھی ہی طیارے کے قریب پہنچے جیسے ہی طیارے کے نزدیک پہنچے خاکی کپڑوں میں ملبوس ایک روسی ان کی طرف بڑھا۔ وہ چند لمحے پہلے ہی کاک پٹ سے برآمد ہوا تھا اور اب ہاتھ میں ایک بریف کیس پکڑے ان کی طرف آ رہا تھا۔ نہ جانے اس کے چہرے پر کیا لکھا تھا کہ جیسے وہ ان کے نزدیک آیا کرنل سارنگ اور اس کے ساتھی کے ہاتھ خود بخود سیلوٹ کے لئے اٹھ گئے۔

"کرنل جہاز کو فوراً اپن ڈراپ ایریا (جہاز کے چھپنے کی جگہ) بتاؤ"

اس نے چھٹتے ہی کہا۔

"او کے سر۔" کرنل نے کار کا دروازہ کھول کر اس میں لگے ٹرانسمیٹر کے ذریعے کسی کو حکم دیا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کے انجن دوبارہ جاگ پڑے۔

جب تک جہاز خفیہ مقام پر کیموفلاج نہیں ہوا، روسی وہیں موجود رہا۔ ہوائی اڈے پر موجود ایئر فورس ”پروسٹ گارڈز“ نے اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ جہاز کا پائلٹ جہاز ہی میں رہ گیا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ انڈین ایئر فورس کے آفیسران میں سے کوئی بھی اس جہاز کو چیک نہ کر سکے۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ تینوں کرنل سارنگ کی کار میں تیز رفتاری سے ہوائی اڈے سے باہر جا رہے تھے۔ کے جی بی کے آفیسر نے بریف کیس کو اپنی کلائی میں ایک زنجیر سے لاک کیا ہوا تھا۔

انڈیا کے سنٹرل انٹیلی جنس بیورو کے ہیڈ کوارٹر میں جنرل مہتہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ آج وہ صبح سے ہی دفتر میں موجود تھا۔ فارن منسٹری کے ایک خاص حکم کے تحت اس سے کہا گیا تھا کہ ”مہمان“ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔ لیکن کس سلسلے میں؟

اس کی نشاندہی فارن آفس بھی نہیں کر سکا تھا۔

وزیر خارجہ نے اس سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ معاملہ اہم اور انتہائی خفیہ نوعیت کا ہے۔ خود اس کو بھی علم نہیں۔ وزیر اعظم نے براہ راست اس کو حکم دیا تھا۔!!

تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ ایک سرخ وسپید لمبے تڑنگے روسی جرنیل کا استقبال کر رہا تھا جو جیٹ سے نکلنے کے بعد ایک دوسری گاڑی سے ان کے تعاقب میں آ رہا تھا۔

”جنرل ایوانوچ ترگنیف“ اس نے جنرل مہتہ کو سرد کو آنکھوں سے گھورتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اور جنرل مہتہ فوراً سمجھ گیا کہ اس کے سامنے کے جی بی کا ڈپٹی ڈائریکٹر کھڑا ہے۔

وہ اسے اپنے خصوصی کمرے میں لے گیا۔ جنرل مہتہ نے صبح سے اب تک جو اعصابی جنگ اپنے آپ سے لڑی تھی اس کے بعد وہ خود کو خاصا تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ روسی جرنیل سے صبح ہی مذاکرات کیے جائیں۔ یہی سوچ کر جب ایک موقع پر روسی جنرل نے اصل معاملے کی طرف آنا چاہا تو اس نے کہا۔

”جنرل میرے خیال سے اب آپ آرام کیجئے ہم صبح بات کریں گے۔“

ابھی تک روسی جنرل نے بیٹھنے کا تکلف بھی نہ کیا تھا۔ اس کا جواب مہتہ کے لئے خاصا خلاف توقع تھا۔

”جنرل اپنے بزنس میں دن رات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ آؤ پہلے مطلب کی بات کریں۔“

اس نے ایک آرام دہ کرسی پر جو جنرل مہتہ کی میز کے سامنے رکھی تھی بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کم آن جنرل۔“

مہتہ نے تھکے تھکے لہجے میں اسے جواب دیا۔ پھر اس نے فون پر سیکرٹری کو کافی لانے کی ہدایت کی۔ اسے بادل نخواستہ جنرل ترگنیف کی بات ماننا پڑی کیونکہ ہدایات جو اسے فارن آفس سے ملی تھیں۔ گو کہ غیر مبہم تھیں لیکن خاصی سخت ......

جنرل ترکنیف نے اپنی کلائی کے گرد سختی سے بندھا ہوا بریف کیس اب کھول کر سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔ جیسے ہی کافی کی تیاری کی اطلاع ملی جنرل مہتہ خود اٹھ کر باہر آ گیا۔ پھر وہ ایک ٹرے میں کافی کے دو مگ رکھے اندر آ گیا۔

☆☆

چند منٹ کے بعد وہ دونوں ایک فائل پر جھکے ہوئے تھے۔

''یہ ہے وہ شخص اور ہماری اطلاعات کے مطابق یہ اس وقت اسی علاقہ میں ہے۔ ہنزہ کے نزدیک ''خلد آباد'' یا ''چالت'' دونوں میں سے کسی ایک جگہ موجود ہے۔ عموماً یہ جلال آباد میں ملتا ہے اور باغیوں کے طاقتور گروپ کی عملاً کمان اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے خاتمے میں افغان باغیوں کا ایک مضبوط گروپ اپنی موت آپ مرجائے گا اور یہ کام تمہارے آدمیوں نے کرنا ہے۔''

جنرل ترکنیف نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر جنرل مہتہ کی طرف دیکھا۔ جو ابھی تک اسی کے خدوخال میں کھویا ہوا تھا۔ ایک ۲۵ سالہ بھرپور اور نوجوان پٹھان جس کے گلے میں دوربین لٹکی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں کلاشنکوف رائفل تھامے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر پٹھانوں والی ٹوپی بھی نظر آ رہی تھی۔

''اس کا نام کیا ہے؟'' جنرل مہتہ نے پوچھا۔

''فیضان ...... فیضان اوغلو...... لیکن یہ بھی یقینی نہیں۔ زیادہ تر وہ یہ نام استعمال کرتا ہے۔'' ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے مہتہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اس سلسلے میں تمہیں ہر قسم کی مدد مل جائے گی۔ ہماری تحقیقات کے مطابق جلال آباد اور کابل میں مقیم انڈین ہندو جو خاصی تعداد میں آباد ہیں اس کام کے لئے مناسب ہیں۔ میں تمہیں یہ بات بھی بتا دوں کہ اس سے پہلے ہم نے دس کمانڈوز کا ایک گروپ جس کی قیادت ایک افغانی میجر کر رہا تھا اس کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ باقی افراد تمام کے تمام کے۔ جی بی کے تربیت یافتہ تھے لیکن حیرت ہے کہ ہمیں آج تک ان میں سے نہ تو کسی کی لاش دستیاب ہو سکی ہے اور نہ ہی ان کا کوئی پیغام مل سکا...... حالانکہ وہ جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔ جی۔ آر۔ یو کے تربیت یافتہ اور اپنے متعلق کسی بھی قسم کی اطلاع دینے پر اچھی طرح، قادر نہ جانے ان کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا......''

روسی جنرل نے سگار کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں اب تمہارے ذہن میں کون سا منصوبہ ہے؟'' جنرل مہتہ نے سگریٹ کی ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''دھوکے سے حملہ! ہمارے آدمی اس کے مسلسل تعاقب میں ہیں۔ لیکن ابھی تک سوائے اس کی ایک کمزوری کے اور کوئی اہم بات ہمارے علم میں نہیں آ سکی۔''

''وہ کیا؟'' مہتہ نے خاصی بے چینی دکھائی۔

''وہ اپنے ساتھیوں سے ملنے ضرور جلال آباد، کابل وغیرہ جاتا ہے۔ شہروں میں اکثر آپریشن وہی ترتیب دیتا ہے۔ یہ شخص ماسکو کا تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن جدید تہذیب سے بالکل کورا۔''

میں اسے دیکھوں گا جنرل۔''

مہتہ نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اس مشن کی اہمیت سے تم بخوبی آگاہ ہو گے۔ سوائے تمہارے پرائم منسٹر کے اور کسی کے علم میں کچھ نہیں آنا چاہئے۔''

جنرل ترگنیف کا لہجہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ کسی محکوم سے گفتگو کر رہا ہو۔

''مجھے اپنے فرائض کا بخوبی علم ہے جنرل۔ اور ہمارے اپنے بھی کچھ اصول ہیں جن کے لئے ہم مشوروں کے محتاج نہیں۔''

جنرل مہتہ نے بظاہر یہ بات مسکراتے ہوئے کہی تھی۔ لیکن اس کے لہجے کی تلخی کے۔ جی۔ بی کے نمائندے نے بھی محسوس کر لی تھی۔

''او کے جنرل گڈ لک۔ اب ہم کامیابی کا جشن اکٹھے ہی منائیں گے۔ مجھے اسی وقت واپس جانا ہے۔'، جنرل ترگنیف کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ بخوبی دیکھی جا سکتی تھی۔

☆☆

تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ اپنے جیٹ کی طرف واپس جا رہا تھا بظاہر تو مگ کی شکل دی گئی تھی لیکن وہ روسی فضائیہ کا خطرناک جیٹ طیارہ تھا جس کے متعلق ابھی تک بیرونی دنیا کو کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس اہم طیارے کے متعلق تمام معلومات خفیہ رکھی گئی تھی اور اس کو صرف کے جی بی ہی استعمال میں لاتی تھی۔ ابھی تک ریڈ آرمی کو بھی یہ طیارے نہیں دیئے گئے تھے۔

کرنل سارنگ ایک مرتبہ پھر اس کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے آیا تھا۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے تھے اور وہ ساری رات دوسرے کمرے میں بیٹھا اونگھتا رہا تھا۔ ان لوگوں نے ''خصوصی ہدایات'' پر بڑے زبردست ڈسپلن کا مظاہرہ کیا تھا کرنل سارنگ کی ڈیوٹی ہی یہی لگائی گئی تھی کہ وہ انڈین ایئر فورس کے کسی بھی کارکن کو اس طیارے کے نزدیک نہ پھٹکنے دے۔ اسے اس ''بیہودہ ڈیوٹی'' پر غصہ تو بہت آیا تھا کیونکہ یہ کام تو معمولی سپاہی بھی کر سکتے تھے جو کام اس سے بھارتی انٹیلی جنس نے لیا تھا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ معاملہ واقعی خاصا اہم اور حساس ہے۔

چندو مل کا شمار کابل کے متمول لوگوں میں ہوتا تھا۔ تقسیم سے پہلے اس کا کاروبار پشاور سے کابل تک پھیلا ہوا تھا لیکن تقسیم کے بعد وہ سمٹ کر جلال آباد تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے انڈیا میں بھی خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ تقسیم کے فوراً بعد ہی اس کو انٹیلی جنس نے اپنا آلہ کار بنا لیا تھا۔ چندو مل کو حقیقت میں بھارتی انٹیلی جنس کی بنیاد کابل میں رکھنے کا اعزاز حاصل تھا......

اس کی جہاندیدہ آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ سرحدی گاندھی کے ناپاک عزائم کا منہ کالا ہونے کے باوجود ابھی تک سرحد کے دونوں اطراف ورغلائے گئے پٹھانوں کے کچھ ایسے گروہ موجود ہیں جن کی مدد سے وہ اپنی قوم کے ان مذموم مقاصد کو بروئے کار لا سکتا تھا جس کی حسرت ہی دل میں لے کر کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر ''اکال چلنا'' کر گئے تھے۔

ایک ہندو ہونے کے ناطے اس کی رگ رگ میں مسلم دشمنی سمائی تھی...... خصوصاً ہندوستان کی تقسیم نے اسے نظریاتی دھچکا ہی نہیں خاصا مالی دھچکا بھی لگایا تھا اب کم از کم وہ پاکستانی علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے پاکستان کے قیام کو دوسرے بہت سے ہندوؤں کی طرح اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اور بھارتی انٹیلی جنس کے تعاون سے اب اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر رہا تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک اس میں بوڑھوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔

کابل میں آنے والا کوئی بھی انڈین سفیر سب سے پہلے اس سے ملاقات کرتا تھا۔ اس کی دہلی میں بے شمار جائیداد تھی اور اپنے دولڑکوں اور ایک لڑکی کو اس نے وہیں رکھا ہوا تھا۔ کابل میں اس کے دولڑکے اور دولڑکیاں اور موجود تھے خود لالہ چندمل کبھی افغانستان میں رہتا اور کبھی دہلی میں۔

اس کی کابل میں جلال آباد کے علاوہ افغانستان کے تقریباً سارے ہی بڑے بڑے شہروں میں آڑھت کی دکانیں تھیں جبکہ اس کے لڑکوں نے یہاں ٹرانسپورٹ کا کام سنبھال رکھا تھا اور ان کے ٹرک کابل سے انڈیا تک آتے جاتے تھے۔ آج کل وہ دہلی آیا ہوا تھا۔

اس روز جیسے ہی صبح صبح لالہ جی مندر سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو ایک اہم اطلاع ان کی منتظر تھی۔ اپنے ''دوست'' کا پیغام موصول ہونے پر فوراً صفدر جنگ روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اس کا ''دوست'' کرنل سارنگ اس کا منتظر تھا۔

صفدر جنگ روڈ نئی دہلی کے ان علاقوں میں شامل ہے جہاں زیادہ تر سرکاری دفاتر واقع ہیں یا حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کے شاندار بنگلے یہاں بنے ہوئے ہیں۔ ان دفاتر میں ایک دفتر جس پر بظاہر سوشل ویلفیئر کا بورڈ لگا ہوا تھا اس میں ''را'' کا دفتر قائم تھا۔ انڈین انٹیلی جنس کے مختلف یونٹ ایسی ایک متحدہ کمان کے تحت کام کر رہے تھے۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ آتے تھے جو ''را'' کے ''ذرائع'' ہوتے تھے، انہیں ''مہمان'' کہا جاتا تھا۔ جن کے ذریعے وہ غیر ممالک میں کام کرتے تھے لیکن کیا مجال کہ ایک ''مہمان'' دوسرے ''مہمان'' کی شکل بھی دیکھ پائے۔

☆☆

آج جیسے ہی لالہ چندویل اپنے اسی مخصوص کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ پچھلے بیس سال سے آ جا رہا تھا۔ اس نے پچھلے تین سالہ ''دوست'' کرنل سارنگ کو بڑی بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔ اس سے پہلے آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے ''دوست'' کو پہلے ہی سے منتظر پایا ہو۔ اس کی جہاں دیدہ اور مکار آنکھوں نے کرنل سارنگ کا چہرہ دیکھتے ہی معاملے کی سنگینی کا احساس کر لیا تھا۔

معمول کے مطابق کرنل سارنگ نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کے لئے چائے منگوائی اور ادھر ادھر کی ہنکنے کے بعد جلد ہی مطلب کی طرف آ گیا۔ اس نے پہلے تو لالہ چندمل کو کرید کرید کر جلال آباد، کابل اور گردونواح کے تازہ حالات پوچھے پھر وہ لالہ کو اصل موضوع کی طرف لے آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب کرنل سارنگ نے اس کے سامنے وہ تصویر رکھی تو لالہ اندر ہی اندر کانپ اٹھا لیکن اس نے اپنی کسی حرکت سے بے چینی یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بہرحال ایک گھاگھ ایجنٹ تھا۔

''اسے جانتے ہو لالہ؟''

لالہ اسے بخوبی جانتا تھا۔ فیضان کو کون نہیں جانتا تھا لیکن وہ انجان بنا رہا۔

''نہیں مہاراج لیکن صورت کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔''

اس نے اپنی روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''بہر حال اسے جاننے کی کوشش کرو۔ لالہ اس شخص کو جتنی جلدی ممکن ہو قتل کر ڈالو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اور ''ماسٹر'' نے اس کا خصوصی حکم دیا ہے۔''

کرنل سارنگ نے اپنی سرد آنکھیں لالہ چندو مل کے چہرے پر مرکوز کر رکھیں تھیں۔ وہ اس کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل تلاش کر رہا تھا لیکن لالہ جوں کا توں ہی تھا۔ اس نے اپنے چہرے سے گھبراہٹ بالکل نہیں ظاہر ہونے دی۔ کیونکہ وہ اپنے کھیل کے اصول اچھی طرح جانتا تھا۔

''ٹھیک ہے مہاراج۔ پہلے تو یہ پتہ لگانا ہے یہ ہے کون؟''

اس نے سارنگ کی تسلی کروادی۔

''تمہیں کابل میں ہمارے ''سرخ دوست'' ملیں گے۔ ان سے مکمل تعاون کرو۔ فی الحال تمہیں انہی کے لئے کام کرنا ہے۔''

کرنل سارنگ نے اس کو مزید ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

جب لالہ چندو مل صفدر جنگ روڈ سے واپس اپنے گھر ''کناٹ پلیس'' آ رہا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ایک موٹر سائیکل سوار نے اس کے گھر سے یہاں تک اس کا پیچھا کیا ہے' موٹر سائیکل سوار اب دوسری سڑک پر مڑ گیا تھا۔ وہ دہلی کے ایک عام سے ہوٹل کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

اس نوجوان نے جو صبح ہی سے اپنی موٹر سائیکل سمیت لالہ چندو مل سے چپکا ہوا تھا اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر لی تھی۔ اس نے لالہ کو اپنے گھر سے ''سوشل ویلفیئر'' کے دفتر تک جاتے اور واپس آتے دیکھا تھا اور اس دفتر کے متعلق وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا......!

☆☆

دوست آور خان بائیس سالہ نوجوان تھا اور اس سے پہلے بھی متعدد بار وہ انڈیا آ چکا تھا۔ اس کا والد فروٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے دوست آور خاں کو انٹرمیڈیٹ کرنے کے کچھ عرصہ بعد دہلی کے ایک کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ جہاں وہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

دوست آور خاں کے والد نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن اس کا بیٹا اس کا ہم خیال نہ ہو سکا۔ جتنا اس کے والد نے دوست آور خاں کو مذہب سے دور رکھنا چاہا اتنا ہی وہ مذہب کے نزدیک آتا گیا۔ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا مغربی تعلیم و تہذیب پانے کے بعد افغانستان کی برسر اقتدار پارٹی میں کوئی اہم مقام حاصل کرے۔ اس طرح وہ تجارت کے علاوہ سیاست میں بھی اپنی ایک حیثیت منوا سکتا تھا۔

اس کی جہاندیدہ نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ افغانستان میں ظاہر شاہ نے روس کو بے انتہا سہولتیں فراہم کر دی تھیں اور روس کے متعلق اس کے بڑے بوڑھوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ امداد کے ساتھ ساتھ ''انقلاب'' بھی ایکسپورٹ کرتا ہے، بلکہ وہ جو بھی امداد دیتا ہے ''انقلاب'' کے لئے دیتا ہے۔ پھر شاہی خاندان میں وہ عنصر آہستہ آہستہ اہم عہدوں پر قبضہ کرتا جا رہا تھا جسے روس کی آشیر واد حاصل تھی اور ان لوگوں کے نظریات بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔

ایک طرف تو وہ لوگ افغانستان کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی آڑ میں دھڑا دھڑ سرخ لٹریچر اور بے حیائی امپورٹ کر رہے تھے اور دوسری طرف "پختونستان" کے مسئلے کو خواہ مخواہ ہوا دے رہے تھے تاکہ ایک نیا مسئلہ اپنے آقاؤں کے اشارے پر کھڑا کر کے پاکستان کو بھی اس لڑائی کا فریق بنالیں۔

یہی وہ شواہد تھے جن سے دوست آور خاں کے والد نے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ پھر اس کے لگائے ہوئے اندازے کے عین مطابق ایک روز افغانوں نے سنا کہ ظاہر شاہ کی موجودگی میں اس کے دست راست نے راتوں رات حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے؟ اس کے نظریات کیا ہیں؟

اس کے متعلق کسی بھی باشعور افغانی کو کوئی شک نہیں تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چند مہینوں کے اندر ہی روس کے ہزاروں فوجی مختلف بھیس بدل کر افغانستان میں چلے آئے۔ پھر تو منصوبوں کا ایک سلسلہ ہی شروع ہو گیا اور "مشاوروں" کی ایک بڑی فوج افغانستان میں در آئی اور یکے بعد دیگرے تین انقلاب افغانستان کا مقدر بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی روس نے "دوستی کا زبردستی حق" ادا کرتے ہوئے اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج افغانستان میں اتار دی۔

دوست آور خاں صدر داؤد کے عہد حکومت میں کابل کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جب اس کی ملاقات زور آور خاں سے ہوئی تھی۔ زور آور کے متعلق کالج میں عجیب عجیب افواہیں گشت کرتی تھیں لیکن ایک بات جو عام طور پر اس کے متعلق کہی جاتی تھی وہ یہ کہ وہ ملاؤں کا خاص آدمی ہے اور ملا ہمیشہ سے دوست آور خاں کی کمزوری رہے تھے۔

اس کے لاشعور میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ اس ملک کے نجات دہندہ اگر کوئی ہیں تو یہی ملا ہیں ورنہ تو سرخ عفریت جو اپنا بھیانک جبڑا کھولے اس کے وطن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ ایک روز وہ ان سب کو ہڑپ کر جائے گی۔ ان دنوں علماء نے غیر اسلامی حکومت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا تھا اور ان کے کئی پختون ساتھی طالب علم علماء کی اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

یہ لوگ عموماً خفیہ ہی اپنا کام کرتے تھے لیکن جب کبھی کسی کے متعلق شک ہو جاتا اور "پرچمی" یا "خلقی" اسے جان لیتے تو ایک روز چپ چاپ کالج سے گھر واپس جاتے ہوئے وہ غائب ہو جاتا تھا۔ اور پانچ چھ ماہ بعد اس کی لاش یا گرفتاری کی خبر اس شکل میں ملتی کہ بے اختیار دوست آور کے منہ سے مرنے والے کے لئے نعرۂ تحسین بلند ہو جاتا۔

کالج میں بھی عام شعبہ ہائے زندگی کی طرح دو متحارب گروپ موجود تھے ایک "روسی گروپ" اور دوسرا "ملا گروپ"۔ "روسی گروپ کے اراکین الاعلان دندناتے پھرتے تھے جبکہ ملا گروپ والے اپنا کام انتہائی رازداری سے کرتے۔ ہر طالب علم دوسرے پر شک کرتا تھا کہ مبادا اس کا ساتھی کے جی بی کا دوست نہ ہو!

اکثر یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ اچانک کالج سے گھر جاتے یا گھر سے کالج آتے "خاذ" کے لوگ کسی نوجوان کو جیپ میں بٹھا کر لے جاتے اور پھر مدتوں اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی تھی۔

دوست آور اور زور آور کی ملاقات پہلے پہل کابل کے ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ اسے زور آور پر اعتماد بحال کرنے میں کئی ماہ لگ

گئے تھے۔تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوا تھا کہ مجاہدین سے اس کا رابطہ قائم ہوا۔

اس کو مجاہدین نے جاسوسی کے لئے منتخب کر لیا تھا اور دوست آور کی تربیت کابل ہی کے ایک خفیہ ٹھکانے پر کی گئی تھی جلد ہی وہ پیغام وصول کرنے اور بھیجنے پر قدرت حاصل کر چکا تھا۔ان لوگوں کا کوئی باقاعدہ نظام تو تھا نہیں نہ ہی ان کے پاس جدید جاسوسی آلات تھے۔وہ اکثر زبانی پیغامات یا بذریعہ خط و کتابت اپنی مخصوص زبان میں اپنے پیغامات بھیجا کرتے تھے۔

دوست آور خاں یوں تو ہر سال چھٹیاں گزارنے اپنے والد کے پاس بھارت چلا جایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ وہ ایک خاص مشن پر آیا تھا۔ابھی تک اس کے دوست اور دیگر حلقے اسے ''ترقی پسند'' اور ''ملاازم'' کا مخالف ہی سمجھتے تھے۔اور اس نے بھی یہ نقاب اوڑھے رکھنے میں ہی مصلحت جانی تھی۔

لالہ چندولل کے متعلق مجاہدین کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں رہے تھے۔لیکن اس مرتبہ اس کی اچانک بھارت روانگی کو خصوصی شک کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔دہلی کا ایک معمولی سا ہوٹل جہاں افغان مہاجرین پناہ گزین تھے......

اصل میں مجاہدین کا ایک خفیہ اڈہ تھا،لیکن کے جی بی اور ''را'' کے ایجنٹ بھی انہیں میں موجود تھے۔جو مجاہدین کے ہمدرد ہونے کا بھیس بدل کر یہاں قیام پذیر تھے۔دوست آور کو خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس ہوٹل کے قریب بھی نہ پھٹکے۔وہ دہلی کے ایک شاندار ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔یہ ہوٹل اس کے لئے نیا نہیں تھا۔وہ اس ہوٹل کے عملے کے لئے اجنبی نہ تھا کیونکہ وہ ہر سال ان کا مہمان ہوتا تھا۔

اس کے والد کے درجنوں ہندو سکھ دوست اس کی میزبانی کو عزت افزائی جانتے تھے......

یہ الگ بات کہ اپنے لاشعور میں ان کے خلاف چھپی ہوئی نفرت کو وہ کبھی نہ نکال سکا اور وہ علیحدہ قیام ہی بہتر سمجھتا تھا۔پٹھانوں کی روایتی اسلام پسندی کا علم تو ہندو تاجروں کو بھی تھا۔اس لئے انہوں نے کبھی شراب و شباب کی محفلوں میں اس کی شمولیت پر ضد نہ کی تھی......اور ایک دو مرتبہ اسے دعوت دے کر اب چپکے ہو رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ پٹھان بچہ لاکھ ترقی پسند ہونے کے باوجود آخر پٹھان ہی ہے۔

اس مرتبہ بھی اس کے والد کے ایک سکھ دوست نے اسے موٹر سائیکل دے رکھی تھی۔جس پر وہ سارا دن گھومتا رہتا۔بادی النظر میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ صرف دہلی کی سیر کر رہا ہے لیکن وہ کیا کر رہا تھا؟اس کا علم اسے تھا یا خدا کی ذات کو۔مجاہدین کے مقامی نمائندے کو بھی اس کے مشن کی نوعیت سے بے خبر رکھا گیا تھا۔

اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ دہلی کے ایک مقامی ہوٹل کے باہر ہر روز گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ایک شخص کھڑا ہوگا جس سے مخصوص کوڈ کے تبادلے کے بعد اس کو اپنی معلومات ''نووارد'' کے حوالے کر دینا ہے اور آج جیسے ہی وہ اس مخصوص جگہ پر پہنچا ایک افغانی کو اس نے وہاں موجود پایا جو ایک دکان کے باہر بچھی بنچ پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔دوست آور بھی ایک مخصوص انگریزی اخبار خرید کر اس کے پاس جا بیٹھا۔چند سیکنڈ میں ہی ان کی شناخت کا مسئلہ طے ہو چکا تھا۔

شناخت کے بعد دونوں ایک ہو گئے اور تین بجے ایک فلم شو پر دہلی کے ایک سینما میں وہ دونوں اکٹھے ہی داخل ہوئے۔فلم کوئی خاص نہیں

تھی اور گیلری میں ان کے علاوہ صرف پانچ دس لوگ ہی نظر آ رہے تھے چند منٹ کے اندر ہی دوست آور کی جمع کردہ لالہ چندو مل سے متعلق معلومات اس افغانی تک منتقل ہو چکی تھی اور ہاف ٹائم سے پہلے ہی وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ دوست آور نے اس کی ہدایات کے مطابق پوری فلم کو بادل نخواستہ برداشت کیا اور شام کو وہ خاصا مطمئن اپنے ہوٹل کے کمرے میں موجود تھا۔

اس کو "مرکز" سے لالہ چندو مل کی سرگرمیوں میں کڑی نظر رکھنے کی ہدایت دی گئی تھیں اور اس نے یہ فرض بڑے احسن طریقے سے نبھایا تھا۔

اس کے ملاقاتی نے دوسرے ہی روز علی الصبح کابل میں اپنے ایک "دوست" کے لئے ایک ٹیلیفون بک کروایا اور اسے اپنی خفیہ زبان میں لالہ چندو مل کی دہلی میں سرگرمیوں سے مطلع کر کے مطمئن ہو رہا۔

گرفت

لالہ چندولی چند دنوں کے بعد ہی ایئر انڈیا کے ایک طیارے میں کابل کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس نے فیضان کی موت سے متعلق اپنے ذہن میں کئی منصوبے ترتیب دیئے تھے لیکن نجانے کیوں ایک بے کلی سی اسے لگی رہی۔ ایئر انڈیا کے طیارے نے جیسے ہی کابل پر لینڈ کیا روسی افواج کے مستعد دستے نے ایئر پورٹ کو گھیرے میں لے لیا۔

رات کا وقت تو ویسے ہی خطرناک تھا خاص طور پر پچھلے تین چار روز سے تو مجاہدین ایئر پورٹ اور اس کے اردگرد کے علاقے پر مسلسل حملے کر رہے تھے۔ ہوائی اڈے کا کنٹرول بھی فوج نے ہی سنبھال رکھا تھا اور جہاز کی آمدورفت کے موقع پر خاص طور سے وہ ہشیار رہا کرتے تھے......

جہاز کے مسافروں کی لسٹ ''انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ'' میں موجود تھی۔ ایک کلرک نے ٹائپ کرتے کرتے لالہ چندولی کا نام پڑھا تو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ اس نے اطمینان سے تمام لسٹ ٹائپ کی اور متعلقہ افسر کو پہنچا کر خود ایئر پورٹ کی کینٹین پر چائے پینے چلا گیا۔

افغان عملہ جہاں کہیں بھی کام کرتا تھا۔ اس کی ٹیلیفون ''کالیں'' خاص طور پر ٹیپ کی جاتی تھیں لیکن کینٹین میں لگے پرائیویٹ بوتھ کال کے متعلق کلرک کو یقین تھا کہ اگر وہاں سے کوئی پیغام دیا بھی تو وہ محفوظ رہے گا۔ چائے پیتے پیتے اس نے اٹھ کر بوتھ میں سکہ ڈالا، ایک نمبر ملایا۔

''رات کو دس بجے میں آؤں گا۔''

اس نے مختصر پیغام دے کر فون بند کر دیا تھا۔

اس کی توقع کے برعکس پیغام ٹیپ ہو چکا تھا لیکن کسی کو اس کا مطلب سمجھ میں نہ آسکا نہ ہی فون کرنے والے کا پتہ لگا نہ ہی اس نمبر کا جس پر فون ہوا تھا اور نہ ہی یہ اتنا اہم پیغام تھا کہ وہ اس پر مغز ماری کرتے۔ ایک مختصر پیغام ہی تو تھا کسی کو اپنی آمد کی اطلاع دی گئی۔

کے جی بی کے ٹی ایکسپرٹ نے ''بےضرر'' لکھ کر فائل آگے بڑھا دی۔

لالہ چندولی کو لینے کے لئے افغان فوج کی ایک جیپ وہاں موجود تھی جس میں روسی فوجی سوار تھے۔ وہ بغیر کچھ کہے چپ چاپ جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ جیسے ہی روانہ ہوئی اس کے ساتھ بیٹھے افسر نے اپنا تعارف کرایا۔

یہ کے جی بی کا مقامی افسر تھا لیکن لالہ چندولی نے اتنی صاف اور شستہ مقامی زبان بولتے آج تک کسی غیر ملکی کو نہ سنا تھا۔

''لالہ جی ہماری اطلاع کے مطابق فیضان جلال آباد میں موجود ہے۔ صبح تک تم جلال آباد پہنچ جاؤ گے۔ جلال آباد کی غلہ منڈی میں اس کی آمدورفت کی اطلاعات اکثر ملتی رہتی ہیں اگر تم کوشش کرو تو مقامی آدمیوں کی مدد سے اسے ٹھکانے لگانا کچھ مشکل نہیں۔

ہمارے مسلح آدمی سفید کپڑوں میں تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے بڑا مسئلہ ہے۔ جلال آباد کی مقامی آبادی کو کنٹرول

کرنا۔اس پر چھپ کر ہی حملہ ہو سکتا ہے۔اگر سر بازار اس پر حملہ کیا گیا تو جلال آباد ہمارے خلاف مقابلے میں ڈٹ جائے گا۔''

اس نے تھوڑے توقف کے بعد لالہ کو مخاطب کیا۔''میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا تم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو۔ہمیں روزانہ اپنے ساتھیوں کی چار پانچ لاشیں وہاں سے موصول ہوتی رہتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ جلال آباد کے شہریوں کی تلاشی بھی نہیں لی جا سکتی صرف خفیہ کاروائی کے ذریعے ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں اگر وہاں براہ راست حملہ کیا گیا تو ہر گھر مورچہ بن جائے گا۔تمہاری اصلیت کا علم ابھی کسی کو نہیں۔اس لئے ہماری بہت سی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔کام ایسے طریقے سے ہونا چاہئے کہ کسی کو کانوں کان پتہ نہ چل سکے۔''

''ایسا ہی ہوگا جناب۔ایسا ہی ہوگا۔''

لالہ چندو مل کے منہ سے بمشکل ہی یہ بات نکلی تھی۔وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر لرز کر رہ گیا کہ جب روسی اور افغانی مل کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تو بے چارہ چندو مل کس گنتی میں ہے۔کہیں وہ قربانی کو بکرا تو نہیں بن رہا۔

کابل کے ایک ہوٹل سے کچھ فاصلہ پر انہوں نے لالہ چندو مل کو اتار دیا۔رات اس نے کابل میں قیام کرنا تھا۔

☆☆

فیضان اوغلو کا نام اب جلال آباد کے شہریوں کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔اسے یہاں مجاہدین کے ایک طرح سے مقامی کمانڈر کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا نام جلال آباد کے بچے بچے کو ازبر تھا۔اس کے ساتھی شہباز کی طرح جھپٹتے تھے اور پل بھر میں روسی اور پٹھو افغان فوج کے کسی بھی گشتی سیکشن پر گھات لگا کر غائب ہو جاتے۔ایسے ہر مشن پر شمشیر خان اس کے شانہ بشانہ موجود رہتا تھا۔

دوست آور کی پہلی اطلاع نے ہی فیضان کو چونکا دیا تھا۔لالہ چندو مل پر اکثر مجاہدین شک تو کرتے تھے لیکن آج اس بات کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔فیضان کے لئے کابل میں چندو مل کو موت کے گھاٹ اتار دینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ان کے ائیر پورٹ والے ساتھی کی اطلاع موصول ہوتے ہی کابل میں مجاہدین حرکت میں آچکے تھے لیکن عین اس وقت جب وہ ہوٹل کو اپنے گھیرے میں لئے آگے بڑھ رہے تھے انہیں رک جانا پڑا۔جلال آباد سے ہنگامی حکم موصول ہوا تھا کہ لالہ چندو مل کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔

صبح اٹھ کر لالہ ایک پرائیویٹ بس کے ذریعے جلال آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔سار وبی کے نزدیک جیسے ہی بس ایک دونوں اطراف سے پہاڑیوں میں گھری سڑک میں داخل ہوئی۔ڈرائیور کو اچانک بریک لگا کر بس روکنا پڑی۔سامنے راستہ بند تھا۔بس رکتے ہی مجاہدین کے ایک دستے نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔انہوں نے کسی سواری کو کچھ نہ کہا صرف وہ خوف سے سہمے ہوئے چندو مل کو اپنے کندھوں پر ڈال کر انہی پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے۔جانے سے پہلے انہوں نے بس میں سوار افغانی مسافروں سے درخواست کی کہ وہ اس واقعہ کی اطلاع حکام کو نہ دیں۔

انہیں یقین تھا کہ غیور افغانوں نے جو انہیں دیکھتے ہی خوشی سے نعرہ لگانے لگے تھے۔ان کی یہ بات مان لی ہوگی۔لالہ چندو مل کے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس طرح اچانک وہ کچھ کرنے سے پہلے ہی ''گناہ بے لذت'' کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔وہ بچہ نہیں تھا جو یہ نہ

سمجھ پاتا کہ اس کو کس ''جرم'' میں اغوا کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تو وہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ دہلی میں بھی ان لوگوں کا کوئی ''ہمدرد'' موجود ہوگا۔ جس نے انہیں تمام اطلاعات پہنچائی ہیں۔

وہ لوگ لالہ چندومل کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے آئے اور یہ اطلاع لالہ پر بم بن کر پھٹی کہ دہلی میں اس کے ''را'' کے دفتر جانے کی اطلاع ان لوگوں کو ہو چکی ہے۔ فیضان اور شمشیر خان اس کی تفتیش کر رہے تھے۔ ان کی معلومات لالہ کے لیے پریشان کن تھی۔ اس نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ان لوگوں کے سامنے کوئی پیش نہ گئی اور لالہ سچ بولنے پر مجبور ہو گیا۔

دو گھنٹے کے اندر ہی اس نے مکمل ہتھیار پھینک دیے تھے۔ اس نے پچھلے گناہوں کے علاوہ اپنے موجود منصوبے کا بھی اقرار کر لیا تھا۔ مجاہدین کے علم میں وہ پناہ گاہ بھی آ چکی تھی جہاں سے بوقت ضرورت لالہ چندومل نے مدد حاصل کرنا تھی۔

لالہ کو مجلس شوریٰ کو سونپ کر وہ لوگ تیزی سے جلال آبادی کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے لگے۔

☆☆

تھوڑی دیر بعد ہی ایک پہاڑی کی اوٹ میں چھپے روسی فوج کے ٹرک پر افغان فوج کی وردیاں پہنے پندرہ مجاہدین شمشیر خان کی کمان میں جلال آباد کی طرف بڑھ رہے تھے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ اس نے سنبھال رکھی تھی وہ ایک اعلیٰ روسی افسر نظر آ رہا تھا۔'' راستے میں جہاں کہیں بھی ان کا ٹکراؤ کسی فوجی کنوائے سے ہوا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ آگے نکل جاتے۔ ہر فوجی سہما سہما اور خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ افغان فوجی تو خاص طور سے ایک دوسرے سے شرمندہ شرمندہ سے دکھائی دیتے تھے اور ایک دوسرے سے نظریں ملائے بغیر ہی آگے بڑھ جاتے تھے!

رات کے دس بجے کا عالم تھا جب جلال آباد کے ایک تھانے کے قریب ایک فوجی ٹرک آ کھڑا ہوا۔ وہ لوگ تھانے سے کچھ فاصلے پر ہی اترے تھے اور اب پیدل اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس تھانے میں کے جی بی کے تربیت یافتہ ایجنٹوں کا ایک مستعد دستہ کسی بھی فوری اطلاع پر کاروائی کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

وہ لوگ تھانے کی عمارت کے صحن میں مختلف گروپوں میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جب اچانک ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابھی ان کو یہ سمجھ ہی نہ آیا تھا کہ فائرنگ آسمان سے ہو رہی ہے یا زمین سے جب ان کے آدھے سے زیادہ ساتھی مارے گئے۔ اس سے پہلے باقی سنبھل کر پوزیشن سنبھالتے تھانے کی عمارت اچانک بھک سے اڑ گئی۔

صبح دس بجے ڈاک سے ایک لفافہ جلال آباد کی فوجی چھاؤنی میں مقیم روسی افواج کے کمانڈر کے نام موصول ہوا۔ کرنل میخائل بظاہر تو ایک فوجی مشیر کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا لیکن حقیقت میں وہ کے جی بی کا مقامی کنٹرول کمانڈر تھا۔ لفافہ تحقیق کے تمام مراحل سے گزر کر پانچ منٹ کے بعد اس کی میز پر اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے بے چینی سے لفافہ کھولا۔ جس میں سے ایک مختصر تحریر برآمد ہوئی۔

''سگ روس ایں افغانیان غیور راست، چیکو سلواکیہ نیست۔''

کمانڈر فیضان اوغلو۔

☆☆

لالہ کی موت جہاں بھارتی انٹیلی جنس کے لئے بہت بڑا المیہ تھی، اسی طرح فیضان اوغلو کا اس مرتبہ پھر شکنجے سے نکل جانا کے جی بی کیلئے کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا!!

وہ لوگ اس مرتبہ تو چکرا کر ہی رہ گئے تھے۔

ماسکو کے انتہائی شمال مغرب میں ایک پراسرار اور بہت قدیم عمارت کے ایک کمرے میں آدھی رات کے بعد بھی روشنیاں جاگ رہی تھی۔

ایک بڑی میز کے گرداگرد کے جی بی کے چار اعلیٰ افسران میز پر فائلیں پھیلائے بیٹھے تھے...... چاروں کے اعصاب کھنچے اور تنے ہوئے نظر آتے تھے اور صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سب لوگ ایک دوسرے کے لئے اپنے دلوں میں بجز نفرت اور کچھ نہیں رکھتے!

پھر چاروں میں سے ایک جوان میں سنیئر تھا اور جس کی وردی کے کندھوں پر چمکتے سٹارز کی قطار اس کے جرنیل ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ خونیں آنکھوں سے ان سب کو گھورنے لگا۔ یہ ''جی آر جو'' کی اس شاخ کا افسر اعلیٰ تھا جو افغانستان میں سکیورٹی کے معاملات کی نگرانی کر رہی تھی۔

''تم سب گدھے ہو......!''

اس نے کھڑے ہو کر اچانک ہذیانی انداز سے چیختے ہوئے ان تینوں کے لئے اپنا فیصلہ صادر کیا۔

''کامریڈ جرنیل''...... ایک نے کچھ کہنا چاہا۔

''شٹ اپ''...... وہ چلایا...... ''کل کا لونڈا تم لوگوں سے قابو نہیں آ رہا...... لعنت ہے تم پر......''

غصے میں وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ اس کے گلے کی رگیں پھولنے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ اگلی کوئی بات کہتا اچانک اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

''تینوں گدھے'' اپنی جگہ سہمے ہوئے بیٹھے تھے......!

ان کے دلوں میں اس جرنیل کے خلاف نفرت کے انگارے تڑپ رہے تھے۔ لیکن چہرے کے تاثرات پر انہوں نے اتنی ہوشیاری سے قابو پایا ہوا تھا کہ اگر وہ فوجی افسر نہ ہوتے تو دنیا کے بہترین اداکاروں میں ان کا شمار ہوتا۔

کھانسی کے خاتمے پر ''جی آر یو'' کا جنرل ولادی میروف ہانپتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا...... پھر اس نے اپنے سامنے دھرے بریف کیس میں سے ایک پلاسٹک کی شیشی نکالی اور اس میں سے ایک گولی ہتھیلی پر ڈال کر حلق میں انڈیل لی۔

اب وہ قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا۔

''کرنل میخائل شواخوف کو پرسوں میرے پاس رپورٹ کرنے کے لئے پیغام دے دو۔ میں ایسے گدھوں کو ایک منٹ کے لئے بھی

برداشت نہیں کرسکتا......اور ہاں۔"

اس نے اچانک ہی باری باری تینوں کی آنکھوں میں جھانکا......

"اب یہ معاملہ پریم کمانڈر کے پاس پہنچ چکا ہے۔"

تینوں جان سکتے تھے کہ اس بات کا مطلب کیا ہے۔اب انہیں مکمل خاموشی اختیار کرنا تھی اور یہ بھی بھول جانا تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی فیضان اوغلو نام کے کسی افغان باغی کا نام بھی سنا ہے......یا کے جی بی نے بھارتی انٹیلی جنس "را" کی مدد سے اسے قتل کرنے کے لئے کوئی منصوبہ بھی ترتیب دیا تھا۔

"گٹ آؤٹ"......وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دھاڑا۔

"کامریڈ جنرل"......تینوں گدھوں نے کھڑے ہو کر ایک ساتھ اسے سلیوٹ کیا۔اور اپنے اپنے بریف کیس بغل میں دبا کر باہر نکل گئے۔

جنرل ولادی میروف ان کی روانگی کے بمشکل چند منٹ بعد ہی کچھ سوچتا ہوا اس میٹنگ روم سے ملحقہ ایک کمرے میں چلا گیا۔

اس کمرے کو ایک طرح سے "جی آر یو" کے آپریشن روم کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ایک سرخ رنگ کے ٹیلی فون پر اس نے مخصوص نمبر ڈائل کیا......دوسرے ہی لمحے وہ سیکرٹری جنرل سے بات کر رہا تھا......!!

گفتگو کے خاتمے پر اس کے تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہو گئے......!

اس نے میز کے ایک کونے پر لگی گھنٹی کے پش بٹن پر ہاتھ رکھا......چند منٹ بعد وہ کافی کی چسکیاں لیتا ہوا اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھ رہا تھا۔

یہ خط اگلے روز سفارتی ڈاک میں خصوصی اہتمام کے ساتھ دہلی میں روس کے سفارتخانے میں پہنچ گیا......اس سفارتخانے کے قریباً اسی فیصد ملازم براہ راست "کے جی بی" کے ایجنٹ تھے اور سفارتی لبادے میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

ان سفارتی نمائندوں میں "یوری راگولین" نام کا ایک تھرڈ سیکرٹری بھی موجود تھا۔راگولین تھا تو تھرڈ سیکرٹری......لیکن یہاں فرسٹ سیکرٹری کی حیثیت بھی اس کے سامنے نہ ہونے کے برابر تھی۔سفارتخانے کا ہر ملازم اس سے خائف رہتا تھا کیونکہ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ اصل میں وہ کیا ہے؟

یوری راگولین نے جنرل ولادی میروف کی طرف سے بھیجے ہوئے خط کو صرف ایک مرتبہ پڑھا پھر اپنے سامنے رکھی برقی انگیٹھی کی نذر کر دیا!

دوسرے روز روسی سفارتخانے کے لوگ ایک منصوبے کے تحت تھرڈ سیکرٹری یوری راگولین کے کان کی تکلیف کی خبر سفارتی حلقوں میں پھیلا چکے تھے اگلے ہی روز راگولین اپنے کان کا علاج کروانے کے لئے ایئر انڈیا کی ایک فلائٹ سے ماسکو جا رہا تھا......دہلی سے ماسکو تک کا سفر اس

نے ''بڑی اذیت'' کے ساتھ طے کیا تھا۔اس دوران جہاز کے عملے کو یقین ہو چلا تھا کہ واقعی راگولین کان کی کسی انتہائی پیچیدہ بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔

ماسکو میں کی آمد کی اطلاع ملنے کے بمشکل آدھ گھنٹے بعد ہی جنرل ولادی میروف نے اسے خصوصی میٹنگ کے لئے طلب کر لیا......دونوں رات گئے تک ایک منصوبے پر بحث کرتے رہے۔

☆☆

تیسرے دن جب یوری راگولین واپس سفارتخانے پہنچا تو اس کی حالت قدرے سنبھل چکی تھی......لیکن دوائیوں کا بیگ اس نے جان بوجھ کر اس انداز میں اور اتنی لاپرواہی سے پکڑ رکھا تھا کہ وہ ہر کسی کی نظر میں آ جائے۔

اسے ''کان کی تکلیف'' قدرے پرانی تھی اور مہینے میں ایک آدھ مرتبہ اکثر وہ اس کا شکار ہو کر ماسکو اپنے ''خصوصی معالج'' کو دکھانے ضرور چلا جایا کرتا تھا۔ہوائی اڈے پر ''را'' کے خصوصی ایجنٹ نے اس کی نقل حرکت پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور وہ روسی سفارت خانے کی کار کے پیچھے ہوائی اڈے سے سفارت خانے تک سائے کی طرح لگا رہا۔

واپسی پر اس نے ''معمول کی کاروائی'' کی رپورٹ لکھ دی تھی۔

❁......❁......❁

نیا شکاری

ٹھاکر رمیش نے کلکتہ کے گنجان آباد علاقے میں موجود پرانے زمانے کی چار منزلہ عمارت کا دوبارہ تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر سر ہلاتا ہوا اس کی بوسیدہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''کون ہے بے......؟''

کسی نے اندر سے گالی دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''ٹھاکر...... تیرا باپ۔'' ٹھاکر رمیش نے بھی کلکتہ کی مخصوص زبان میں اسے مخاطب کیا۔

''اوہ''...... اندر سے آواز آئی اور کسی نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولنے والے کے جسم پر ایک دھوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی شاید اس نے ہنگامی حالات کے پیش نظر ہی باندھ لی تھی۔

کمرہ بڑا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔

ایک کونے میں چھوٹی سی میز پر چائے کی پیالیاں اور کچھ کتابیں رکھی تھیں اور دوسری طرف ایک ڈھیلی سی چارپائی پر درمیانی عمر کی ایک نیم برہنہ عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے ٹھاکر کو دیکھ کر بھی اپنی پوزیشن بدلنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ کمرے سے شراب کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے!

ٹھاکر نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر چہرہ دوسری طرف کیا۔ اس نے دوسری مرتبہ اس عورت کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

''چل تو......'' اندر موجود دھوتی والے نے دس کا نوٹ دیوار میں لگی ایک لمبی کیل پر جھولتے ہوئے پرانے سے کوٹ کی ایک جیب سے نکال کر اس پر پھینک دیا۔

عورت کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نوٹ اس نے اپنی انگیا میں اڑس لیا تھا...... میز پر دھری سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر اس نے وہیں دھری ماچس سے سلگایا اور لمبا کش لگا کر دھوتی والے کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھاکر کے لئے بڑا بے ہودہ اشارہ کیا لیکن ٹھاکر نے آنکھ دبا کر اسے کچھ سمجھایا اور وہ چارپائی کی پائنتی پر دھرے کپڑے پہن کر وہاں سے نکل گئی۔

''مجھے پانڈے کہتے ہیں۔''...... عورت کے جاتے ہی اس نے ٹھاکر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر کامریڈ پانڈے''......

ٹھاکر نے بڑی گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کیا تھا...... ''میرا نام تو تم جان ہی چکے ہو گے...... اب کام بھی بتا دو''

''بیٹھو'' ...... پانڈے نے چارپائی کے نیچے سے ایک ٹین کا ٹرنک گھسیٹ کر باہر نکالا پھر اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ اس ٹرنک میں پرانے کپڑے دھرے تھے اور ایک قمیص کی جیب سے اس نے ایک تصویر نکال کر ٹھاکر کے سامنے رکھ دی!

تصویر پر پہلی نظر پڑتے ہی ٹھاکر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آدمی نوجوان اور سرخ وسپید چہرے کا مالک تھا۔

''کیا نام ہے اس کا؟''

''فیضان ...... فیضان اوغلو'' ...... جواب ملا۔

''کہاں کا ہے؟'' ...... اس نے دوبارہ روکھے لہجے میں پوچھا۔

''افغانستان میں کسی جگہ کا۔''

''ک ک کیا مطلب ...... مجھے وہاں جانا ہوگا'' ......

ٹھاکر کی زبان اچانک ہی لڑکھڑانے لگی تھی۔ اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ اسے ایک مشن پر کابل بھیجا گیا تھا۔ تب بھی اسے اس نوعیت کا مشن سونپا گیا تھا۔ اس نے ایک غیر ملکی سفارت کار کے مقامی ڈرائیور کو قتل کرنا تھا۔ کیونکہ وہ شخص اب کے جی بی کے لئے ناکارہ ہو چکا تھا۔

''ٹھاکر ...... یہ مشن تمہیں بہر صورت مکمل کرنا ہے ...... اس آدمی کو ایک مہینہ کے اندر ختم کرنا ہے۔ یہ حکم ''ریڈ سکوائر'' سے براہ راست آیا ہے ...... تم بچے نہیں ہو۔ اس کی اہمیت جان گئے ہوگے۔'' پانڈے کی آواز اسے کسی گہرے کنویں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''ٹھیک ہے ......'' اس نے اپنی انگلیوں میں پھنسا سگریٹ زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسلتے ہوئے کہا۔

پانڈے نے ایک نقشہ اور کچھ مزید تصویریں اس کے سامنے بچھا دیں اور اسے کچھ سمجھانے لگا۔

ٹھاکر کا ذہن پانڈے کے منہ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو بڑی احتیاط سے حفظ کر رہا تھا۔ اس نے بلا کا ذہن پایا تھا۔ یہ اس کا ذہن ہی تھا جس نے اسے آج تحت الثریٰ کی گہرائیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔

اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس کا اصلی نام کیا ہے ...... اب تک اس نے درجنوں شہریت نام اور ملک بدلے تھے۔ کبھی وہ یورپ میں ہوتا۔ کبھی ایشیا کے کسی ملک میں اور کبھی مشرق وسطیٰ میں۔

اس کی ماں تو ٹھاکر کو جنم دے کر کسی آشرم کے سامنے پھینک کر چلی گئی تھی۔ جانے کس نے خدا ترسی کر کے اسے اٹھا لیا۔ پڑھایا، لکھایا، پھر وہ بھی مر گیا۔ اپنے محسن کی وفات کے بعد اس کا رہا ہی کون تھا یہاں۔ کالج سے بی اے کرتے ہی وہ نئے جہان کھوجنے نکل گیا۔ یہاں اس کی اپنی کوئی شناخت ہی نہیں تھی۔ اسے بہر کیف اپنی شناخت بنانا تھی۔ وہ جانتا تھا اس ملک میں بھیانک ماضی ایک سائے کی طرح اس سے چمٹا رہے گا ......!!

ایک روز وہ نکل گیا!

مختلف ملکوں کی خاک چھانتا وہ جرمنی کو اپنی منزل مقصود ٹھہرا کر چلتا چلا جا رہا تھا۔ ترکی میں جب وہ بالکل تہی دست ایک سڑک کے

کنارے بنے پارک میں بھوک اور پیاس سے نڈھال بیٹھا تھا تو ایک غیر ملکی فرشتہ بن کر اس کی مدد کو آ گیا۔

اس نے نہ صرف ٹھاکر کو کھلایا پلایا بلکہ اپنے ساتھ اپنے گھر بھی لے گیا۔

اس کا گھر کیا تھا...... زمین پر جنت کا نمونہ۔

ٹھاکر نے یہاں شراب کی بدمستیوں میں خود کو غرق کر لیا۔ اس کے دوست نے اسے سارا مشرقی یورپ گھما دیا ایک روز بالآخر ٹھاکر جان ہی گیا کہ وہ کے جی بی کے شکنجے میں پھنس گیا ہے۔

لیکن وہ پریشان بالکل نہ ہوا۔ وہ تو پہلے ہی اپنی قسمت آزمائی کے لئے کسی میدان کی تلاش میں تھا۔ اس نے جی جان سے ان لوگوں کے لئے کام کرنے کی حامی بھری اور جو کہا اس پر عمل بھی کر دکھایا!

دو سال کی قلیل مدت میں اس نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ اب وہ "کے جی بی" کے خصوصی ایجنٹوں میں شمار ہونے لگا تھا......!

اپنے وطن کی روانگی کے چھ سال بعد جب وہ واپس آ گیا تو ایک کروڑ پتی رئیس اور باعزت آدمی بن چکا تھا۔ اس نے دہلی کی ایک ماڈرن آبادی میں بنگلہ خرید لیا تھا اور اپنا کاروبار تمام بھارت میں پھیلایا ہوا تھا!

ٹھاکر نے شادی نہیں کی تھی لیکن شاید ہی دہلی میں کوئی ایسی سوسائٹی گرل تھی جسے اس کی غیر قانونی بیوی رہنے کا اعزاز حاصل نہ ہو چکا ہو......!!

دہلی میں ٹھاکر کا گھر ہی شاید "کے جی بی" کا سب سے بڑا اڈا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بہانے وہ مختلف ممالک کے سفارتی نمائندوں کو اپنے ہاں مدعو کرتا رہتا تھا۔

"یوری راگولین" بھارت میں اس کا سپائی ماسٹر مقرر ہوا تھا اور اس کے اشارے پر وہ یہاں بھی اب تک کئی کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔

آج بھی وہ ایک ایسے ہی کام کے لئے دہلی سے کلکتہ آیا تھا...... پانڈے کو دیکھ کر اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے خود بھی تو پانڈے کی طرح اپنی شخصیت تہہ در تہہ بنائی تھی۔

اس نے خود پر اتنے خول اب تک چڑھائے تھے کہ اب اسے اپنی اصل شخصیت خود تلاش کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

یہ احساس بھی اسے آج ہی بخوبی ہوا تھا کہ اس کی حیثیت اب بھی کے جی بی کے معمولی مہرے سے زیادہ ہرگز نہیں۔ جانے پانڈے جیسے کتنے اور لوگ ابھی بھارت میں موجود ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ جال دنیا کے ہر ملک میں پھیلا ہوا ہے۔

"ہمارے دوست وہاں ہر ممکن تعاون کریں گے۔"...... پانڈے نے اس ٹوٹے پھوٹے ٹرنک سے ایک پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

یہ دہلی سے کابل تک ایئر انڈیا کا ٹکٹ تھا۔

''وہاں کامریڈ موجود ہوں گے......وہیں تمام بریفنگ ہوگی......اوکے۔گڈ لک۔'' پانڈے نے اس کی بات سنے بغیر ہاتھ الوداعی مصافحے کے لئے اس کی طرف بڑھا دیا۔

ٹھاکر رمیش باہر نکل آیا......!

☆☆

وہ ''کے جی بی'' کی طرف سے سکھائے جانے والے تمام آداب سیکھ چکا تھا۔ کسی بھی ایجنٹ کا دوسرے ایجنٹ میں معمولی سا تجسس دونوں کی موت کا پیغام بن جاتا تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ کوئی تیسرا ان کی اس ملاقات کی نگرانی بھی ضرور کر رہا ہوگا اور زیادہ دیر تک ان کی گفتگو سے اگر باہر والے کو شک ہوگیا تو دونوں ہی جان سے جائیں گے۔''

یہ لوگ ایک دوسرے سے کوئی سوال اپنے مقصد کے علاوہ نہیں کرتے تھے۔ ٹھاکر نے پانڈے سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اسے کابل میں کس کے پاس جانا ہے؟ کہاں قیام کرنا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

وہ جانتا تھا کہ اگر ان سوالات کے جوابات جاننا ضروری ہوتا تو پانڈے اسے بتا دیتا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے اب کابل کے ہوائی اڈے پر ہی خوش آمدید کہا جائے گا......وہاں اس کی پہچان پہلے ہی سے پہنچ چکی ہوگی۔

شام کی فلائیٹ سے وہ دہلی واپس آ گیا۔

اس روز رات کو دہلی کے ایک شاندار ہوٹل میں وہ یوری راگولین کے ساتھ ڈنر کھا رہا تھا۔

''یہ خصوصی مشن تم پر بے پناہ اعتماد کی وجہ سے تمہیں سونپا گیا ہے۔ اس لفافے میں جو میں نے تمہیں دیا ہے تمہارا پریس کارڈ ہے......تم دہلی کے ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے کابل جا رہے ہو......وہاں ہمارے دوستوں کو خبر رہتی ہے کہ فیضان کس علاقے میں آپریٹ کر رہا ہے۔ اس کا انٹرویو لینے کے بہانے کسی بھی طرح اس تک پہنچ جاؤ اور اسے زہر دے کر مار ڈالو......''

''زہر دے کر ہی کیوں۔'' ٹھاکر مسکرایا......''اگر میٹھے سے کام بن جائے تو......''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر قہقہہ بلند کیا۔

''نہیں ٹھاکر......اسے اتنا آسان مت لو۔ تمہارا واسطہ ایسے ہوشیار لوگوں سے کبھی نہیں پڑا ہوگا۔'' راگولین نے سنجیدگی اختیار کر لی۔

''اونہہ......افغانی اور ہوشیار......'' ٹھاکر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بہرحال اس بات کا خصوصی خیال رکھنا کہ ذرا سی بھی بے احتیاطی تمہیں مار ڈالے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اندازے کی غلطی کا شکار ہو جاؤ......یہ شخص کوئی جاہل ملاں نہیں ہے۔ ماسکو یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے۔ ہمارے داؤ پیچ سیکھ کر ہمیں پر آزما رہا ہے......تم میرے دوست ہو کامریڈ......صرف اپنے تک رکھنا یہ بات''......

راگولین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......''اس سے پہلے ایک ایجنٹ کا ان لوگوں نے کابل ہی میں خاتمہ کر دیا تھا......بہت ہوشیار

شخص ہے یہ......“

اس بات پر ٹھاکر کو واقعی سنجیدگی اختیار کرنا پڑی۔

”کامریڈ میرا نام بھی ٹھاکر رمیش ہے“......اس نے واڈکا کا ایک لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔”او کے گڈ لک“......یوری راگولین نے کسی مشتبہ سی آئی ڈی والے کو شاید دروازے سے اندر آتے دیکھ لیا تھا۔

☆☆

تیسرے دن ایئر انڈیا کی ایک پرواز سے وہ کابل جا رہا تھا۔

ایک سریع الاثر زہر کی شیشی جس پر گردے کی درد کی دوائی کا لیبل لگا ہوا تھا اس کی جیب میں موجود تھی......باقی سب کچھ اسے وہیں سے موصول کرنا تھا۔ یوری راگولین کی گفتگو کے بعد بھی وہ فیضان کو اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھا......اس نے دنیا کے بیشتر ممالک میں ”کے جی بی“ کے پیشہ ور قاتل کی حیثیت سے اب تک درجنوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا......کسی بھی انسان کی جان لے لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا......وہ زہر انسانی جسم میں داخل کرنے کے بیسیوں طریقے جانتا تھا۔ اب تک اتنے بے شمار روپ بدل لئے تھے کہ اب وہ کسی بھی روپ میں خود کو نارمل محسوس کر سکتا تھا۔

پاسپورٹ اس کے لئے مسلمان کے نام سے حاصل کیا گیا تھا اور پریس کارڈ پر بھی اس کا نام محمد حسین لکھا ہوا تھا......روسی یہ سمجھتے تھے کہ اول تو مجاہدین غیر ملکی کا بہت احترام کرتے ہیں۔ خصوصاً اپنی روایات کے مطابق وہ مہمان کے لئے جان سے بھی گزر جاتے ہیں، لیکن مسلمان ہونے کے ناطے وہ ٹھاکر پر اور زیادہ اعتماد کرتے۔

ایئر انڈیا کا جہاز برق رفتاری سے کابل کی طرف محو پرواز تھا اور ٹھاکر اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سگریٹ کے مرغولے اپنے سامنے بکھیر رہا تھا۔ اب تک اس نے فیضان کو مارنے کی دانست میں کئی طریقے سوچ لیے تھے۔ جہاز نے رات کے پہلے پہر کابل کے ہوائی اڈے پر لینڈ کیا......!

اس مرتبہ کے جی بی نے خصوصی احتیاط برتی تھی اور ”خاد“ کا جو ایجنٹ ٹھاکر کو ہوائی اڈے پر لینے آیا پہلے ہی یہاں کے حلقوں میں اخبار نویس کی شہرت رکھتا تھا......!

واپسی پر اسے پہچانتے ہوئے ”کسٹم کلیرنس ڈیسک“ پر اسے سامان کی تلاشی دکھاوے کے لئے بہت سختی سے لی گئی تھی لیکن کسی نے اس کے جسم کو چھونے کی جرأت نہیں کی تھی......آج خاص طور سے ”خاد“ کے تربیت یافتہ ایجنٹ کسٹم آفیسروں کے روپ میں ہوائی اڈے پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔

لاؤنج سے باہر نکلتے ہی مقامی ”خاد ایجنٹ“ اس سے ”حسین بھائی“ کا نعرہ لگا کر بغلگیر ہو گیا......جواب میں ٹھاکر نے اس سے بھی زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح باتیں کرتے باہر آئے......کیا مجال جو دونوں کے متعلق کوئی گہری نظر سے جائزہ لینے والا

شک میں مبتلا ہوتا۔

مہمان اسے اپنے ساتھ ہی کابل کے ایک ہوٹل میں لے آیا۔ ہوٹل میں داخل ہونے بعد بھی ٹھاکر میش نے اخباری نمائندوں کے سے انداز میں کیمرہ اپنے گلے میں لٹکا رکھا تھا...... دونوں دوست انگریزی میں گفتگو کرتے یہاں تک آئے تھے۔

اس کے ''دوست'' نے کمرہ پہلے ہی سے اس کے لئے بک کروا رکھا تھا۔ رات گئے تک وہ اسے فیضان کی موجودہ پوزیشن سمجھاتا رہا۔ اس نے ہر ممکنہ جگہ کی نشاندہی کر دی تھی جہاں فیضان کے ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔

ٹھاکر نے اس کے ساتھ نیچے ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے سے انکار کرتے ہوئے اس کے ذریعے ''مقامی کامریڈوں'' کو پیغام بھیج دیا کہ کوئی بھی اس سے ملنے یا رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے...... بصورت دیگر وہ ان سے خود ہی رابطہ قائم کرے گا۔

دہلی سے روانگی پر اسے ''مقامی کامریڈوں'' سے رابطہ کے تمام طریقے بتا دیئے گئے تھے اور ٹھاکر میش نے وہ حفظ کر لئے تھے...... اس کی یہ خوبی ہمیشہ اس کے کام آتی کہ وہ بہت کچھ زبانی یاد رکھ سکتا تھا۔ اس نے کبھی اپنے پاس کچھ لکھ کر نہیں رکھا تھا۔

اپنے میزبان کو رخصت کرنے وہ دروازے تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی روانگی کے قریباً آدھ گھنٹے بعد ٹھاکر نپے تلے قدموں سے باوقار چال چلتا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں آ بیٹھا۔ اس نے کھانے کے ہال میں داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پر موجود لوگوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور ان کے چہروں پر جوابی مسکراہٹ آتے ہی ان کی طرف بڑھ گیا۔

ٹھاکر نے زبردستی ہی ان سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے انہیں محمد حسین کے نام سے اپنا تعارف کروایا تھا اور ان لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے اخبار سے منسلک ہے اور اس لڑائی کا جائزہ لینے ہی یہاں آیا ہے...... !ٹھاکر نے جان بوجھ کر اپنی گفتگو میں ''مجاہدین'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر ہی اندازہ کر لیا کہ یہ لوگ بظاہر تو حکومت کے خوف سے مجاہدین کی مخالفت کرتے ہیں لیکن ان کے دل ان کے قدموں کی آہٹ پر ہی دھڑکتے ہیں...... !

ہال میں متعدد میزیں خالی تھیں لیکن وہ جان بوجھ کر ایک ایسی میز پر بڑھا جس پر پہلے ہی سے ایک موٹا تازہ افغان جو خاصا ماڈرن بنا ہوا تھا بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

''ہیلو''...... اس نے جاتے ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''ہیلو''۔ جواب میں خاصی سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا۔

ٹھاکر نے اس موٹے افغان سے اپنا تعارف ایک غیر ملکی مسلمان اخبار نویس کے حوالے سے کروایا اور اسے بتایا کہ وہ مجاہدین کی سرگرمیوں سے بڑا متاثر ہے اور انہیں نزدیک سے لڑتے دیکھنے کی تمنا لے کر آیا ہے...... !

موٹے افغان نے مجاہدین کے ذکر پر خاصا ناک بھوں چڑھایا۔ وہ انگریزی سمجھ تو لیتا تھا لیکن بولنے میں خاصی دقت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس لئے اس نے کھانا ختم ہوتے ہی وہاں سے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔

ٹھاکر نے اپنے لئے ہلکا پھلکا کھانا منگوایا اور اردگرد کی میزوں پر بیٹھے لوگوں کو سنانے کے لئے جواب خاصی آباد ہو چکی تھیں قدرے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔ اس کے بسم اللہ پڑھنے پر کئی لوگوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ ان کی نظروں سے بظاہر لاتعلق سا کھانے میں جتا رہا......

کھانا ختم ہونے پر اس نے دعا کے سے انداز میں ہاتھ پھیلائے اور جب وہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہاں سے رخصت ہو رہا تھا اس ہوٹل میں آنے والے قریباً ہر شخص کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ محمد حسین نام کے اس اخبار نویس کو جس کا تعلق بھارت کے ایک مشہور اور بڑے اخبار سے ہے، افغان مجاہدین سے بہت ہمدردی ہے اور وہ ان کو برسرِ پیکار دیکھنے کی تمنا لے کر یہاں آیا ہے......

لوگ یہ بھی جان چکے تھے کہ نووارد صحافی کٹر مسلمان ہے اور اپنے مذہبی عقائد سے بڑا مخلص ہے...... اس نے جان بوجھ کر شراب نوشی اپنے کمرے میں ہی کی تھی۔ جہاں اس کے لئے کابل میں میزبان نے کمرے میں موجود فریج میں پہلے ہی سے ''واڈکا'' کی بوتلیں رکھوا دی تھیں۔

☆☆

اگلا سارا دن اس نے کابل میں گھوم پھر کر گزارا۔ وہ منجھے ہوئے اخبار نویسوں کے سے انداز میں مختلف طبقات زندگی سے متعلق لوگوں کی آراء لیتا رہا۔ اس دوران اس نے ہر گفتگو کرنے والے کو اس بات کا یقین دلا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی کہ وہ دل و جان سے ایک مسلمان ہونے کے ناطے افغان مجاہدین کی جدوجہد آزادی کا حامی ہے......

ٹھاکر رمیش نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں!

وہ جانتا تھا کہ یہاں موجود لوگوں میں سے کم از کم اسی فیصد دل و جان سے مجاہدین کے ساتھ ہیں...... یہ الگ بات کہ وہ خوف کے مارے کچھ نہ کہیں...... یہاں قدم قدم پر مجاہدین کے جاسوس موجود تھے خصوصاً ہر غیر ملکی پر ان کا چیک بہت سخت تھا۔ شہر میں ہونے والے واقعات کے پل پل کی خبر مجاہدین تک پہنچ جاتی تھی۔

یہ خبر بھی یقیناً اب تک مجاہدین کو پہنچ چکی ہوگی کہ یہ مسلمان صحافی نام ہی کا مسلمان نہیں بلکہ دل میں ایمان اور درد بھی رکھتا ہے۔ یہ اطلاع اسی روز رات کے دوسرے پہر فیضان اوغلو تک بھی پہنچ گئی تھی وہ کابل کے نزدیک ہی مجاہدین کے ایک ''مغند'' (مرکز) پر موجود تھا۔ اس نے اس اطلاع پر اپنا کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بس اسے معمولی سی ایک اطلاع ہی جانا تھا۔

❀......❀......❀

شاہراہِ موت

تیسرے روز ٹھاکر رمیش اپنے سفر پر روانہ ہو گیا......!

اس کی منزل ''لوگر'' تھی۔ ''لوگر'' کی ولایت کو افغانستان میں ایک جنکشن کی حیثیت حاصل تھی...... یہاں سے ہی کابل قندھار اور کابل ہرات ہائی وے گزرتی ہے۔ روسی اور افغان فوج کے لئے اس سپلائی لائن کی حیثیت شاہ رگ کی سی ہے۔ اس محاذ پر وہ مجاہدین کا قبضہ ختم کروانے کے لئے اب تک کئی حملے کر چکی تھی لیکن یہاں مجاہدین کی مزاحمت ختم نہیں کر سکی تھی۔

اسی محاذ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر مجاہدین کے مختلف گروپس یہاں مورچہ بند تھے فیضان بھی یہیں مصروف پیکار تھا......اور ٹھاکر رمیش بھی اس کی تلاش میں اسی طرف نکلا تھا......!

''لوگر'' چھاؤنی کے نزدیک بس نے اسے اتار دیا۔ یہاں سے آگے کوئی سواری نہیں جاتی تھی۔ چھاؤنی کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اسے افغان ملیشیا کے جوانوں نے روک لیا۔ وہ اسے آگے جانے سے منع کر رہے تھے لیکن ٹھاکر آگے جانے پر بضد تھا۔

ملیشیا کے جوان اسے گرفتار کر کے اپنے کمانڈنگ آفیسر کے پاس لے آئے۔ ٹھاکر دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ اب تک ہر بات اس کی مرضی کے مطابق ہو رہی تھی اور ایسے واقعات میں وہ اپنی پوزیشن مستحکم کرتا چلا جا رہا تھا۔

کمانڈنگ آفیسر ایک روسی کرنل تھا......!

وہ اس علاقے کا ایریا کمانڈر تھا لیکن زیادہ تر ماتحت افواج افغان ہی تھیں۔ اس نے چھٹتے ہی ٹھاکر کو انگریزی میں ڈانٹ دیا......لیکن جواب میں ٹھاکر کی زبان سے ایک مخصوص لفظ ادا ہوتے ہی اس نے ان جوانوں کو جو اسے یہاں تک لائے تھے باہر جانے کا حکم دیا۔

ان کے وہاں سے جاتے ہی دونوں بے تکلفی سے روسی زبان میں باتیں کرنے لگے...... پندرہ بیس منٹ بعد کمانڈر اس کے ساتھ ہی باہر آیا تھا......!

اس نے اپنے دفتر سے باہر نکلتے ہی غصے کے آثار طاری کر لئے اور وہاں موجود افغان عساکر کے سامنے ٹھاکر کو پشتو میں گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

''اگر تم مرنے پر ہی تلے ہو تو جاؤ جہنم میں۔''

دونوں بڑی کامیاب اداکاری کر رہے تھے۔

''کیا کہا آپ نے؟'' ٹھاکر نے انجان بنتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

''اس سے آگے تم اپنی ذمہ داری پر جاؤ گے۔ ہم کسی بھی قسم کی ضمانت نہیں دے سکتے۔'' روسی کرنل نے انگریزی زبان میں کہا۔

''اونہہ تم مجھے کیا ضمانت دو گے...... تمہاری تو اپنی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی......'' ٹھاکر نے طنز کی۔

''شٹ اپ''...... کرنل نے اسے ڈانٹ دیا۔

''مسٹر کرنل! تم ایک ذمہ دار صحافی سے باتیں کر رہے ہو۔ اپنا لہجہ درست کرو ورنہ......'' ٹھاکر نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

کرنل جواب دیئے بغیر واپس مڑ گیا۔

ٹھاکر نے وہاں موجود افغان عساکر کے چہروں کو پڑھ کر بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ اس کے طرز عمل سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

اس نے مسکراتے ہوئے سب کو ''السلام علیکم'' کہا اور ان کے سامنے بھی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر کے سامنے نظر آتے پہاڑی سلسلے کی طرف چل دیا۔

وہ اندازے سے لیکن قدرے لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیدل چلتا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑوں میں ڈھائی گھنٹے تک وہ مسلسل سفر کرتا رہا...... ابھی تک کسی سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا...... اب تو ٹھاکر کو الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ مجاہدین اسے گھیرے میں لے لیں۔

پہاڑوں میں مسلسل چلنے کا اتفاق اسے خاصی مدت کے بعد ہوا تھا اور اب وہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگا تھا...... اس کے چاروں اطراف غیور افغانوں کی طرح سربلند پہاڑی سلسلے چیخ چیخ کر اسے اس بات کا احساس دلا رہے تھے کہ افغانوں کے ارادوں کی طرح وہ بھی ناقابل تسخیر ہیں۔

ٹھاکر سوچ رہا تھا کہ اگر فیضان مر بھی جائے تو کیا روسی استعماریت کا سیلاب ان سربفلک پہاڑیوں سے ٹکر لے سکے گا۔''

''نہیں''...... کسی نے اس کے اندر سرگوشی کی اور اسے افغانوں کا وہ مشہور سلوگن یاد آ گیا...... ''کہسار باقی، افغان باقی۔''

ایک پہاڑی چشمے کے نزدیک رک کر اس نے گہری سانس لی پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنے جسم پر موجود بوجھ سے نجات حاصل کر لی۔ اپنی کمر پر باندھا سفری تھیلا اور کیمرہ اس نے ایک طرف رکھ دیا...... جوتے اتار دیئے اور پتلون کے پائنچے چڑھا کر ایک پتھر پر بیٹھ کر پاؤں پانی میں لٹکا دیئے۔ پہلے تو اسے خاصی ٹھنڈک محسوس ہوئی لیکن پھر سکون محسوس کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ اسی کیفیت کی نذر ہو گئے۔ اس نے جھک کر چلو بھر پانی پیا پھر اس پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے ہی اس نے گردن گھما کر اپنے سامان کا جائزہ لینا چاہا...... سنسنی کی ایک تیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

دو مجاہد اپنے کندھوں سے رائفلیں لٹکائے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ ایسے ہی کاموں میں گزرا تھا...... اپنی چھٹی حس پر اسے بے پناہ اعتماد تھا...... اس کے کان بہت حساس تھے۔ معمولی چاپ بھی سن لیتے تھے لیکن اس کو گمان بھی نہ گزرا کہ یہ لوگ کب اور کس طرف سے یہاں آئے ہیں۔

لیکن...... دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ''.......اس نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے دونوں کو خاص مسلمانوں کے سے انداز میں سلام کیا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے کر دیا۔

''وعلیکم السلام''.......دونوں مجاہدوں نے بیک وقت کہا اور باری باری اس سے ہاتھ ملائے۔

''محمد حسین.......جرنلسٹ''.......اس نے مختصر سے الفاظ میں اپنا تعارف کروایا۔

دونوں نے جواب میں صرف گردن ہلا دی۔ کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے اپنے جوتے پہنے اور چاہا کہ اپنا سامان بھی اٹھا لے لیکن رائفل برداروں نے اسے بندوق کے اشارے سے منع کر دیا۔ ان میں ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو مقامی زبان میں کچھ کہا۔ اس نے ٹھاکر کا بیگ اور کیمرہ اٹھا لیا اور آگے آگے چلنا شروع کر دیا.......!

دوسرے مجاہد نے اشارے سے اپنے ساتھی کے پیچھے پیچھے چلنے کا حکم دیا۔

''شکرا.......شکرا.......''ٹھاکر نے خواہ مخواہ دانت نکال کر اپنے کھنچے ہوئے اعصاب کو تسکین دینے کا سامان کیا۔

دونوں پندرہ بیس منٹ تک پیدل چلتے رہے۔ جیسے ہی وہ ایک پہاڑی کا موڑ گھومے انہیں تین اور مجاہد وہاں نظر آ گئے۔

''مسٹر حسین! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں.......آپ جس محاذ پر آئے ہیں اتفاق سے یہاں کمانڈر فیضان اوغلو کمانڈ کر رہے ہیں۔''

ان میں سے ایک نے بڑی شستہ انگریزی میں اسے مخاطب کیا۔

اس کے منہ سے اپنا اور پھر فیضان کا نام سن کر ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا.......اس کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔ اس کے اپنے متعلق پھیلائی ہوئی باتیں مجاہدین تک پہنچ چکی تھیں۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ان لوگوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو چکا ہے اور اس پر مستزاد یہ خوشخبری کہ اس محاذ کا فیضان ہی کمانڈر ہے!

وہی فیضان جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا.......!

''بس کام رید بن گیا کام''.......اس نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی۔

''اوہ! میرے خدایا! کتنی خوش قسمتی ہے میری.......جس مجاہد کے عظیم کارناموں سے کابل کے در و دیوار گونج رہے ہیں.......اس سے میری ملاقات ہوگئی۔''

اس نے اپنی خوشی کا اظہار نو واردوں پر کیا۔

''مسٹر حسین ہم بہت معذرت چاہتے ہیں کہ اس علاقے میں مزید گھومنے کی اجازت آپ کو کمانڈر ہی دے سکتے ہیں۔ آپ کو پہلے ان سے ملاقات کرنا ہوگی''.......

اسی مجاہد نے بڑے ادب سے ٹھاکر کو خبردار کیا۔

''اوہو! ضرور! ضرور! کیوں نہیں چلئے''.......

اس نے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

''ایک اور زحمت کی معافی چاہوں گا''......

اسی مجاہد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کو کہا۔

''کیا؟'' ٹھاکر چونکا۔

''آپ کو یہاں سے کچھ سفر آنکھوں پر پٹی باندھ کر کروایا جائے گا۔ اگر کمانڈر رضامند ہوں تو آپ کو کھلے عام گھومنے کی اجازت ہوگی۔''

''ضرور، ضرور، مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔ بہر حال اگر یہ آپ کا اصول ہے تو مجھے بھی اس کی پابندی کرنا پڑے گی۔'' اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔

''شکریہ'' اسی مجاہد نے کہا۔

ان کے ساتھی نے اپنے کندھے پر رکھا کالا کپڑا اٹھا کر کی آنکھوں پر باندھ دیا اور ایک مجاہد اس کا ہاتھ پکڑ اکر چلنے لگا۔

ٹھاکر کو بہت الجھن ہو رہی تھی۔ اسے یہاں سے فرار کا راستہ بہر حال یاد رکھنا تھا۔ اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا...... بمشکل تین چار منٹ سفر کے بعد ہی ٹھاکر کو کسی گھوڑے کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے گھوڑے پر سوار کروادیا گیا۔

گھوڑے کی پشت پر بیٹھے ٹھاکر کو اب یوری راگولین کے اس فقرے کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا وہ فیضان اوغلو کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہے۔ اتنے احتیاط پسند آدمی کی اس خطہ زمین پر موجودگی اس کے نزدیک کوئی معجزہ ہی ہوسکتی تھی۔

☆☆

ان کا سفر تقریباً آٹھ گھنٹہ جاری رہا......!!

اس دوران اس کے ہمسفروں نے اس سے متعدد مرتبہ اس سلوک پر معافی بھی مانگی تھی...... انہوں نے ٹھاکر کی خواہش پر اس کی فلاسک سے چائے بھی نکال کر پلائی تھی......!!

خدا خدا کر کے سفر کا اختتام ہوا جب اس کی آنکھوں کی پٹی کھلی تو ایک پہاڑ کی کھوہ میں بنی جھونپڑی کے سامنے فیضان اوغلو کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''السلام علیکم یا امیر''...... ٹھاکر بلا کا مکار تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' فیضان نے جواب میں اس سے بھی زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔

''میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے آج اسلام کے اس عظیم مجاہد کو دیکھ لیا''...... ٹھاکر نے خواہ مخواہ اپنی بتیسی نکالی۔

''نہیں مسٹر حسین اعظمت تو اس خدائے بزرگ و برتر کے لئے ہے جو ہماری پہلی اور آخری امید ہے۔ جس کے سہارے پر ہم عفریت کو روکے ہوئے ہیں۔ اس لڑائی میں حصہ لینے والا ہر مجاہد میرے جیسا ہے۔ ہم سب مل کر جہاد کرتے ہیں۔ کیونکہ میں کمانڈر ہوں، اس لئے ممکن ہے میرا نام ہی سب کے سامنے آتا ہو۔ فیضان کی آواز بلند دھیمی، بارعب اور مخاطب کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھنے والی تھی۔

ٹھاکر کو پھر احساس ہونے لگا کہ وہ پھنس گیا ہے...... معاملہ خاصا پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اسے اپنی اس بزدلانہ سوچ پر غصہ بھی آیا کہ آخر اس نے ان ان پڑھ اور جدید دور کے تقاضوں سے نا آشنا اجڈ لوگوں کو اپنے ذہن پر سوار کیوں کر لیا ہے۔

''مسٹر فیضان! یہ سب کیا ہے؟ یہ لوگ اتنی بڑی استعماری طاقت کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے...... انکے پاس ایسی کون سی قوت ہے جو......''

اس نے جانے کیوں فیضان کے نزدیک کھڑے بوڑھے اور جوان مجاہدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا۔

''یہ ہماری تاریخ ہے! اصلی اور کھری تاریخ جو ہماری خوش قسمتی سے استعمال کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رہی ہے۔ ان کے چہروں پر جو ملال ٹپک رہا ہے وہی ہمارا تفاخر ہے۔ ان کے جسموں پر جو استعمار مظلوم اقوام کی تاریخ کے چہرے پر لگایا کرتا ہے۔'' اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر آسمان پر بہت دور پرواز کرتے ایک عقاب کو دیکھا پھر دوبارہ ٹھاکر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''مسٹر حسین! استحصال کا شکنجہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ زخموں کی بڑی تعداد ناسور میں بدل جاتی ہے اور غصب شدہ قوموں کا سارا اخلاقی ڈھانچا گل سڑ جاتا ہے...... سامراج چلا بھی جائے تو ایک اپاج قوم اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ تم خود صحافی ہو اپنے ملک کی طرف دیکھو۔ دو سو سال فرنگی کے دور حکمرانی نے برصغیر کے عوام کا معاشی اور سماجی استحصال کس کس ڈھنگ سے کیا ہے؟...... رد عمل وہاں بھی ہوا تھا۔ وہاں بھی سامراج کے خلاف تحریک نے جنم لیا۔ ایسے ہی غداروں نے جن سے تم ابھی ''کابل'' اور ''لوگر'' میں مل کر آ رہے ہو......!

پشت سے حملہ کرنے والے انہی غداروں نے ٹیپو کو شہید کروایا، لیکن اس نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی...... اس نے ایک ہی نعرہ لگایا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے...... یہ ہے حریت پسندی کی تاریخ کا سب سے عظیم نعرہ......!!

اس نے بھی مرتے مرتے استعمار کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ ہم بھی مرتے مرجائیں گے لیکن استعمار کے منہ پر تھوکتے رہیں گے!

مسٹر حسین ہماری اپنی ایک تاریخ ہے......! ہم اس نسل کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے خیبر کے پہاڑی سلسلوں سے اسلام کی شمع روشن کی اور ہندوستان کے بت کدے کو شمع ایمانی کے نور میں غسل دیا...... ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ محمود غزنوی کے پیروکار ہیں۔ ہم بت شکن ہیں۔ ہم روسی استعماریت کے بت کو بھی ضرب ایمانی سے پاش پاش کر دیں گے۔ تم کابل سے آئے ہو تم نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا ہے۔ لیکن یہ تو وہ پوشیدہ بیماریاں ہیں جو وفاقی نظام میں دراڑ پڑتے ہی ابھر کر سامنے آنے لگتی ہیں، حملہ آور ہوتی ہیں اور معاشرہ ایسی ہی تخریب اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے جیسا وہاں کابل کے شہر میں اظہار ہے۔

''مسٹر حسین! آج جو افغان اس سرخ عفریت کا ساتھ دے رہے ہیں وہ ہماری تاریخ کے ہیرو نہ تو کبھی پہلے تھے...... نہ آج ہیں اور نہ کبھی مستقبل میں ہوں گے۔ ہم افغانوں کی فطرت میں غلامی ہے ہی نہیں......! ہم آزاد منش لوگ ہیں۔ ان چیچک زدہ بیمار انسانوں کو...... اپنی تاریخ کے اس کینسر کو ہم اپنے ملی جسم سے الگ کر کے پھینک دیں گے...... بہت جلد...... بہت جلد......'' وہ خاموش ہو گیا۔

جس روانی سے انگریزی بول رہا تھا اور جس طرح الفاظ اس کی زبان سے نکل کر ٹھاکر رمیش کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ یہ کیفیت بڑی جان لیوا تھی۔ اسے خواہ مخواہ ایک بے نام سا خوف ڈسنے لگا تھا۔

''اوہ! میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ آپ کو کن باتوں میں الجھا دیا...... آیئے آپ کی ملاقات ان مجاہدوں سے کرواؤں۔''

''ضرور! ضرور!''...... ٹھاکر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی شدت سے خواہش کر رہا تھا تاکہ اس اذیت ناکی سے کم از کم اسے تھوڑی دیر ہی کے لئے چھٹکارا مل جائے!

''اس کا نام کیا ہے؟''...... ٹھاکر نے اپنی نوٹ بک سنبھالتے ہوئے فیضان کے پہلو میں کھڑے ایک بارہ سالہ بچے کے متعلق دریافت کیا جو بڑے انہماک سے اپنی رائفل کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا...... شاید تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے رائفل صاف کی تھی۔

''اس کا نام عمر خان ہے''...... فیضان نے جواب دیا۔

''کمال ہے اتنی چھوٹی عمر اور کلاشنکوف!''

''مسٹر حسین! یہ ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے...... کیونکہ یہ بھی اسی نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی روایات کا پاسدار ہے...... میں بھی آپ کی طرح کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ان بچوں کا صحیح مقام میدان جنگ نہیں ہے...... یہ عمر سکول جانے اور علم حاصل کرنے کی ہے...... لیکن ہم خود پر مسلط کردہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اپنی بقاء کی اس لڑائی سے الگ رہنا ہماری مردانگی کی توہین ہے......!!''

اس نے بچے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے فارسی میں کچھ کہا۔

بچہ مسکراتے ہوئے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس کا باپ کہاں ہے؟''

''شہید ہو گیا...... باپ بھی، بڑا بھائی بھی...... ماں اور چھوٹی بہن بھی۔ کچھ بمباری میں شہید ہوئے اور کچھ دشمن کے مقابلے میں اب یہ اکیلا ہی ہمارے ساتھ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ٹھاکر کی یہ اداکاری قطعی غیر فطری نہیں تھی۔

''مسٹر حسین!! ایسی ہزاروں مثالیں یہاں موجود ہیں...... ہمارا سب کا ایک ہی عزم ہے کہ ہم غیر ملکی حملہ آور فوجوں کو اپنی مقدس سرزمین سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ یا پھر مٹ جائیں گے۔''

''میرے خیال میں مجھے اپنے پیشہ ورانہ فرائض بھی ادا کرنے چاہئیں۔''

ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ دکھاوے کے لئے فیضان کے ایک ساتھی کے ساتھ جو انگریزی تھوڑی بہت بول سمجھ لیتا تھا۔ محاذ پر گھومتا رہا...... اس نے پیشہ ور صحافیوں کے سے انداز میں وہاں مجاہدین سے گفتگو کی...... انکے جذبہ جہاد کو سراہا۔ تصاویر بنائیں۔ اور شام ڈھلے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔

☆☆

شام ڈھلنے پر وہ واپس آ گیا......!!

رات کا کھانا اس نے فیضان کے ساتھ ہی کھانا تھا...... اس نے دکھاوے کے لئے ان لوگوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی۔ اس کی کسی حرکت سے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ شام کو فیضان جب اگلے مورچوں سے واپس لوٹا تو ٹھاکر اس کا منتظر تھا۔ اس نے فیضان سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ رات کو اکیلے میں اس سے انٹرویو کرے گا۔!!

فیضان اور ٹھاکر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ٹھاکر اس سے پیشہ ور صحافیوں کی طرح سوال جواب کر رہا تھا...... اچانک ہی فیضان کے ایک فقرے نے اسے چونکا دیا۔

''آپ کی انگوٹھی بہت شاندار ہے!''

ٹھاکر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی...... ! اس انگوٹھی میں نگینہ کی جگہ گھڑی لگی ہوئی تھی جس کے اندر ایک خفیہ خانے میں زہر تھا...... سریع الاثر زہر...... !

''ہاں''...... اس نے خود پر قابو پایا...... ''میں نے یہ جاپان سے خریدی تھی۔ مسٹر فیضان میری بڑی کمزوری ہے کہ میں بازو پر گھڑی نہیں باندھتا...... خصوصاً ایسی مہمات میں...... پھر اس سے دونوں ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں...... گھڑی کی بھی اور انگوٹھی کی بھی......''

''بہت خوب......'' فیضان بھی زیر لب مسکرایا۔

ایک مؤدب مجاہد نے دونوں کے سامنے کھانا چن دیا تھا......!!

''میرے خیال میں باقی باتیں طعام کے بعد!''...... فیضان نے اسے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی''...... ٹھاکر زبردستی مسکرایا۔

''میں ذرا ہاتھ دھو آؤں''...... فیضان نے اٹھتے ہوئے اجازت چاہی۔

☆☆

ٹھاکر کے تو دل کی کلی ہی کھل اٹھی۔ اس سے شاندار موقعہ اسے کب ملنے والا تھا۔ ٹھاکر نے انگلی ٹیڑھی کر کے ذرا سا دباؤ ڈالا گھڑی ڈھکن کی طرح کھل گئی ہاتھ کو اس نے ہلکا سا جھٹکا دیا اور انگوٹھی کے پوشیدہ خانے سے دو تین قطرے فیضان کے سامنے دھرے مٹی کے پیالے میں گرا دیئے۔ ایسا ہی ایک پیالہ اس کے سامنے بھی پانی سے بھرا پڑا تھا۔

ایک بڑی پلیٹ میں سالن موجود تھا اور بڑی بڑی دو تنوری روٹیاں ان کے سامنے دھری تھیں!!

انگوٹھی خود بخود اسی حالت پر واپس آ گئی۔ باہر سے فیضان کے قدموں کی چاپ پر وہ نارمل ہو کر بیٹھ رہا...... لیکن اسے احساس بھی نہ ہوا کہ پشت سے کب کون اندر داخل ہوا اور کلاشنکوف کی سرد نالی اس کی گردن سے لگا دی۔

''مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو! اپنی دانست میں بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ وارننگ ہے۔ کابل کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہر غیر ملکی ہمارا مہمان ہے لیکن دشمن یا اس کے ایجنٹ کو ہم کبھی معاف نہیں کرتے...... ! تمہاری حرکات شروع ہی سے مشکوک رہی ہیں...... بہت جلد تم یہ بتادو گے کہ تم کون ہو......؟''

بہت اطمینان سے وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''لیکن...... ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تمہاری اطلاع کے لئے بتاتا چلوں کہ ان پیالوں میں جان بوجھ کر پہلے سے پانی بھر کر رکھا گیا تھا...... تاکہ تم ان میں سے کسی ایک میں زہر انڈیلو اور پکڑے جاؤ...... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں وہ زہر ہے جو ''جی آر یو'' کے ایجنٹ استعمال کرتے ہیں یہ زہر جسم میں داخل ہونے کے کم از کم چار گھنٹے بعد اثر کرتا ہے...... اس طرح تمہیں چار گھنٹے نکلنے کے لئے مل جاتے...... افسوس تم کامیاب نہ ہوسکے۔''

اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ نیزے کی انی کی طرح ٹھاکر رمیش کے کلیجے میں اتر رہا تھا۔ یہ شخص کتنی معلومات رکھتا ہے...... اتنے ہوشیار آدمی سے اس کا واسطہ دنیا کے کسی براعظم میں آج تک نہیں پڑا تھا۔

''مرنے سے پہلے صرف ایک بات جان لو کہ اگر تم کسی غیر مسلم صحافی کے لبادے میں بھی یہاں آتے تو ہم تمہاری اس طرح عزت کرتے...... اور سب سے بڑی بات کہ اگر تم چپ چاپ واپس چلے جاتے تو بھی ہم تمہیں کچھ نہ کہتے...... لیکن اب......'' وہ ٹھاکر کی آنکھوں کی دم توڑتی روشنی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں ان لوگوں نے شاید مشرقی یورپ کے کسی کیمپ میں ٹریننگ دی ہوگی۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے...... اصل بات تو یہ ہے کہ اب تمہیں بہر حال مرنا ہے...... تم خود جانتے ہو تمہاری ناکام واپسی پر ''کے جی بی'' تمہیں مار ڈالے گی...... پھر ہم ہی تمہیں کیوں نہ مار ڈالیں۔''

''مم۔مم مجھے معاف کردو''...... ٹھاکر گڑگڑایا۔

''تم بہت بزدل انسان ہو۔ موت سے اتنا ڈرتے ہو تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو کھانا کھاتے ہیں۔''

وہ بڑی بے تکلفی سے کھانا کھانے لگے۔

ٹھاکر کی رگوں سے جیسے خون نچڑ چکا تھا...... خوف اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گیا۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں سے جان نکلتی محسوس ہورہی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے ڈھنگ سے اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی...... یہ ایک مجاہد کے جذبہ ایمان کا جلال تھا جس نے ''کے جی بی'' کے ایک پیشہ ور قاتل کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا......

''میرا خیال ہے تم کھانا کھا ہی لو...... زندگی کا آخری کھانا......''

فیضان نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

اس کی موت اتنی اذیت ناک ہوگی یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا...... کتنی بے بسی سے مرنے جا رہا تھا وہ...... ٹھا کر کو آج اپنے تمام گناہ یاد آرہے تھے۔ ایک ایک کر کے ان تمام مقتولین کی شکلیں یاد آرہی تھیں جو اس کی سفاکی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اس کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی نے جانے اب تک کتنے لوگوں کی جان لے لی تھی...... وہ اپنے شکار کو مارنے کا ہر دفعہ نیا طریقہ سوچتا تھا...... بڑی جدت پیدا کر لی تھی اس نے اپنے اس فن میں......

☆☆

لیکن......! یہ تو کبھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مرجائے گا۔

''لوگر'' چھاؤنی کے اوپی کے آنکھوں سے لگی دوربین نے پہاڑی سلسلوں سے ایک گھوڑے کو اس طرح آتے دیکھا تو اس کا چونکنا بالکل فطری عمل تھا۔ اس نے چیخ کر مشین گن کے مورچے میں موجود روسی سپاہی کو مخاطب کیا۔ پہلے تو بے اختیار روسی سپاہی کا ہاتھ ٹریگر کی طرف بڑھا پھر وہ کچھ سوچ کر رک گیا......!

اس نے مورچے میں لگے ٹیلی فون کے ذریعے اپنے کمانڈر کو اطلاع دی دوسرے ہی لمحے کمانڈر وہاں موجود تھا...... روسی کرنل نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگا لی اسے گھوڑے پر رسیوں سے بندھا ایک شخص نظر آرہا تھا۔

''اس پر نشانہ لگائے رکھو اگر معاملہ گڑبڑ نظر آئے تو بلا دریغ گولی چلا دینا......''

اس نے روسی سپاہی کو حکم دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے تین افغان فوجیوں کو اس طرح روانہ کر دیا کہ وہ گھوڑے کو چھاؤنی سے دور ہی روک لیں۔

تینوں افغان فوجی بادل نخواستہ اس مشن پر جا رہے تھے...... کچھ بھی ممکن تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مجاہدین نے کوئی دھماکہ خیز مواد اس طرح نہ بھیجا ہو جو انہیں اڑا کر رکھ دے۔

کسی نہ کسی طرح انہوں نے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ اس پر لدی شخصیت کو وہ دیکھے بغیر نہ رہ سکے یہ تو وہی صحافی ہے جو صبح ہی مجاہدین کے مورچوں کی طرف روانہ تھا۔

گھوڑا اپنے سامان سمیت روسی کمانڈر کے سامنے کھڑا تھا۔ کرنل نے مردہ ٹھاکر رمیش کو رسیوں سے آزاد کروایا۔ اس کا پورا سامان اس کے ساتھ ہی بندھا تھا۔

اس کے گلے میں تعویذ کی طرح لٹکتا ایک لفافہ کرنل کو نظر آ گیا تھا۔ سب سے پہلے کرنل نے وہی لفافہ چاک کیا...... اندر ایک کاغذ پر روسی زبان میں تحریر تھا۔

''حزب اللہ کے کمانڈر فیضان اوغلو کی طرف سے ''کے جی بی'' کے نام۔ آپ کا بھیجا ہوا تحفہ واپس لوٹا رہا ہوں۔ ہم نے اسے وہی

زہر پلایا ہے جو آپ نے ہمارے لئے بھیجا تھا۔

نئے تحفے کا منتظر......!

خط کے آخر میں فیضان اوغلو کے دستخط تھے۔

روسی کرنل نے دانت پیستے ہوئے وہ رقعہ دوبارہ لفافے میں ڈالا اور تیز رفتاری سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جانے سے پہلے اس لاش اور سامان کے متعلق وہاں موجود فوجیوں کو کوئی حکم ہی دے جائے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سیٹلائٹ سسٹم کے ذریعے "کے جی بی" کے ہیڈ کوارٹر میں ٹھاکر رمیش کی موت کی رپورٹ دیگر تفصیلات کے ساتھ دے رہا تھا۔

❁.....❁.....❁

احمد ترسون

کرنل میخائل شولوخوف کے لئے یہ تازہ ترین چوٹ موت کے پیغام سے کم ہرگز نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب معاملہ براہ راست کے جی بی کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ اس کی کابل میں موجودگی کے دوران لالہ چندو مل کا راز فاش ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان حالات میں جبکہ پہلے ہی اس کے افسران بالا اس سے خوش نہیں تھے یہ حادثہ اسے لے ڈوبتا۔

ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ یہاں "خاذ" کے ہیڈ کوارٹر میں ضرور کوئی مجاہدین کا آدمی موجود ہے۔ لیکن وہ کون ہے؟

یہ سوال اسے مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں یہاں موجودہ افغانیوں کے گرداگرد جو جال پھیلا رکھا تھا اور جس طرح ایک دوسرے سے ان لوگوں کی جاسوسی وہ کروا رہا تھا۔ اس کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ آدمی ان کی نظروں سے چھپا رہتا۔

وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔ کوئی راستہ اسے اس اندھیرے غار سے جس میں وہ اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا نکلنے کا نظر نہیں آتا تھا وہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا اور صبح سے لے کر اب تک بے تحاشا سگریٹ پینے کی وجہ سے اسے اب گلے میں خارش ہونے لگی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس کے کرخت چہرے کے تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑ گئے۔

کرنل شولوخوف نے اپنے سامنے میز پر رکھی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ فوراً ایک باوردی ضابطہ اندر داخل ہوا۔

"احمد ترسون کو لے آؤ۔" اس نے ضابط کی طرف دیکھے بغیر کہا اور وہ انہیں پاؤں واپس گھوم گیا۔

"ٹارچر سیل" میں جب سنائی کو یہ اطلاع ملی کہ احمد ترسون کو "آپریشن چیف" نے اچانک طلب کیا ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے یہی اندازہ لگایا کہ اب شاید اس کی جان ہمیشہ کے لئے احمد ترسون سے چھوٹ جائے گی کیونکہ کرنل شولوخوف نے آج تک کسی کو شاباش دینے کیلئے طلب نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھاگا بھاگا احمد ترسون کے پاس پہنچا۔

"تمہارے لئے خوش خبری آئی ہے۔" اس نے ترسون پر نظر پڑتے ہی بڑے طنزیہ انداز میں اسے کہا۔

"کیا......؟" ترسون کی چھٹی حس نے جیسے پہلے ہی سے اسے "خوشخبری" کا احساس دلایا ہو۔

"تمہیں کرنل شولوخوف نے طلب کیا ہے۔ اس کا ضابطہ باہر کھڑا ہے ابھی اور فوراً"

ایک لمحے کے لئے تو احمد ترسون کو خون اپنی رگوں میں رکتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس نے جلدی ہی سنبھالا لیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے لنگر خانے کا حساب رکھا تھا۔ وہ آپ دیکھ لیں" ...... کہتا ہوا وہ باہر آ گیا۔

سنائی اسے اپنے بلاک کے دروازے تک چھوڑنے گیا تھا۔ بلاک کے دروازے پر ایک مسلح ضابطہ اس کا منتظر تھا۔ "آپ کو کرنل صاحب

نے یاد فرمایا ہے۔'' اس نے احمد ترسون کو دیکھتے ہی سلیوٹ مار کر کہا۔

''چلو۔''

احمد ترسون اس کی معیت میں چلتا ہوا سوچ رہا تھا کہ ضرور اس کی کسی حرکت پر کرنل شولوخوف کو شک ہو گیا ہے۔ اس نے ابھی تک کوئی ''کام کی بات'' سنائی سے متعلق بھی تو کرنل تک نہیں پہنچائی تھی۔

دروازے پر مسلح محافظوں نے اس کی تلاشی لی اور اس کا سروس ریوالور اپنے پاس رکھ کر دروازہ کھولتے ہوئے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ مسلسل سگریٹ نوشی کی وجہ سے کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا شاید سردی کے مدنظر شولوخوف نے ایگزاسٹ فین نہیں چلایا تھا۔

احمد سگریٹ نوشی نہیں کرتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا اور اس کی گھبراہٹ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اضافہ ہو گیا۔ کرنل شولوخوف اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑکی میں لگے شیشے پر جمی دھند اور اسے پھسلتی پانی کی بوندوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ جیسے وہ احمد ترسون کی طرف گھوما جونیئر ضابطہ کی ایڑیں آپس میں مل گئیں۔ اس نے کھٹاک سے سلیوٹ مار کر اسے تعظیم دی۔

''تمہاری طرف سے ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی۔''

اس نے حسب عادت سیدھا کلہاڑا ترسون کے اعصاب پر مار دیا۔

''سر! میں نے اس پر مکمل نظر رکھی ہوئی ہے۔'' احمد ترسون نے خود پر بہت قابو پا لیا تھا۔

''میں نے تمہیں نظر رکھنے کو نہیں رپورٹ کرنے کو کہا تھا۔ گدھے......''

شولوخوف نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بید کو دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے غصے کا اظہار کیا اور اس نے لفظ ''رپورٹ'' پر خاصا زور دیا تھا اور اس کا مطلب ترسون بخوبی سمجھتا تھا۔

''کچھ بھی ہو......'' شولوخوف کا لہجہ بڑا ڈراؤنا تھا۔ لرزا دینے والا۔ اس کی شخصیت کے اسی روپ پر یہاں کے ملازموں نے اسے خونخوار بھیڑیے کا خطاب دے رکھا تھا۔

''مجھے ایک ہفتہ کے اندر ہر صورت اس کے خلاف ثبوت چاہئے۔''

اس نے حسب عادت چھڑی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر ماری اور اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ احمد ترسون کو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ سہم کر رہ گیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم کی تمام توانائی آہستہ آہستہ نکل رہی ہو۔

''دفع ہو جاؤ......'' کرنل شولوخوف دھاڑا۔

احمد ترسون جب اس کے کمرے سے نکلا تو شدید سردی کے باوجود اس کا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا...... ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے بڑے

احترام سے اس کا پستول لوٹا دیا۔ احمد ترسون بوجھل دل اور قدموں سے چلتا ہوا اپنے بلاک میں واپس آ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ شولوخوف یہ سارا چکر اسفندیار کو چھٹی کروانے کے لئے چلا رہا ہے...... سنائی چونکہ اس کا خاص آدمی تھا اور اس کا سلسلہ ایک مرتبہ اگر مجاہدین سے ثابت ہو جاتا تو اسفندیار کے یہاں قیام کے تمام مواقع بھی خود بخود ختم ہو جاتے۔ اول تو وہ خود ہی استعفیٰ دے دیتا۔ بصورت دیگر یہاں سے اس کا تبادلہ کر دیا جاتا۔

''لیکن وہ بیچارے بوڑھے سنائی کے لئے مشکلات کیوں پیدا کرے۔'' اس نے سوچا۔ جہنم میں جائے شولوخوف۔ وہ بوڑھے سنائی کیلئے مشکلات پیدا کرنے سے پہلے ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ یوں بھی وہ یہ نوکری افغان حکومت کے لئے تو نہیں کر رہا۔

اگلے روز وہ چپ چاپ یہاں سے نکلا اور مجاہدین کے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کی سابقہ ڈیوٹی اب کسی اور نے ادا کرنی تھی۔

 ☆☆

بائیس روز کا جاں جان لیوا سفر طے کر کے وہ ننگرہار پہنچے تھے......

یہ راستے اس کے لئے اجنبی نہیں رہے تھے۔ یہاں کا ایک ایک ذرہ اس کے ساتھ ہی غنیم کے خلاف مصروف جہاد تھا۔ اسی راستے سے گزر کر ان کے اسلاف نے کبھی ہند کے کفر کدے میں نور ایمانی کی مشعل جلائی تھی...... آج انہی راہوں پر سفر کر کے وہ پناہ کی تلاش میں ادھر آ نکلا تھا۔

جلال آباد سے یہاں تک کا سفر انہوں نے پہاڑیوں میں چھپتے چھپاتے چھ سات روز میں طے کیا تھا۔ عموماً وہ یہ سفر دو روز میں طے کر لیا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ کے جی بی اپنی سی کر گزری تھی۔ یہ الگ بات کہ روسی کمانڈوز اور ''خاد'' کے ایجنٹ دونوں کی گرد کو بھی نہ چھو سکے......!

دشمن نے اس راستے پر جاسوسی کا وسیع جال بچھا رکھا تھا۔ اس کے جاسوس مجاہدین کا لبادہ اوڑھ کر مختلف ''مراکز'' میں موجود تھے۔ وہ لوگ بڑی بے چینی سے شمشیر خان اور فیضان اوغلو کے منتظر تھے۔ ان کی گرفتاری یا موت کی صورت میں کسی بھی مخبر کا منہ افغان سرکار موتیوں سے بھر دیتی۔

فیضان جانتا تھا کہ ان کے استقبال کو مجاہدین کے ہر ''غنڈ'' (مراکز) پر ''خاد'' کا کوئی نہ کوئی ایجنٹ ضرور موجود ہوگا۔ اس نے کوئی معمولی چوٹ دشمن پر نہیں کی تھی۔ ایسا بھرپور وار کیا تھا کہ دشمن مدتوں اپنا زخم چاٹتا رہتا لیکن اس کی تلافی ممکن نہیں تھی۔

لالہ چندولل کی موت اس علاقے میں کے جی بی کی موت تھی! یہ خبر دشمن کیلئے دھماکے سے کم نہیں تھی کہ ''خاد'' کے مرکزی دفاتر میں بھی مجاہدین کے ساتھی موجود ہیں اور دنیا میں جہاں کہیں افغان تارکین وطن نے بسیرا کر رکھا ہے وہاں تک مجاہدین کے نظام جاسوسی کو بھی رسائی حاصل ہے۔ وہ جنہیں ان پڑھ، جاہل اور گنوار سمجھ رہا تھا وہ لوگ اس کی شاطرانہ چالوں کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ ان سے نمٹنے کے فن سے بھی انہیں آگاہی حاصل تھی۔

کابل کے گردونواح میں مصروف جہاد مجاہدین اپنے مشن کی تکمیل کے بعد جب اپنے کیمپوں کو لوٹتے تو وہ اپنے راستے میں آنے والے مجاہدین کی مختلف جماعتوں کے ''غنڈ'' (مراکز) پر قیام کرتے ہوئے واپس آتے تھے، لیکن دونوں نے یہ خطرہ مول نہ لیا۔ راستے میں پڑنے والے مختلف دیہاتوں سے انہوں نے پیٹ کی آگ بجھائی اور کسی نہ کسی طرح ننگرہار پہنچ گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے یہ سفر اکیلے ہی طے کیا ورنہ عموماً وہ لوگ

قافلوں کی صورت ہی میں سفر کیا کرتے تھے۔

ننگر ہار سے وہ خیبر کے راستے پشاور گئے۔

☆☆

چند روز قیام کے بعد وہ دونوں بنوں کے راستے پر سفر کرتے دوبارہ میران شاہ کی طرف جا رہے تھے...... جہاں پکتیان میں مجاہدین کے مضبوط مرکز ''ژاور'' پر دشمن کے حملے کی اطلاع نے مجاہدین کے قریباً سب ہی گروپوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔

اس بات کا علم تو فیضان کو بھی ہو چکا تھا کہ دشمن ''خوست'' میں اپنی قوت جمع کر رہا ہے۔ قلعہ خوست میں اجتماع کا مقصد اس پر بخوبی عیاں تھا۔ وہ جان سکتا تھا کہ دشمن کی نظریں باڑی، لواور ژاور میں موجود مجاہدین کی قلعہ بندیوں پر لگی ہیں۔

ان علاقوں میں مجاہدین نے اپنے قدم بڑی مضبوطی سے جما لئے تھے اور اپنے مورچے انہوں نے پہاڑوں میں اس طرح پھیلا رکھے تھے کہ دشمن کی بمباری ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

میران شاہ کی ایک خیمہ بستی میں فیضان مقامی کمانڈر مولوی حسن قلی کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک نقشہ انہوں نے اپنے سامنے پھیلا رکھا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی ضابط عمر خان گفتگو کے دوران بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا......!!

وہ ماسکو کا تربیت یافتہ ضابط تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس حملے میں روسی فوج کے ائر بورن ڈویژن کے کمانڈوز حصہ لے رہے ہیں......!

جذبہ اپنی جگہ ایک اہم چیز ہے لیکن اسلحہ کی کمیابی نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

''میں جانتا ہوں عمر خان تم کیا سوچ رہے ہو؟'' مولوی حسن قلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا...... ''لیکن یہ ہمارے ساتھ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا...... ہماری تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔ اور نہ ہونے کے برابر ہے ہم نے ہر حملہ اللہ کے بھروسے اور اپنے ایمان کی قوت پر روکا ہے...... عمر خان تم نہ بھی کچھ کہو مجھے دشمن کے حملے کی شدت کا اندازہ ہے۔ ہمارے پاس ٹینک شکن اسلحہ نہ ہونے کے برابر ہے ہم ہوائی جہازوں کو کیسے گرائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے یہ جنگ لڑنی ہے...... آخری دم تک ''ژاور'' کی لڑائی کا اثر اس محاذ کے ہر مورچے پر موجود جوان پر ہو سکتا ہے۔''

''بس مولوی جی! اور کچھ نہ کہئے!''...... ضابط عمر خان کی آنکھیں فضا میں کہیں جھانک رہی تھی۔

تینوں کچھ دیر تک حملہ روکنے کی پلاننگ کرتے رہے پھر تینوں ایک ہی جیپ میں بیٹھ کر ''ژاور'' کی طرف روانہ ہو گئے۔

اگلے ہی روز دشمن نے حملہ کر دیا۔

حملے کا آغاز کمانڈوز نے کیا......!

علی الصبح...... افغان فوج کے کمانڈوز کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے لوا کی پہاڑی پر اتار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ژاور کے گرد اگرد کی قریباً سب ہی اہم پہاڑوں پر افغان چھاتہ برداروں کا ٹڈی دل پھیلنے لگا۔

دشمن نے وہی چال چلی تھی جو عموماً ایسی لڑائیوں میں چلی جاتی ہے۔ فرنگی بھی یہاں کے جیالوں سے نمٹنے کے لئے حربے آزمایا کرتا

تھا۔اسی طرح دشمن نے مجاہدین کے سروں پر اپنی کمانڈو پوسٹیں نصب کر دی تھیں۔

اب دشمن نے ان پہاڑی مورچوں کے کور(Cover) کے ساتھ آگے ایڈوانس کرنا تھا۔مجاہدین نے اپنے پاس جیسے تیسے اسلحہ کے ساتھ حملہ آور ہیلی کاپٹروں میں سے دو کو مار گرایا اور دشمن کے سینکڑوں کمانڈوز کا بھی صفایا کر دیا۔

لیکن......دشمن نے بے پناہ قوت کے بل بوتے پر یہ حملہ کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔مجاہدین کو کمانڈوز کے ساتھ مقابلے میں الجھا کر دشمن کی آرٹلری نے ''ترغار'' کی بلند پہاڑیوں کی اوٹ میں اپنے محفوظ مورچوں سے مجاہدین پر قیامت ڈھا دی۔

اس کے ساتھ ہی افغان فضائیہ کے دو سکواڈرن حملہ آور ہوئے۔زمین اور فضا سے بیک وقت دشمن اتنی تیز اور مسلسل بمباری کر رہا تھا کہ کسی مجاہد کو مورچے سے سر اٹھانے کا موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔

افغان توپ خانہ اپنے روسی آقاؤں کی کمان میں ایک ایک انچ زمین پر آگ برسا رہا تھا۔آسمان سے آتش و آہن کا الگ سیلاب مجاہدین پر برس رہا تھا۔

آفرین ہے ان جیالوں پر جو اس آتش نمرود کے طوفان کے سامنے سینہ سپر رہے۔رات تک دشمن نے تباہ کن بمباری جاری رکھی اور علی الصبح ہیوی توپ خانے کی بمباری کی آڑ میں قلعہ خوست میں موجود پیدل فوج نے ژاور کی طرف بڑھنا شروع کر دیا!

مجاہدین کی تعداد دشمن کے مقابلے میں آٹے میں نمک جتنی بھی نہیں تھی۔فیضان مولوی شیر گل کے ساتھ باڑی مرکز پر مشین گن سنبھالے بیٹھا تھا۔اس کی نظروں کے سامنے دشمن کے بکتر بند قافلے گزر رہے تھے۔لیکن اس ہلکی مشین گن سے وہ ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔وہ جوش غضب میں جو گولیاں ان فولاد کے ڈھیروں پر پھینکتا وہ صرف ٹھن کی آواز پیدا کر کے رہ جاتیں۔

پیدل فوج پر البتہ وہ قہر برساتا رہا۔

شام تک مرکز میں موجود قریباً ہر مجاہد یا تو شہید ہو چکا تھا یا پھر شدید زخمی تھا۔

تھوڑے زخمی مجاہدین اپنے زیادہ زخمی ساتھیوں کو ژاور کی طرف منتقل کرتے رہے رات ڈھلنے تک مرکز میں فیضان کے ساتھ مولوی شیر گل اور دو زخمی مجاہدین باقی رہ گئے تھے......

''فیضان!مقابلہ بے سود ہے......ہمیں ژاور کی طرف پسپائی اختیار کرنا ہوگی۔'' مولوی شیر گل نے جو اس کے نزدیک ہی ایک زخمی مجاہد کے بازو پر اپنی پگڑی باندھ رہا تھا۔فیضان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

فیضان نے گردن موڑ کر مولوی گل شیر کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں غضب اور بے بسی کے ملے جلے قہر نے پناہ لے رکھی تھی۔مولوی شیر گل جانتا تھا کہ فیضان کا دل اس کی بات قبول نہیں کر رہا۔

لیکن......!اس نے بھی یہ فیصلہ بادل نخواستہ ہی کیا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ صبح اپنے اس قیمتی جانباز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔''فیضان میرے بیٹے!میں تمہارے جذبات اچھی طرح سمجھتا

ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہے ہو..... لیکن میرے عزیز! میں تمہیں ضائع نہیں ہونے دوں گا..... یہ جنگ جانے کتنی لمبی ہو جائے۔ ہمیں جانے ابھی کب تک لڑنا ہے..... مجھے کچھ اپنے پاس محفوظ بھی رکھنا ہو گا۔ میرے بیٹے.....!''

''یا امیر! میرا دل پسپائی اختیار کرنے کو رضامند نہیں.....''

فیضان نے اس کے علاوہ کچھ نہ کہا۔

''نہیں بیٹے! یہ حکمت عملی کا تقاضا ہے۔ مسلمان میدان جہاد سے پیٹھ نہیں دکھایا کرتا۔ ہم پسپا ہو رہے ہیں۔ واپس آنے کیلئے..... خدائے وحدہ لاشریک کی قسم اگر ہماری رگوں میں افغانی ماؤں کا خون ہی دوڑ رہا ہے تو ہم ''ژاور'' پر دشمن کا قبضہ کبھی برقرار نہیں رہنے دیں گے۔''

تینوں نے رات کے اندھیرے میں پسپائی اختیار کی تھی پہلے وہ ''ژاور'' آئے جہاں صورت حاصل مختلف نہیں تھی..... دشمن کی سینکڑوں لاشوں کے درمیان انہیں مجاہدین کے شہید لاشے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ایک ایک کر کے شاید تمام مجاہدین اپنی حاضری اللہ کے حضور لگوا چکے تھے!

تینوں نے ''ژاور'' پر حسرت کی نظر ڈالی اور میران شاہ کی طرف چل دیئے..... گو کہ دشمن ہر طرف گھیرا ڈال چکا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح یہ تینوں مجاہد صبح ڈھلنے تک میران شاہ پہنچ گئے۔

ان کی آمد سے پہلے کچھ زخمی مجاہد یہاں موجود تھے۔ جن کی زبانی اطلاع ملی کہ سوائے دو تین مورچوں کے باقی ہر جگہ مزاحمت دم توڑ چکی ہے۔ مجاہدین یا تو شہید ہو چکے ہیں یا پھر شدید زخمی حالت میں وہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔

علی الصبح میران شاہ میں تمام محاذوں کے کمانڈر جمع ہو چکے تھے۔!! وہ لوگ مل کر کوئی لائحہ عمل طے کرنے لگے۔ پھر ظہر کی نماز تک ایک فیصلے پر پہنچ کر سب مطمئن ہو گئے۔

اسی روز مغرب کے بعد مختلف مراکز سے اکٹھے ہونے والے قریباً سات آٹھ ہزار مجاہدین دشمن کی موت کا پیغام بن کر اپنے اپنے مراکز سے ''ژاور'' کی طرف یلغار کرنے لگے..... ان کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ ان کی آمد کی اطلاع پر ہی دشمن اپنا بھاری اسلحہ چھوڑ کر بھاگنے کی تیاری کرنے لگا۔

اس دوران مجاہدین نے جو زخمی حالت میں پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے لنڈا اور باڑی پہنچنا شروع کر دیا اور اس طرف سے فرار ہونے والے روسی افغان فوجیوں کے فرار کے راہیں مسدود کر دیں۔ دشمن بری طرح گھیرے میں آ چکا تھا۔ اس کا مورال تو مجاہدین کے اتنی زیادہ تعداد میں اکٹھے ہو کر حملہ کرنے کی خبر سے ہی ختم ہو چکا تھا.....! جب دشمن کو یہ احساس ہوا کہ وہ گھیرے میں بھی آ گیا ہے تو اس کے حوصلہ بالکل ہی پست ہو گئے۔

دوپہر تک مجاہدین کا قبضہ دوبارہ خوست تک ہو چکا تھا۔ سینکڑوں روسی افغان فوجی مارے گئے تھے اور سینکڑوں ہتھیار ڈال چکے تھے۔

❁.....❁.....❁

محسن کا ملاپ

ننگر ہارے پاڑہ چنار کے طرف آنے والے راستے پر دونوں بڑی دیر سے نظریں جمائے بیٹھے تھے......اس راستے پر مجاہدین عموماً بہت چوکس ہو کر پہرہ دیا کرتے تھے کیونکہ اس راہ سے مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان میں داخل ہوتے تھے......!

فیضان خود آنکھوں سے دوربین لگائے خستہ اور نڈھال لیکن سرخ وسپید اور پر عزم چہروں کے مالک افغانوں کو دیکھ رہا تھا......ان کے جسموں پر کپڑوں کے بجائے چیتھڑے لٹک رہے تھے اور شدید سردی میں لرزتے، کپکپاتے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر وہ ہمسایہ مسلمان مملکت کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر فیضان کا ذہن چودہ سو سال پیچھے لوٹ گیا۔اس نے تصور کی آنکھ سے خدا کے ان برگزیدہ بندوں کو دیکھا جن پر مکہ کی زمین محض اس لئے تنگ کر دی گئی تھی کہ انہوں نے خدا کے اصلی سچے اور ہمیشہ رہنے والے دین کی حقانیت کو قبول کر کے اس دین مبین کو انسانوں تک پہنچانے والے پیغمبر نبی آخر الزماں محمد ﷺ کی صدائے حق پر لبیک کہا تھا۔

ان میں وہ بھی شامل تھے جو اپنے اپنے قبیلوں کے سرکردہ لوگ شمار ہوتے تھے......ان میں وہ بھی تھے جن کی ہیبت سے کبھی مکہ کی گلیاں لرزا کرتی تھیں۔جن کے دبدبے اور جلال کے سامنے انسانی نظر ہی نہیں ٹھہرتی تھی لیکن آج......!

آج وہ سب اپنی سرداریاں، عزت، جاہ، منصب چھوڑ کر اپنے سردار رحمت اللعلمین محمد ﷺ کے حکم پر مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کر رہے تھے......!!

تاریخ کا ایک اور ورق پلٹا اور اس کی نگاہیں ابو جندلؓ کے باپ پر گڑ گئیں! جو صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھنے سے پہلے ہی پاؤں میں بیڑیاں پہنے گرتے پڑتے وہاں آن پہنچے تھے......!!

ابو جندلؓ نے روتے ہوئے فریاد کی تھی۔

یا رسول اللہ ﷺ! یہ دیکھئے میری پیٹھ پر کوڑوں کے نشان ابھی تازہ ہیں......!

میرا سینہ جلتے ہوئے پتھروں سے داغا گیا ہے!

میری پشت کو تپتی ریت پر گھسیٹا گیا ہے!

ان کافروں نے مجھے ہر ممکن اذیت بہم پہنچائی ہے۔

میرا جرم کیا ہے؟......یہی جرم ہے میرا کہ میں نے اعلائے کلمۃ الحق پر لبیک کہا ہے......!

یارسول اللہ ﷺ! یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے بیزاری کا اعلان کرو ورنہ اسی طرح ستائے جاؤ گے..... مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ ظالمو! وحشیو! نادانو! محمد ﷺ کی رفاقت اور اطاعت پر مجھ ایسی ایک تو کیا ہزار جانیں بھی قربان۔

تم میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دو..... میرے ہر عضو کو دہکتی ہوئی آگ سے داغدار کر دو..... تمہارے کوڑے میرے خون میں نہا جائیں لیکن جب تک میرے جسم میں خون کی ایک رمق بھی باقی ہے..... جب تک میری سانسوں کا رشتہ ٹوٹ نہیں جاتا میں اللہ کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کا دم بھرتا ہوں گا!

ابو جندلؓ بڑی مشکل سے بیڑیوں سمیت فرار ہو کر آئے تھے لیکن حضور ﷺ انہیں پناہ نہ دے سکے..... انہیں واپس جانا پڑا۔

تاریخ کا سفر جاری رہا۔

اس کے چشم تصور نے اگلا ورق ٹٹولا تو دیکھا کہ وہی مظلوم، اور اپنے گھروں سے نکالے گئے مقہور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تاجدار نبوت ﷺ کی سربراہی میں جوق در جوق اسی مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کی زمین ان پر تنگ کر دی گئی تھی.....!!

مکہ کی وہ گلیاں جن کی کھڑکیوں اور دروازوں سے مسلمانوں پر پتھروں اور گالیوں کی بارش ہوا کرتی تھی آج انکی جلالت کے سامنے سرنگوں تھیں۔ کبھی سر جھکا کر یہاں سے گزرنے والے مجبور انسان آج فاتح بن کر لوٹے تھے..... ان کی گردنیں تو اب بھی خدا کے حضور جھکی ہوئی تھیں۔

المیہ تو ان پر گزرا جن کی نخوت سے تنی ہوئی گردنیں خم کھا گئیں.....! وہ جنہوں نے مسلمانوں کو گھروں سے بے گھر کیا تھا..... ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے..... انہیں عرب کے تپتے ریگزاروں پر گھسیٹا تھا..... پہاڑوں کی گھاٹیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا..... ان کے زخمی اور خون آلود جسموں پر گھوڑے دوڑائے تھے.....!

وہ جابر و حاسد قریش کے سردار بدحواس اور سراسیمہ ہو کر اپنے گھروں میں بزدلوں کی طرح بند ہو کر بیٹھ رہے تھے۔

مقابلہ کرنا تو دور کی بات تھی..... اس لشکر جرار کے سامنے کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

قریش کے بازوئے شجاعت آج شل ہو گئے تھے۔

جرائتیں جواب دے گئی تھیں!

ان کی آبائی عربی غیرت پر اوس پڑ گئی تھی.....!

تلواریں زنگ آلود ہو گئی تھیں۔

مکہ میں مقام خیف ہی کو نبی کریم ﷺ کی پہلی قیام گاہ کا شرف حاصل ہوا.....! یہ وہی مقام مظلومیت تھا جہاں بنو ہاشم کفار مکہ کی طرف سے اپنے بائیکاٹ کے بعد محصور ہوئے تھے.....!

کل کے محصور آج کے فاتح تھے.....!

کل کے ظالم آج اپنے ہاتھوں ستائے گئے مظلوموں کی چشم کرم کے محتاج تھے۔ ان کے سامنے پناہ کے لئے، زندگیوں کی امان کے لئے

گڑگڑا رہے تھے......!!

التجائیں کر رہے تھے۔

حق آ گیا تھا......باطل کا جنازہ اٹھ چکا تھا......!

اور فیضان سوچ رہا تھا......!

کیا سچائی کو اپنا آپ منوانے کے لئے ان مراحل سے گزرنا ضروری ہے؟ تو اسے قرآن کی وہ آیات یاد آ گئیں جن میں اللہ نے اپنے بندوں سے امتحان لینے کا ذکر کیا تھا......!

☆☆

ماضی میں سفر کرتا فیضان اوغلو حال کی تلخ حقیقت میں واپس لوٹا تو اچانک اس کی دوربین اللہ کے راستے پر سفر کرتے ایک بوڑھے مسافر پر فوکس ہو رہ گئی۔

''میرے خدایا! یہ تو وہی ہے'' وہ بڑبڑایا۔

واقعی یہ وہی تھا......!

وہی بوڑھا مصور......! جس نے اس کی تصویر حیات میں بڑے گہرے رنگ بھرے تھے جس نے اسے مرنے کے بجائے جینے کی راہ دکھائی تھی......جس نے اسے زندگی کے حقیقی مفہوم سے آشنا کیا تھا۔

یہی تھا اس کا محسن عظیم......

فیضان بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دیوانہ وار اس کے قدم بڑی تیزی سے اپنی سمت آنے والے پتھریلے راستے پر اٹھنے لگے جس سے گزر کر قافلے نے یہاں پہنچنا تھا۔

پہاڑیوں میں مورچہ بند مجاہدین نے ممکنہ فضائی اور زمینی حملے کے پیش نظر اس قافلے کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بزدل دشمن ان نہتے اور بے بس مظلوم مہاجرین پر اس وقت تک فضا اور زمین سے آگ برساتا رہتا ہے جب تک وہ سرحد پار نہ کر جاتے......!

اپنی حدود میں قدم رکھنے کے فوراً ہی بعد مجاہدین ان مظلوموں پر اپنی گنوں کا سایہ کر دیتے تھے۔

فیضان کو اچانک بھاگتے دیکھ کر اس کے تین ساتھی اس کے تعاقب میں لپکے انہیں کمانڈر فیضان کی اس اچانک حرکت نے بوکھلا کر ہی تو رکھ دیا تھا......فیضان کا رخ اپنے بوڑھے محسن کی طرف تھا......!! بوڑھے مصور کے نزدیک پہنچ کر وہ رک گیا......قافلے والوں کی نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''بزرگوار!''......اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''میرے بچے''......بوڑھے مصور نے اسے پہچان کر اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

فیضان ان کی بانہوں میں سمٹ گیا۔ آج اسے پھر بہت دیر بعد ایک پراسراری طمانیت اپنی رنگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوئی تھی۔ جانے اس بوڑھے مصور کے پاس ایسی کیا روحانی قوت تھی کہ اس کے سامنے آ کر فیضان ہمیشہ دب کر رہ جاتا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟''...... یہ فقرہ بھی اس نے بالکل لاشعوری طور پر ادا کیا تھا۔

میری بات چھوڑو بیٹا...... میرا سفر تو ختم ہوا...... خدا کا شکر ہے میں کم از کم سرخرو ہو کر دنیا سے جا رہا ہوں...... تمہارے کارناموں کی خبر مجھے ملتی رہتی ہے......!!

''آیئے! میرے ساتھ آیئے''......

فیضان نے اسے سہارا دے کر ایک طرف کرنا چاہا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا محسن شاید اس سے زیادہ سفر اپنے قدموں پر نہ کر سکے۔

''نہیں میں خود چل کر جا سکتا ہوں''......

بوڑھے مصور نے کہہ کر ابھی بمشکل ایک قدم ہی بڑھایا تھا جب وہ اچانک لڑکھڑا گیا۔

فیضان اور اس کے دوسرے مجاہد ساتھی نے اگر اچانک ہی اس کو سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ گر پڑتا۔

''غلام اللہ''...... کسی نے ان کو عقب سے بوڑھے کا نام لے کر پکارا۔

''بس کرو...... تم اور نہیں چل سکتے...... تمہارا زخم بگڑ چکا ہے''......

آواز کے تعاقب میں فیضان نے گردن موڑی تو کشادہ پیشانی اور گہری آنکھوں والے ایک نوجوان سے اس کی آنکھیں ٹکرا گئیں جس نے بوڑھے کو اس کا نام لے کر پکارا تھا۔

فیضان کے استفسار کرنے سے پہلے وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا۔

''غلام اللہ پر بہت تشدد ہوا ہے...... یہ بڑی مشکل سے ان کے چنگل سے نکل کر بھاگا ہے...... ہم نے دیسی ٹوٹکوں سے علاج کیا ہے اس کا ...... اس کی حالت بہت خراب ہے...... جلدی کرو...... میں میڈیکل کا طالب علم ہوں...... میں اس کی حالت کو زیادہ بہتر جانتا ہوں...... جلدی کرو...... جتنی جلدی ممکن ہو اسے طبی امداد ملنی چاہیے......'' نوجوان بے ربط سی گفتگو کر رہا تھا۔

فیضان کو یوں لگا جیسے کسی نے اچانک زوردار گھونسہ اس کے دل پر مارا ہو۔ اس نے بوڑھے کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور پتھریلے راستوں پر قریباً بھاگتا ہوا اس پناہ گاہ کی طرف بڑھا جہاں مجاہدین نے ہنگامی طبی امداد کا مرکز قائم کر رکھا تھا۔

اس علاقے میں ان لوگوں نے حال ہی میں مورچہ بندیاں کی تھیں اور فیضان کے علاوہ دوسرے گروپس کے مجاہدین بھی یہاں موجود رہتے تھے...... جیسے ہی وہ اپنے بوڑھے محسن کو اٹھائے پناہ گاہ تک پہنچا اس نے وہاں موجود بہت سے بوڑھے اور نوجوان مجاہدین کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

''غلام اللہ......''

''یہ تو غلام اللہ ہے۔''

''زخمی ہے شاید؟''

''غلام اللہ ٹھیک تو ہو نا!''

کئی آوازیں اسے پہچان کر ابھریں۔

غلام اللہ نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا......ایک مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں سے چپکی رہی۔

فیضان نے اسے اندر موجود ایک سٹریچر پر لٹادیا۔مہاجرین میں آنے والا میڈیکل کا طالب علم بھی اس کے ساتھ ان کے تعاقب میں چلا آیا تھا۔

''مجھے بھی دیکھنے دو......میں انہیں زیادہ بہتر طریقے پر سمجھا سکوں گا۔''

اس نے سٹریچر کے نزدیک موجود دو تھکے ہارے ڈاکٹروں کی طرف اشارہ کیا جو چند منٹ پہلے ہی ایک مجاہد کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر یہاں بیٹھے تھے۔

نوجوان سیدھا ان کی طرف بڑھا......

''اس کے پیٹ کا زخم بہت گہرا ہے''......

اس نے خود ہی سٹریچر پر لیٹے غلام اللہ کے پیٹ سے لپٹا ایک میلا سا کپڑا الگ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں ڈاکٹر اس طرف لپکے۔

''انفیکشن ہو گیا ہے شاید......

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف متوحش نظروں سے دیکھا۔

''ہری اپ''......ایک نے جو ان میں سینئر تھا اپنے ساتھی سے کہا۔

''تم لوگ باہر جاؤ''......اسی ڈاکٹر نے فیضان اور اس کے ساتھی کو مخاطب کیا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں......فیضان نے کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں......جاؤ......تم لوگ فوراً چلے جاؤ''......

ڈاکٹر کو شاید ان کا ابھی تک یہاں رکنا گوارا نہیں تھا۔

فیضان نے ایک مرتبہ اپنے محسن کی طرف دیکھا اور تیزی سے باہر نکل آیا......طبی امداد کا یہ چھوٹا سا کمرہ ایک پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا جس میں ان لوگوں نے ایک دروازہ بھی فٹ کر رکھا تھا......ان کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹروں نے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆

یہ ڈاکٹر بھی وہ مجاہد تھے جو مختلف مسلمان ملکوں میں وقتاً فوقتاً جہاد میں حصہ لینے کے لئے یہاں آ جاتے تھے...... نامکمل سامان اور دواؤں کے ساتھ دن رات وہ زخمی مجاہدین کی زندگیوں کا تحفظ کرنے کے لئے موت سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ بسا اوقات ایک ایک دن میں درجنوں مجاہدین یہاں لائے جاتے...... جن کو صرف ایک یا دو ڈاکٹر بغیر کسی مددگار کے طبی امداد دیتے تھے۔

کمرے کا دروازہ تقریباً آدھ گھنٹے بعد کھلا تھا!

یہ آدھ گھنٹہ فیضان کے لئے کئی صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔ اس آدھ گھنٹے میں اس نے زندگی کا بڑا روحانی کرب محسوس کر لیا تھا...... بے اختیار اس کی نظریں باہر آنے والے ڈاکٹر کی طرف اٹھیں۔

''دعا کرو......'' ڈاکٹر نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ اور ہاتھ دھونے کے لئے نزدیکی چشمے کی طرف بڑھا۔

''میں اس سے مل سکتا ہوں؟'' ...... فیضان کی آواز پر ڈاکٹر رک گیا۔ اس نے بڑی عجیب سی نظروں سے فیضان کی طرف دیکھا۔

''کمانڈر فیضان! تمہارا کوئی رشتہ ہے اس سے؟''

''تم سمجھ سکو گے ڈاکٹر!'' ...... فیضان کی آواز کہیں دور فضاؤں میں کھو گئی۔

''مل لو'' ...... کہہ کر ڈاکٹر دوبارہ آگے بڑھ گیا۔

☆☆

غلام اللہ ہوش و حواس میں بظاہر بڑے اطمینان سے کمرے میں رکھے واحد لوہے کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ فیضان کو اندر آتے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے سرہانے کھڑے قافلے کے ساتھ آنے والے میڈیکل سٹوڈنٹ نے اسے روک دیا۔

''بابا! تم کہاں رہے اتنی دیر...... میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔'' فیضان بے اختیار بول پڑا۔

''میں اپنی ڈیوٹی پر تھا بیٹا! جس طرح تم اپنا کام کر رہے ہو۔ میں وہاں کابل میں کام کر رہا تھا...... ایک روز ان لوگوں کو میری کسی حرکت پر شک گزرا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔'' اچانک درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی بوڑھا غلام اللہ دوہرا ہو کر رہ گیا۔

فیضان بیقراری سے اس کی طرف بڑھا۔

''نہیں...... کچھ نہیں...... بس...... تم ہٹ جاؤ...... میرے نزدیک نہ آؤ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔'' اس نے رک رک کر کمرے میں موجود دونوں انسانوں کو احکامات سنائے۔

فیضان میں اتنی جرأت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ کر اس کا حال ہی دریافت کر لے۔

''ان لوگوں نے مجھ پر ہر ممکن تشدد توڑا لیکن میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ میں بضد رہا کہ ان کا شک غلط اور بے بنیاد ہے...... کسی نے میرے خلاف انہیں بھڑکانے کی سازش کی ہے۔'' چند لمحوں کے لئے رک کر اس نے اپنی سانسوں کے منتشر تانے بانے کو سمیٹا۔

''دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح مجھے اس آستین کے سانپ کا پتہ چل جائے جس نے میری مخبری کی تھی......''

''دو ماہ تک مجھ پر تشدد کرنے کے بعد بالآخر اس بات کا یقین آ ہی گیا کہ ان کے مخبر کی اطلاع غلط تھی یا پھر اس نے حسد کے جذبے کے تحت میرا نام لے دیا ہے......''

''مجھے ایک گھونٹ پانی دو۔'' اس نے رک کر لمبا سانس لیا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی لمبا سفر کر کے تھک گیا ہو اور اب آرام کرنا چاہتا ہو۔

''پھر مجھے علم ہو ہی گیا اس آستین کے سانپ کا''......اس نے فیضان کی طرف دیکھا'' اور میں نے اسے مار ڈالا......!! مجھے علم نہیں تھا کہ اس کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ بھاگتے ہوئے مجھے اس کے محافظ کی گولی لگ گئی......اندھیرا تھا جو بچ نکلا......ورنہ شاید تم سے اگلی ملاقات اس زندگی میں کبھی ہو ہی نہ سکتی''......فیضان تڑپ اٹھا۔!

''اس نوجوان نے اصل میں مجھے یہاں تک پہنچایا ہے......مجھے یہ امید نہیں تھی کہ دوبارہ زندگی میں کبھی اپنے لوگوں سے مل پاؤں گا......تم فوراً ایک کام کرو''

''کیا؟''......فیضان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''قاسم ایشان زادہ کو کسی طرح یہاں لے آؤ''......اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

''قاسم'' کو......اچھا......اچھا......ٹھیک ہے۔ تم میرا انتظار کرنا''......فیضان بجلی کی سی سرعت سے باہر نکل آیا۔

باہر آ کر اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے دم توڑتے ہوئے محسن سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ قاسم ایشان زادہ کو اتنی جلدی یہاں کیسے لا سکے گا......وہ تو یہاں سے پندرہ بیس میل دور ایک خفیہ ٹھکانے میں موجود تھا جہاں پہنچنے کے لئے بھی اسے دشمن کے علاقے میں سے گزرنا پڑتا۔

''کچھ بھی ہو......'' اس نے اپنے آپ سے کہا......''میں اپنے محسن کی آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

☆☆

برق رفتاری سے پہاڑی سلسلوں میں بھاگتا ہوا وہ مولوی گل شیر تک پہنچا تھا۔ اس نے مقامی کمانڈر کو بتایا کہ وہ کسی دم توڑتے مجاہد کی آخری خواہش کے احترام میں قاسم ایشان زادہ کو بلانے جا رہا ہے تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی با دل نخواستہ فیضان کو اجازت دے دی۔

اس علاقے میں دو تین روز پہلے ہی روسی فوج نے کابل فوجیوں کے ساتھ مل کر مورچے سنبھالے تھے۔ یوں بھی یہ میدان کارزار تھا اور پچھلے کچھ عرصے سے طرفین یہاں زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے تھے......!!

شام کا ملگجا اندھیرا بارود سے جلی پہاڑیوں کے پیلے اور کالے سبزے پر رینگ رہا تھا جب فیضان اپنے مورچے سے باہر نکلا......!

اس نے پہاڑی کا لمبا چکر کاٹ کر قدرے محفوظ راستہ اختیار کیا تھا۔ یوں تو وہ لوگ اکثر رات کو گھات لگانے بھی انہی راستوں سے گزر کر جایا کرتے تھے، لیکن آج اس کا ''ٹارگٹ'' خاصا مشکل تھا۔

اس راستے پر بھی بارودی سرنگوں سے بچتا بچاتا وہ کسی نہ کسی طرح مجاہدین کے اس خفیہ ٹھکانے تک پہنچ ہی گیا جہاں بوڑھا قاسم ایشان

زادہ مجاہدین کی کمان کر رہا تھا۔

فیضان کو اس طرح اچانک اتنی رات گئے وہاں دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ جب اس نے اپنے یہاں آنے کا مدعا بیان کیا تو قاسم ایشان زادے کے بدن کا سارا لہو اس کے چہرے سے سما گیا......!!

اپنے دیرینہ ساتھی غلام اللہ کا نام سنتے ہی اندھیری رات میں بھی اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس کے جذبات کی شدت کا اندازہ فیضان بڑی آسانی سے لگا سکتا تھا۔

''میں ضرور چلوں گا...... ابھی تیار ہوتا ہوں۔'' اس نے بے کلی سے کہا۔

اپنی آمد کے قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی فیضان دوبارہ واپسی کے لئے تیار کھڑا تھا۔ بوڑھے ایشان زادہ نے اپنی کلاشنکوف اس طرح ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی کہ چند لمحے کی مہلت ملنے پر بھی وہ آزادانہ اسے استعمال کر سکتا تھا۔ مقامی مورچے کی کمان اس نے دم رخصت اپنے نائب کے سپرد کر دی تھی۔

تین مجاہدوں کا ایک دستہ انہیں دو تین میل دور تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے بعد فیضان نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس محاذ پر ان لوگوں کی کتنی ضرورت ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی کتنی گراں گزر سکتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کی خوش قسمتی اندھیری رات کی صورت میں ان کے سروں پر سایہ فگن تھی۔ کبھی قاسم آگے ہوتا اور کبھی فیضان...... دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ رکھ کر لیکن ایک دوسرے کے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشانات پر پاؤں دھرتے آگے بڑھ رہے تھے کیونکہ کسی بھی بارودی سرنگ پر اچانک پاؤں کا بوجھ پڑنے سے پھٹ جانے پر وہ ایک کے بجائے دو جانوں کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔!!

فیضان آگے آگے چل رہا تھا جب اچانک اس نے اپنے کندھے پر قاسم ایشان زادہ کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

☆☆

وہ ٹھٹک کر رک گیا......!!

قاسم نے نزدیک آ کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے نزدیک ہی کہیں قدموں کی چاپ سنی تھی۔ ان پہاڑیوں پر ہونے والی کسی بھی نقل و حرکت کا احساس ''مرد کوہستانی'' فوراً کر لیا کرتے تھے کہ وہ انہیں فضاؤں کے پلے بڑھے ہوئے تھے۔

فیضان نے اس کے اشارہ کرنے پر اپنے کان بھی اسی طرف لگا دیئے جلد ہی دونوں کو احساس ہو گیا کہ ان کے قریب ہی کہیں روسی کابل فوج کی کوئی پٹرولنگ پارٹی گشت کر رہی ہے۔ یہ لوگ رات کو عموماً مجاہدین کے ناگہانی حملوں کے تدارک کے لئے گشت کرتے رہتے تھے تاکہ اپنے باقی ساتھیوں کو مجاہدین کے شب خون سے بچا سکیں۔

دونوں وہیں ایک پہاڑی کے چھجے تلے جنگلی گھاس کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے کیونکہ قدموں کی آوازیں اب قریب آتی سنائی دے

رہی تھیں۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ پٹرولنگ پارٹی ان کے نزدیک آ رہی ہے۔

یہ بات تو وہ جانتے ہی تھے کہ یہاں محفوظ راستے تھوڑے ہی ہیں۔ عام راستوں پر مجاہدین اور دشمن دونوں نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور جس راستے پر وہ سفر کر رہے تھے اگر یہ راستہ محفوظ تھا تو دشمن فوج کے پٹرولنگ دستے نے بھی یہی راہ اختیار کرنی تھی۔

دونوں دم سادھے بیٹھے تھے......!

اچانک ہی فضا ایک زوردار دھماکے کی آواز سے لرز اٹھی۔ دھماکے کی گونج ابھی پہاڑیوں میں ختم نہیں ہوئی تھی کہ گولیوں کی تڑتڑ سے پہاڑی سلسلہ گونجنے لگا۔

شاید گشت کرنے والے کسی فوجی کا پاؤں بارودی سرنگ پر آ گیا تھا اور دشمن نے اسے مجاہدین کی کاروائی جان کر حفظ ماتقدم کے لئے گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ اس علاقے میں یوں بھی مجاہدین اکثر شب خون مارتے رہتے تھے۔ اور روسی کابل فوجی ان کی آہٹ پر بھی اپنی توپوں اور رائفلوں کے دہانے کھول دیا کرتے...... کیونکہ ان کے لاشعور میں موجود مجاہدین کا خوف انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔

یوں بھی ان لوگوں کے پاس پھونکنے کے لئے بے شمار اسلحہ موجود تھا۔

دونوں یہی سمجھتے تھے کہ جب دوسری طرف سے فائرنگ کا جواب نہیں آئے گا تو یہ بلا خود بخود ٹل جائے گی کیونکہ ان لوگوں کو اپنی غلط کا احساس ہو جائے گا۔''

لیکن...... ان کی توقعات کے بالکل برعکس فضا میں پھیلی تاریکی تیز روشنیوں سے جھلملانے لگی۔

دشمن روشنی راؤنڈ فائر کر رہا تھا......!

شاید وہ لوگ کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔

روشنیوں کے گولے ان کے سروں پر پھٹ رہے تھے اور دونوں کو اس تلخ حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ اب واپسی کا راستہ قدرے مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن ہو چکا ہے......!

وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ یہاں چھپ کر ہی کچھ وقت گزار لیں۔ فیضان کو صرف یہی احساس تھا کہ اسے اپنے دم توڑتے محسن کی خواہش بہرحال پوری کرنی ہے۔

''اگر وہ خدانخواستہ ایسا نہ کر پاتا تو پھر پچھتاوے کا بوجھ اپنے دل و دماغ پر لئے وہ اپنی اگلی زندگی کیسے بسر کرے گا۔''

اس سوچ نے اسے پریشان کر رکھا تھا......''

''چاچا!'' اچانک ہی اس نے قاسم ایشان زادے کو مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے؟''

''تم یہاں سے فوراً نکلو۔''

''کیا'' ...... بوڑھا قاسم گھبرا گیا ...... ''ہوش میں تو ہونا'' ...... اس نے بڑی شفقت سے فیضان کو ڈانٹا۔

''ہاں چاچا ...... میرے حواس بالکل بجا ہیں۔ جلد ہی روشنیوں کا یہ طوفان ہمارے سروں پر منڈلانے لگے گا ...... یہ ناممکن ہے کہ ہم کوئی گولی چلائے بغیر یہاں سے نکل سکیں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے عظیم محسن کے سامنے قیامت کے روز شرمندہ ہو جاؤں'' ......

اس کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی تھی ...... ''چاچا! وہ میرا مسیحا ہے۔ اس نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔ میری حیات میں نئے رنگ بھرے ہیں۔ آج اگر قسمت نے اس سے ملایا بھی تو کس روپ میں ......''

''بیٹا! جذباتی مت بنو ...... تربیت کے اصول کے مطابق بھی میں بوڑھا ہوں تم ابھی بچے ہو۔ ابھی تمہارے بازوؤں میں بہت سی قوت موجود ہے۔ تم نے ابھی لمبی جنگ لڑنی ہے۔ میری جان کا اتنا نقصان ہمارے مشن کو نہیں اٹھانا پڑے گا۔ جتنا تمہاری جان جانے سے ......''

''چاچا! میں نے آج تک تمہاری کوئی بات نہیں ٹالی۔ لیکن آج مجھ سے کچھ نہ کہنا۔''

فیضان کا لہجہ اتنا سخت اور کھردرا تھا کہ اگلی کوئی بات بوڑھا قاسم کہہ نہ سکا۔

''فی امان اللہ میرے بچے! میں ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ تمہاری خواہش کا احترام کر سکوں'' ......

قاسم نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اندھیرے میں رینگ گیا۔

پہاڑی کے ساتھ ساتھ چپک کر چلتا ہوا بوڑھا قاسم ایک سائے کی طرح اسے نظر آتا رہا پھر اس کا ہیولا غائب ہو گیا۔

ابھی اس نے بمشکل گردن موڑی تھی کہ اچانک ہی اس کے محض چند گز کے فاصلے پر روشنی کا ایک گولہ پھٹا اور فیضان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

سب سے پہلے اس کی نظر پندرہ بیس گز کے فاصلے پر موجود ان تین روسی فوجیوں پر پڑی ہوا پنی دانست میں بڑے چوکنے ہو کر اس طرح قدم بڑھا رہے تھے۔ اس سے پہلے ان کی نظر فیضان پر پڑتی اس نے گن سے یکے بعد دیگرے آٹھ دس شعلے اگلے اور آنے والے سپاہی صورتحال کی سنگینی کا احساس کئے بغیر ہی جہنم واصل ہو گئے۔

دم توڑتے سپاہیوں میں سے ایک کے منہ سے لگی سیٹی کی آواز نے باقی سب کو ہشیار کر دیا ...... ایسی سیٹی رات کو گشت کرنے والے سپاہی اپنے پاس رکھا کرتے تھے ...... مرتے مرتے وہ فیضان کی موت کا سامان اپنی دانست میں کر گیا تھا ......!!

سیٹی کی آواز بلند ہونے کی دیر تھی کہ اچانک اس کے گرداگرد موجود پہاڑیاں دہکتے ہوئے الاؤ میں بدلنے لگیں۔

شاید اس علاقے میں نصب سینکڑوں اقسام کی گنوں کا رخ دشمن نے اس کی طرف کر دیا تھا۔

ان لوگوں نے سیٹی بجانے والے سپاہی کی پوزیشن کے اندازے پر آگ برسانی شروع کی تھی ...... اس کے سامنے کے زمین کا ایک ایک انچ جہنم زار بن رہا تھا۔ بارش کے اولوں کی طرح گولے اور گولیاں برس رہی تھیں۔

☆☆

فیضان کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ ایک پیالہ نما گہری جگہ پر دبکا ہوا تھا اور اس کے سر پر سے گولے اور گولیاں مختلف آواز پیدا کرتے آگے پیچھے گر رہے تھے۔

جیسے ہی فائرنگ شروع ہوئی۔ روشنی راؤنڈ چلنے بند ہو گئے۔

فیضان نے ایک لمحے کیلئے کچھ سوچا پھر راستے کے محفوظ یا غیر محفوظ ہونے کو خاطر میں لائے بغیر دیوانہ وار پہاڑیوں میں بھاگتا چلا گیا۔

گولیوں کا رقص آہن و آتش اس کے نزدیک جاری رہا...... لیکن اس کا سفر نہ رکا۔

دس پندرہ منٹ وہ بھاگتا چلا گیا......

پھر پہاڑی سلسلے کے خاتمے پر رک گیا۔

اب اسے ایک قدرے ہموار اور میدانی قطعہ عبور کرنا تھا۔ ڈیڑھ سو گز کا یہ فاصلہ ہی اس کے سفر کا سب سے مشکل مرحلہ تھا......!

بھاگتے بھاگتے اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

یہاں چند منٹ کے لئے رک کر اس نے اپنے حواس قابو کیے۔ ایک بات کی گواہی تو اس کے دل نے دے دی تھی کہ یہ علاقے قاسم ایشان زادہ عبور کر چکا ہے۔ اگر وہ ابھی یہاں ہوتا تو فیضان کو اس کی موجودگی کا احساس ضرور ہو جاتا۔

اس نے رک رک کر اپنی میگزین چیک کی۔

نئی میگزین اپنی گن میں لوڈ کر کے اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتا ہوا میدانی قطعے کی طرف بڑھا۔

ابھی وہ بمشکل چند گز ہی چلنے پایا تھا جب اچانک اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اس مرتبہ اس کا واسطہ کابل سے نہیں روس کے تربیت یافتہ ”سپٹیز“ سے تھا جو اسے گھیر کر زندہ پکڑنے کا بندوست کر چکے تھے...... اپنا جال ان لوگوں نے اس میدان قطعہ اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو شاید وہ صرف ریہرسل ہی کرتے آئے تھے۔

روشنی راؤنڈ اچانک اور اتنی زیادہ تعداد میں فائر ہوئے تھے کہ فیضان چکرا کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ کی انگلی کا دباؤ گھبراہٹ میں ٹریگر پر بڑھتا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

اس بات کا احساس ہی اسے نہ ہو سکا کہ ساری میگزین خالی ہو گئی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ نئی میگزین اپنے کندھے سے لٹکتے تھیلے سے نکال کر اپنی گن میں لگاتا۔ اچانک جیسے زمین پھٹی اور اس میں پانچ چھ روسی کمانڈوز نکل کر اس پر جھپٹے۔ فیضان نے بہتیرے ہاتھ پاؤں چلائے لیکن اچانک سر کے نزدیک لگنے والی ایک زوردار ضرب نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔

❀......❀......❀

سپیٹنز

فیضان کو ہوش ایک خیمے میں آیا......!

رات کا شاید ابھی ایک پہر ہی گزرا تھا۔ خیمے میں روشنی نام کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے کسی خاص رسی کے ساتھ پیچھے کی طرف باندھے گئے تھے۔ اور وہ شاید اوندھے منہ زمین پر گرا تھا۔

ہوش میں آتے ہی اسے سب سے پہلے جو آواز سنائی دی وہ بجلی کے زوردار کڑکے کی آواز تھی۔ ان دنوں موسم ایسا ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے آسمان بادلوں سے گھر جاتا اور موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی اور یہ سلسلہ پھر صبح دیر گئے تک جاری رہتا......!

پہلا خیال فیضان کے ذہن میں یہی آیا کہ قدرت...... نے ابھی اس سے شاید اور کام لینا ہے...... اور یہ تائید غیبی ہے۔

خیمے کے اندر تو کوئی موجود نہیں تھا لیکن باہر پہرے داروں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

یہ لوگ روسی زبان میں باتیں کر رہے ہیں اور فیضان کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ روسی "سپیٹنز" کے شکنجے میں پھنس چکا ہے۔

روس کی اس خصوصی فوج کی آمد کی اطلاع مجاہدین کو مل چکی تھی بلکہ ہرات اور قندھار کے محاذ پر وہ اس فوج کی دو کمپنیوں کا صفایا بھی کر چکے تھے۔

اس علاقے میں روسی فوج نے حال ہی میں خصوصی فوج کی کمانڈ قائم کی تھی۔

جیسے ہی فیضان نے چاہا کہ وہ سیدھا ہو اچانک درد کی ایک تیز لہر نے اس کے سر کے پچھلے حصے سے سر اٹھایا اور وہ تڑپ کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی کسی کے خیمے کے اندر آتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

فیضان نے دوبارہ بیہوش ہو جانے ہی میں عافیت جانی......

اندر آنے والے روسی تھے......!

دونوں نشے میں وحشت معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر فیضان کے پہلو میں لگائی۔

ضرب بڑی جان لیوا تھی لیکن فیضان نے اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔ شاید وہ اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ ابھی ہوش میں آیا ہے یا نہیں۔

اس کی طرف سے کوئی خاص ردعمل نہ ہونے پر ٹھوکر مارنے والے نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔ پھر اس نے فیضان کو گالی دے کر اپنے ساتھی سے کہا۔

''زوردار ضرب لگ گئی ہے شاید......''

''کہیں مر تو نہیں گیا؟'' دوسرے نے جو نشے میں بدمست ہو رہا تھا لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔

''ارے یہ لوگ پہاڑوں کی طرح سخت جان ہوتے ہیں۔ اتنی جلدی مرنے والے نہیں یہ کمبخت......!

''چھوڑو پرے......مرنے دو......باہر موسم بڑا شاندار ہو رہا ہے......آؤ ایک دو پیگ اور لگالیں......تھوڑی دیر بعد وہ حرامی میجر آ جائے گا''......دوسرے نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

شاید وہ اپنے افسر کے آنے سے پہلے کوئی بوتل خالی کردینے کے چکر میں تھے۔

دوسرے نے ایک بھاری بھر کم گالی اپنے میجر کو دی اور دونوں روسی زبان کا ایک فحش سا گیت اپنی بھدی آوازوں میں گنگناتے خیمے سے باہر نکل گئے۔!!

''شپٹز'' کا خیال ذہن میں آتے ہی فیضان نے دو امکانات پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے سوچا یا تو وہ فرار ہو جائے یا پھر فرار ہونے کی کوشش میں مارا جائے۔ تیسری کوئی بھلی صورت ممکن نہیں تھی۔ ایک دفعہ اگر وہ زندہ ان لوگوں کے ہاتھ آ جاتا تو وہ اس کے جسم کا رواں رواں الگ کر دیتے۔

یہ لوگ اپنی بربریت کے لئے ساری دنیا میں مشہور تھے۔ فیضان کو علم تھا کہ جس جس افغان علاقے سے ان کا گزر ہوا وہاں انسان اور حیوان کوئی شے زندہ نہیں بچی تھی۔

محض اپنی بربریت کو تسکین دینے کے لئے یہ لوگ بستیاں جلا دیا کرتے تھے قندھار اور ہرات کے جانے کتنے دیہات ان کے بھیانک مظالم کی منہ بولتی تصویر بن کر زمین کے سینے پر نشان عبرت بنے نظر آتے تھے......!!

دونوں ''سپٹز'' کے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے جسم کو بل دے کر سیدھا کیا۔ پھر کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اپنے دونوں ہاتھ پشت کے نیچے سے گزار کر وہ سامنے لے آیا۔ اب وہ خود کو قدرے آسان پوزیشن میں محسوس کر رہا تھا۔

فرار کے خیال نے اس کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر دی تھیں۔

اگر وہ یہاں سے دو میل دور تک بھی نکل جاتا تو بحفاظت اپنے ساتھیوں میں پہنچ سکتا تھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ بڑی بے چینی سے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

ایک کونے میں دو کلاشنکوف ایک لوہے کے پلنگ پر دھری تھیں۔ شاید یہ باہر موجود گدھوں ہی کی ملکیت تھیں۔

اپنی رسیاں کاٹنے کیلئے اسے کوئی صورت دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ اب یہاں مزید ایک لمحہ ضائع کرنا بھی کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے ایک گن کو سلنگ سمیت گلے میں ہار کی طرح لٹکا لیا اور دوسری کو بندھے ہوئے ہاتھوں میں تھام لیا۔

☆☆

اپنی ایک گن وہ دشمن کے قبضے میں دے کر اس کی دو بندوقیں لے جا رہا تھا۔ اس کی غیرت یہ گوارا ہی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ پٹھان ہونے کے ناطے اپنا ہتھیار دشمن کو سونپ کر زندہ واپس چلا جائے۔

کہنیوں کے بل بندھے ہاتھوں سے رینگتے ہوئے اس نے پہرے داروں کی مخالف سمت سے خیمے کے پردے کی دیوار کو تھوڑا سا اٹھا کر باہر اندھیرے میں جھانکا...... آنکھوں پر بہت زور دینے کے باوجود اسے دور تک کسی کے ہونے کا گمان نہ گزرا۔

دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے اس نے کروٹ لی اور لڑھکتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا......!!

دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کھڑا ہوا......

اس کے ہاتھ گو کہ بندھے ہوئے تھے لیکن یہ مجبوری جیسے اس نے بالکل ہی نظر انداز کر دی تھی۔ پندرہ بیس گز دور تک وہ ماہر فوجیوں کے سے انداز میں زمین پر کہنیوں کے بل کرالنگ کرتا ہوا چلتا چلا گیا۔

پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ اس نے اسی طرح طے کیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے میدانی قطعہ ارضی سے کچھ زیادہ دور نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ لوگ شاید اس سارے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔

یوں بھی وہ رات کے اندھیرے میں کسی افغان قیدی کو اپنے پچھلے مورچوں میں لے جانے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتے۔ وہ تو دن کے اجالے میں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ایک سے دوسری جگہ آیا جایا کرتے تھے۔

چیتے کی طرح قدموں کی چاپ کو دبائے ہوئے وہ بندھے ہاتھوں کے ساتھ میدانی علاقے تک آ گیا تھا......!!

بندھے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے بالآخر اس نے یہ قطعہ ارضی بھی عبور کر لیا۔ ابھی بمشکل وہ اپنے ''مرکز'' کی طرف جانے والے راستے پر گامزن ہوا ہی تھا کہ اس کے عقب میں قیامت ٹوٹ پڑی......!

غالباً اس کے فرار کی خبر ان لوگوں کو ہو گئی تھی......!

روسی ''سپٹنز'' دیوانہ وار گولیاں چلا رہے تھے......! روشنی راؤنڈ سے انہوں نے رات کو دن کے اجالے میں تبدیل کر دیا تھا لیکن اب فیضان ان کی دسترس سے باہر نکل چکا تھا...... اسے اتنی ہی مہلت درکار تھی۔

وہ جانتا تھا کہ بوڑھے قاسم ایشان زادہ نے اگر وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے تو مجاہدین کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اور اپنے ایک ساتھی کو دشمن کے گھیرے میں دیکھ کر وہ لوگ کبھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔

بندھے ہاتھوں کو کھولنے کی کوئی صورت ابھی دکھائی نہیں دے رہی تھی......!

ان لوگوں نے نائلن کی کسی مضبوط لیکن پتلی رسی سے اس کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے باندھے تھے۔ یہ شاید وہ مخصوص رسی تھی جو کمانڈوز اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ کئی جگہ نوکدار پتھروں میں پھنسا کر اس نے جب اس رسی کو کاٹنا چاہا تو وہ فیضان کو کلائیوں سے دھنستی محسوس ہوئی۔

مسلسل بھاگنے سے اب اس کا سانس پھولنے لگا تھا......!

ہاتھ کھلے ہوتے تو اور بات تھی۔ دور ائفلوں اور بندھے ہاتھوں کے ساتھ ابھی اسے مزید کم از کم سات آٹھ میل کا پہاڑی سفر طے کرنا تھا۔

☆☆

وہ رات کے اندھیرے میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دن کے اجالے میں اس کی خیریت کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ جس قدر ممکن ہو وہ اپنے مرکز سے نزدیک ہو جائے۔ فیضان جانتا تھا "سپیٹنز" شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں آ رہے ہیں اور اجالا ہونے پر ہیلی کاپٹر بھی اس کی تلاش کی اس مہم میں شامل ہو جائیں گے لیکن کوئی نادیدہ طاقت اس بات کا احساس دلائے جا رہی تھی کہ وہ ایک مرتبہ اپنے بوڑھے محسن سے اس کی زندگی میں ملاقات ضرور کرے گا۔

گولیاں اور گولے ایک مرتبہ پھر اس کے نزدیک اور دور پھٹ رہے تھے۔

اس مرتبہ اس نے اپنی دانست میں بہت محفوظ راستہ اختیار کیا تھا۔

میر داد خان کو وائرلیس پر اگلے کسی مورچے سے فائرنگ کی خبر ملی تھی۔

چند منٹ پہلے ہی قاسم ایشان زادہ نے یہاں پہنچ کر اسے فیضان کے متعلق بتایا تھا میر داد خان نے اس فائرنگ سے یہ اندازہ لگایا کہ فیضان کم از کم دشمن کے ہاتھ نہیں لگا ورنہ وہ رات کی تاریکی میں یوں اندھا دھند اپنا اسلحہ نہ پھونکتا......!

"لیکن......"

یہ بات بھی اسے بخوبی سمجھ آ گئی تھی کہ دشمن فیضان کے تعاقب میں ہے اور اگر خدانخواستہ فیضان زندہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اسے پہچان کر اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟" اس کا تصور ہی بڑا اذیت ناک تھا......!

"اپنے دو چار ساتھیوں کے ساتھ جو یہاں موجود ہیں فائرنگ کر کے دشمن کو اپنی طرف متوجہ کرو۔ میں اس دوران نزدیکی مرکز سے مدد روانہ کرتا ہوں......خیال رہے فیضان دشمن کے گھیرے میں آ چکا ہے......اور اسے ہر حال میں بچانا ہے......خواہ اس کی کچھ قیمت بھی ادا کرنی پڑے......" اس نے او۔ پی کے فرائض انجام دینے والے کو مطلع کیا۔!

اس کے ساتھ ہی اس علاقے میں دشمن کے نزدیک موجود مجاہدین کے دوسرے گروپ کے "مرکز" سے وہ رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا......!

جلد ہی رابطہ مل گیا......!

فیضان کا نام مجاہدین کے کسی گروپ کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا......!

اطلاع کے ملتے ہی کہ فیضان "سپیٹنز" کے گھیرے میں ہے "مرکز" پر موجود مجاہدین حرکت میں آ گئے۔

بھاگتا ہوا فیضان اچانک کسی خیال کی آمد سے وہیں تھم گیا......!

اس نے فائرنگ کی آوازوں پر کان لگائے تو اپنے خون کی رفتار بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اکیلا نہیں رہا...... اس کی مدد کو تاریک اور اندھی رات کے دم توڑتے اندھیرے میں مجاہدین بھی نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ روسیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے فائرنگ کر رہے تھے...... ! واقعی دشمن کی توجہ ہٹ گئی...... !

فیضان کو تھوڑی دیر کے لئے ستانے کا موقع مل گیا۔ رائفل ابھی تک اس نے فائرنگ پوزیشن میں اپنے بندھے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ یہیں دبکا بیٹھا رہا۔ اب اس نے ہاتھوں کو آزاد کرنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔

ہاتھ اس بری طرح بندھے ہوئے تھے اب مرکز پر پہنچ کر ہی وہ اس کی گرفت سے نکل سکتے تھے...... !

تھوڑی دیر ستانے سے ہی وہ خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید بے ہوشی کی حالت میں بھی وہ لوگ اسے وحشیانہ انداز سے پیٹتے رہے تھے کیونکہ فیضان کو اپنے جسم کا بند بند دکھتا محسوس ہو رہا تھا...... جسم کے مختلف حصوں سے اٹھنے والی درد کی لہریں اس کے سر کے پچھلے حصے کا رخ کر رہی تھیں لیکن کمال ہمت سے اس نے ابھی تک خود کو سنبھال رکھا تھا۔

صبح کی پو پھٹ رہی تھی...... !

بہت دور سے اس نے پہاڑیوں میں گونجتی ''اللہ اکبر'' کی صدا سنی اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہا...... پھر اسے اونگھ سی آئی...... اس نے لاکھ کوشش کی کہ نیند کو خود پر غلبہ نہ پانے دے لیکن رات بھر کی بھاگ دوڑ کی تھکن اور اس کی جسمانی حالت نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا...... !

اور فیضان نے آنکھیں موند لیں...... !

اچانک آہٹ پر چونک کر ہی اس نے دوبارہ آنکھیں کھولی تھیں...... غیر ارادی طور اس کے بندھے ہوئے ہاتھ سب سے پہلے گود میں رکھی کلاشنکوف کی طرف جھپٹے لیکن اپنے کانوں سے ٹکرانے والی آواز پر اس کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔

''اس کی ضرورت نہیں فیضان...... اللہ نے کرم کر دیا...... تم اپنوں میں ہو''...... ! شمشیر خان کی مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

آنکھیں کھولنے پر فیضان کی نظر اپنے گرد گھیرا ڈالے چار مجاہدین پر پڑی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

شمشیر خان نے اپنی چھاگل کھول کر پانی اس کے منہ کو لگایا دوسرے مجاہد نے اپنے خنجر سے اس کے ہاتھوں کی بندھی رسی کاٹنی شروع کر دی۔

رسیوں سے نجات ملتے ہی اس نے ہاتھوں کو زور زور سے جھٹک کر دوران خون کا عمل درست کیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ اسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر ''مرکز'' کی طرف لے جا رہے تھے جہاں اس کا بوڑھا محسن خدا سے زندگی کے چند سانسوں کی مزید مہلت مانگ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اپنی تصویر کے رنگوں کا حسن اپنی آنکھوں سے دیکھ لے...... اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ فیضان ضرور واپس لوٹے گا......

''کاش میں نے اس کے ہاتھوں قاسم کو نہ بلایا ہوتا''...... اس نے اب تک کئی مرتبہ سوچا تھا۔

❁ ❁ ❁

الوداع!

قاسم اس تک پہنچ چکا تھا......!

دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے......!

دونوں ایک ہی تیر کے شکار تھے......!

دونوں کی ایک ہی کہانی تھی......!!

دونوں شاید اپنے خاندان کے واحد زندہ بچ جانے والوں میں سے تھے۔ ورنہ تو ان کے گاؤں پر حملہ ہونے کے بعد کسی کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا!

بوڑھے غلام اللہ پر رات سے اب تک بے ہوشی، مدہوشی اور بے خبری کے کئی دورے پڑ چکے تھے۔ میڈیکل کا طالب علم اور قاسم ابھی تک اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ اس نے قاسم ایشان زادہ سے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔

دونوں قریباً ایک سال بعد آپس میں ملے تھے۔ غلام اللہ خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا......بس اب ایک ہی بوجھ اس کے دل میں تھا اور وہ فیضان......!

صبح دم جب کسی مجاہد کی اذان اس کے کانوں میں پڑی تو جیسے اس کے سارے گمشدہ حواس لوٹ آئے۔

اس کے دل سے بے اختیار ایک ہی دعا نکلی۔ فیضان سے آخری ملاپ کی دعا۔ رحمت خداوندی جوش میں آئی اور فرشتہ اجل کے بڑھتے ہاتھ رک گئے۔ غلام اللہ نے انہیں سہارا دے کر بٹھانے کو کہا پھر چارپائی پر بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے نماز پڑھی۔

نماز کے اختتام پر تینوں نے مشترکہ اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے۔ جب غلام اللہ نے آخری مرتبہ آمین کہہ کر ہاتھ نیچے گرائے اور نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا تو زندگی کی نئی لہر اس کے چہرے پر رینگ گئی۔

فیضان اس کے سامنے کھڑا تھا......!

"فیضان میرے بیٹے!"

اس نے بیقرار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ فیضان بے اختیار آگے بڑھا اور اس کے سینے سے لگ گیا۔

"میرا دل کہتا تھا تم ضرور آؤ گے......خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب میں دل پر کوئی بوجھ لے کر دنیا سے نہیں جاؤں گا"......وہ رندھی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔"......"فیضان میرے بیٹے! جب روسیوں نے میرے گاؤں پر حملہ کیا تو میں اکیلا ہی اپنے گھر میں زندہ بچا تھا......"اس نے رک

کر سانس لیا۔

''میرا ایک بیٹا تھا تمہاری طرح......!! کابل جا کر وہ بھی آزاد خیال ہو گیا...... جب بھی چھٹی آتا مجھے ''انقلاب کی برکتوں'' سے آگاہ کرتا رہتا......!

میں نے اسے ایک دو مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات پر کان نہ دھرے۔ تم نوجوانوں میں یہی ایک کمی ہوتی ہے کہ تم جب تک خود ٹھوکر نہ کھالو...... دوسرے کی بات پر کان نہیں دھرتے...... جانے تم لوگ خود تجربہ کرنے پر کیوں تل جاتے ہو؟

یہ جانے بغیر کہ اس تجربے کی کتنی قیمت تمہیں ادا کرنی ہوگی۔

اپنے بزرگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا شاید تم نے سیکھا ہی نہیں۔

خیر......! میں نے جب دیکھا وہ میری بات نہیں مانتا تو چپکا ہو رہا...... میں نے سوچا! وقت اسے خود ہی حالات کی اصلیت سے آگاہی دے دے گا......!

اسکی آواز بھرا جانے سے گلا رندھ گیا تھا...... یوں محسوس پڑتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں رکے تمام آنسو اس کے حلق میں اٹکنے لگے ہیں!

''ایک مرتبہ وہ چھٹی آیا تو اس کا چہرہ جوش مسرت سے دمک رہا تھا۔ اس نے مجھے آتے ہی کہا! بابا ہماری قسمت جاگ اٹھی...... روسی دوست ہماری مدد کو آ گئے ہیں۔ افغانستان کی قسمت بدل جائے گی۔''

ہاں بیٹا! میں نے کہا۔ تم واقعی ٹھیک کہتے ہو اب افغانستان کی قسمت بدلنے والی ہے۔ ذلت اور بدبختی اب ہمارا نصیب بننے والی ہے۔

وہ روز بد جس کے نہ آنے کی دعا افغانستان کا ہر بوڑھا کر رہا تھا...... آ کر ہی رہا۔

اس روز تو میرے بیٹے نے ہمیشہ کی طرح میری بات کا مذاق اڑایا، لیکن جب تیسرے ہی روز اس کا ماموں نزدیک کی ایک ولایت سے ہمارے ہاں پہنچا اور اس نے میرے بیٹے کو بتایا کہ اس کے ''روسی دوستوں'' نے ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تو میرا نادان بیٹا خاموش ہو گیا......!!

فیضان! وہ بہت جذباتی تھا۔

ہر پٹھان کی طرح جوشیلا!...... کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنے والا!

اسی روز رات کو وہ اچانک غائب ہو گیا......! ہمارے نزدیک دور سے روسی فوجیوں کی ''دوستی کے ثبوت تو موصول ہو رہے تھے لیکن پاکستانی سرحد سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ابھی تک ہمارا علاقہ ان کی دست برد سے محفوظ رہا تھا۔

تیسرے روز اچانک میرا بیٹا لوٹ آیا......!!

جانتے ہو فیضان اس نے مجھے آتے ہی کیا کہا......!!

''کیا''......؟ فیضان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''وہ ہمیشہ انقلاب کے گن گایا کرتا تھا...... جو روسی فوجوں کی آمد کو افغانستان کی خوش بختی سے تعبیر کرتا تھا جب تین روز تک نزدیک دور کے علاقے میں کامریڈوں کی بربریت کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔

''بابا! ہمیں آج رات ہی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اپنی جان اور عزتیں بچا کر ہمسایہ اسلامی ملک میں پناہ لے رہے ہیں......!

''بابا! تم سچ کہتے تھے......!!

وہ ننھے منے بچوں کی طرح سسک پڑا۔

میں نے اسے حوصلہ دیا اور یاد دلایا کہ وہ افغان ہے۔ اسے اپنا فرض نبھانا ہوگا۔ اسے آج مجاہد بننا ہوگا۔

اپنی تھری ناٹ تھری رائفل اسے تھماتے ہوئے کہا کہ بیٹا! اس رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے فرنگیوں کو اس سرزمین پر قدم جمانے کا موقعہ نہیں دیا تھا...... میرے ہاتھ اب بوڑھے ہو رہے ہیں...... شاید اتنی تیزی سے ٹریگر پر نہ چل سکیں جتنی تیزی سے تمہارے جوان ہاتھ......! آج سے یہ امانت تمہارے حوالے کر رہا ہوں......!

''ہم لوگوں نے دوسرے روز کسی قافلے کے ساتھ یہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔

وہ میری زندگی کا خوش قسمت ترین دن تھا...... اس روز میرے بچے کی چھن جانے والی غیرت لوٹ آئی تھی......

لیکن......!!

وہ سسک پڑا۔ آنسو جو اس کے اندر جانے کب سے منجمد ہو رہے تھے۔ اس کے سینے کی تپش سے پگھل گئے۔!

اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگنے لگی تھی۔

جوان بیٹے کی یاد نے اسے رلا دیا تھا......!

''یہ خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی......'' اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''جب صبح ہم روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے تو اچانک روسی ہیلی کاپٹر وہاں آ گئے۔ انہوں نے اندھا دھند بغیر کسی وارننگ کے نہتے اور بے بس انسانوں پر آگ برسانا شروع کر دی۔

میرا بیٹا! میرے روکنے کے باوجود رائفل لے کر باہر بھاگا۔ شاید نزدیکی پہاڑی میں بیٹھ کر وہ نیچے آنے پر ہیلی کاپٹر کو تھری ناٹ تھری کی معمولی سی رائفل سے گرانا چاہتا تھا......!

''بیٹا! ابھی وہ چند گز دور تک ہی گیا تھا جب ایک ہیلی کاپٹر کی مشین گنوں سے لپکنے والی سرخ انگاروں کی زبان نے اسے چاٹ لیا۔

میں بھاگ کر اس کے نزدیک پہنچا تو میرا بیٹا!...... میرا گبھرو شہید ہو چکا تھا...... میرے پیچھے ایک دوسرے ہیلی کاپٹر نے میرے گھر پر راکٹ پھینکا اور میری بیوی اور دوسری عورتوں کو جنہوں نے یہاں پناہ لے رکھی تھی موت کی نیند سلا دیا۔

بوڑھے غلام اللہ نے بڑی جلدی اپنی حالت پر قابو پالیا۔

''میرے بیٹے! اس کے بعد جس طرح میں نے ہجرت کی وہ الگ کہانی ہے۔!

میرے مرحوم بیٹے نے ایام جہالت میں پرچم پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کی یہی پہچان میرے کام آگئی...... اپنے امیر کے حکم پر میں کابل چلا آیا اور اپنے بیٹے کی سابقہ پہچان کا حوالہ دے کر نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا!

کچھ پڑھا لکھا تھا کسی نہ کسی طرح ''خاد'' کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گیا۔

تمہارے جیسے کئی نوجوان جو اس انقلاب کی اصلیت جان کر جب اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے تو وہ ''خاد'' کے مذبح خانوں میں پہنچ جاتے تھے اور میں انہیں اپنی ادھوری تصویریں سمجھ کر ان میں رنگ بھرتا اور ہوشیاری سے انہیں دشمن کے چنگل سے نکالتا رہا......!

اچانک اس پر کھانسی کا دورہ پڑا...... بوڑھا غلام اللہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہوگیا۔

اس کی حالت دیکھ کر فیضان گھبرا گیا اور تیزی سے ڈاکٹر کو بلانے باہر لپکا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟''...... سامنے سے قاسم ایشان زادہ ایک ہاتھ میں قہوے کی کیتلی اور دوسرے ہاتھ میں پیالیاں پکڑے ان کی طرف ہی آرہا تھا......!

''چاچا! ان کی حالت بگڑ گئی ہے...... تم اندر چلو...... میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔''

ڈاکٹر کو لے کر جب فیضان اندر پہنچا تو قاسم ایشان زادہ اپنے بچپن کے دوست غلام اللہ پر جھکا ہوا تھا......

دونوں کو اندر آتے دیکھ غلام اللہ نے آنکھیں کھولیں۔

ایک نظر اس نے فیضان پر ڈالی اور اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔

''میرے بچے! میرا کام ختم ہوگیا...... اللہ نے شاید مجھے آخری مرتبہ تم لوگوں سے ملانا تھا۔ میں مطمئن اس کی عدالت میں جارہا ہوں......!''

''میرے بچے! اپنا فرض کبھی نہ بھولنا......!!''

''الوداع! اللہ تمہاری حامی و ناصر......''

اس نے آنکھیں موندلیں......

☆☆

ڈاکٹر نے بے بسی جھپ کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا......!!

اس کے پاس شاید کوئی ایسی دوائی نہیں تھی جو اس حالت کے مریضوں کی زندگی چند منٹ ہی کے لئے بڑھا سکتی......!

فیضان اس کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گیا......!

اس کے کانوں میں غلام اللہ کے آہستہ آہستہ قرآنی آیات بڑبڑانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر بڑبڑاہٹ بھی ڈوبنے لگی......!

قاسم ایشان زادہ نے اس کے سرہانے سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کردی تھی۔

آخری رکوع ختم ہونے پر جب اس نے اپنے دوست کی نبض تھامی تو زندگی کی نبضیں ساکت ہو چکی تھیں۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' اس کے منہ سے نکلا۔

یہی آیات فیضان اور ڈاکٹر نے دہرائیں۔

''بخدا تو سرخرو ہو کر اللہ کی عدالت میں جا رہا ہے۔'' قاسم ایشان زادہ نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

فیضان نے اپنے آنسو روکنے کی ہزار کوشش کی تھی لیکن ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے۔

اس نے سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے اپنے کندھے سے چادر اتار کر غلام اللہ پر ڈالی پھر اس کے سرہانے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اللہ کے غلام نے انسانی غلامی کی لعنت کا طوق گلے سے اتار کر پوری کائنات کے آقا کی آغوش میں پناہ لے لی تھی۔

☆☆

یاسمین اچانک ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا یوں جیسے کسی نے اسے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر جگایا ہو۔ اس نے گھبراہٹ ہی میں ٹیبل لیمپ کا بلب روشن کیا تھا۔ واقعی وہاں کوئی موجود تھا، لیکن آنے والے کا منہ کپڑے میں لپٹا ہوا دیکھنے کے باوجود اس نے سکھ کا سانس لیا وہ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا سوائے فیضان کے۔

''آپ کب آئے؟''......!

اس کو بیدار ہوتے دیکھ کر نقاب پوش نے نقاب گرا دیا تھا۔

''ابھی آیا ہوں۔ خدا خیر کرے آج اس علاقے میں فوج اور سیکورٹی کچھ زیادہ ہی نظر آ رہی ہے......!

چچا ارخان تو آگئے ہیں نا......!''

اس نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

''آج کل وہ رات کو کم ہی گھر آتے ہیں۔ آج بھی شاید نہیں آئے'' ...... یاسمین بولی۔

یہ فیضان کی اس سے پہلی ملاقات نہیں تھی۔ وہ جب بھی کابل آتا یاسمین سے ضرور مل کر جاتا۔ اگر کبھی دس پندرہ دن تک اسے آنے کا موقع نہ ملتا تو کسی ذریعے سے پیغام بھیج کر اپنی خیریت سے ان لوگوں کو مطلع کر دیا کرتا۔

ارخان کا تعارف اس نے میرداد خان سے کروادیا تھا۔ جگرون ارخان اب مجاہدین کا قابل اعتماد نمائندہ تھا۔ اس کی رسائی اکثر ان مقامات تک بھی ہو جاتی تھی جہاں احمد ترسون کی رسائی ممکن نہیں تھی۔

جگرون ارخان کی مجاہدین میں آمد تائید غیبی سے کم نہیں تھی۔ انہیں ''خاد'' کے ہیڈ کوارٹر میں طے پانے والی کسی بھی کاروائی کی خبر بہت پہلے

مل جایا کرتی تھی۔ جگرون ارخان کی مدد سے مجاہدین نے کئی آپریشن ترتیب دیے اور کامیابی سے انہیں انجام تک پہنچایا۔

☆☆

''خاد'' کا آپریشنل چیف کرنل شولوخوف چکرا کر رہ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے؟ کدھر جائے؟ اس کا ہر منصوبہ روبہ عمل آنے سے پہلے اپنے بھیانک انجام کو پہنچ جاتا تھا۔ مجاہدین پغمان پر قریباً ہر رات حملہ کرتے تھے۔ اب تو ان کے حملے کابل ایئر پورٹ پر بھی ہونے لگے تھے۔ اس بات کا تو شولوخوف کو یقین ہو چکا تھا کہ ضرور کوئی مجاہدین کا جاسوس ان میں موجود ہے لیکن وہ کون ہے یہی جاننے کے لئے اس نے باری باری سب کو چیک کیا تھا۔

اور آج...... جگرون ارخان کی باری تھی۔

کرنل شولوخوف نے دانستہ ایک کارروائی اس کی موجودگی میں ترتیب دی جس کی رو سے ایمونیشن سے بھرے ایک ٹرک کو رات کے اندھیرے میں کابل کے ایک پہاڑی مقام تک لے جانا تھا۔

وہی ہوا اور کرنل شولوخوف کی توقع کے مطابق، ایک مخصوص مقام پر جہاں ٹرک نے موڑ کاٹنا تھا مجاہدین نے رکاوٹ کھڑی کر کے اسے روک لیا۔ اب یہ الگ بات کہ ٹرک میں دو افغان سپاہی اور ایمونیشن کے خالی ڈبوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ چال شولوخوف نے ان لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے چلی تھی جس میں وہ بہر حال کامیاب رہا۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ یہ کام جگرون ارخان ہی کا ہے...... لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس روز جگرون ارخان حسب معمول حالات سے بے خبر کابل کے ایک پرانے قہوہ خانے کی طرف چلا جا رہا تھا...... یہ بات اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ وہ ''زیر نگرانی ہے''!

اس کی نگرانی کے لئے کرنل شولوخوف نے خاص طور سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا تھا جن کی وفاداریاں وہ ایک مدت سے آزما رہا تھا۔ ان لوگوں کا تعلق براہ راست کے جی بی سے تھا اور کابل میں یہ کے جی بی کے لئے خدمات انجام دے رہے تھے۔

روسی انٹیلی جنس نے اپنا جال بڑی مضبوطی سے بنا ہوا تھا گو کہ افغانستان کی اپنی خدمت اطلاعات دولتی (خاد) بھی انہی کی بنائی اور سنواری ہوئی تھی اس کے باوجود انہوں نے کے جی بی کا جال بھی سارے افغانستان پر پھیلا رکھا تھا۔

''کے جی بی'' کے یہ ایجنٹ ''خاد'' کی نظروں سے بھی پوشیدہ رکھے جاتے تھے۔ لاشعوری طور پر روسی اس بات کو کبھی کے تسلیم کر چکے تھے کہ کبھی نہ کبھی افغانوں کی ملی غیرت ضرور جاگے گی اور جو مٹھی بھر لوگ بظاہر ان کے ساتھ دے رہے ہیں وہ کسی بھی لمحے ان کے لئے بالکل اجنبی بن کر رہ جائیں گے...... تب پھر ان کے یہی مقامی ایجنٹ ہی تھے جن کے ذریعے وہ دوبارہ اس سرزمین پر سازش کی کوئی نئی سکیم تیار کر سکتے تھے۔

یوں بھی ان ایجنٹوں سے وہ لوگ ''آف دی ریکارڈ'' کام کرواتے رہتے تھے۔ ان کے ذریعے ہی وہ کابل کے اعلیٰ حکام پر نظر رکھتے تھے اور ان کے خیالات اور جذبات کے پل پل کی اطلاعات جمع رکھتے۔

آج میجر ارخان کی نگرانی بھی ایسے ہی کے جی بی کے دو زرخرید غلام کر رہے تھے......!!

اس مخصوص قہوہ خانے میں پہنچ کر ارخان نے ایک کرسی سنبھال لی۔ قہوہ خانہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں موجود گاہکوں اور ریڈیو سے نشر ہونے والی اونچی آوازوں کے درمیان کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

مجاہدین ارخان سے ملاپ کے لئے عموماً ایسی جگہوں کا انتخاب کیا کرتے تھے۔

آج بھی جیسے ہی قہوے خانے میں داخل ہوا...... اس کے استقبال کے لئے پہلے ہی سے موجود ایک مقامی افغان کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں...... قہوے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر اس نے...... ارخان کے بیٹھنے کا انتظار کیا اور اس کے بیٹھنے کے دو تین منٹ بعد ہی اسکے پاس پہنچ گیا۔

ارخان اس سے اٹھ کر یوں بغلگیر ہوا تھا جیسے وہ اس کا کوئی دیرینہ آشنا ہو۔ اس بات کا دونوں ہی کو احساس نہ ہوسکا کہ میجر ارخان کے تعاقب میں یکے بعد دیگرے آنے والے دو اور افغانوں کی پر تجسس نظریں ان کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

جب دونوں آپس کی گفتگو سے فارغ ہو کر باہر نکل رہے تھے تو دونوں کے تعاقب میں پھر ایک ایک کے جی بی کا ایجنٹ لگ چکا تھا۔

اس کے بعد سے اس نے اپنے خصوصی اور انتہائی قابل اعتماد آدمیوں کے ذریعے ارخان کی نگرانی شروع کروا دی تھی۔

جس روز دوبارہ اس کے آدمیوں نے ارخان کی خفیہ نگرانی اور پراسرار آدمیوں سے ملاقات کی ''رپورٹ'' پیش کی تو کرنل شولوخوف کی آنکھوں میں گویا خون ہی اتر آیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ایک خصوصی دستے کو اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

میجر ارخان کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ وہ معاملات کی سنگینی کا احساس نہ کر پاتا۔ اس نے سرِشام ہی جب ایک ضابطہ کو زیر کمان چار سپاہیوں کو اپنے بلاک کی طرف آتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ چھٹی حس کسی پیش آمدہ خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی اور آج تک اسے چھٹی حس نے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے اس نے کچھ سوچا پھر گھر کا نمبر گھما دیا، لیکن دوسری طرف تو صبح ہی سے لائن کٹ چکی تھی۔ اس نے جیسے ہی ٹیلی فون نیچے رکھا۔ اسی لمحے انٹر کام کی گھنٹی بجنے لگی۔ اپنی اندرونی حالت پر قابو پا کر اس نے دھڑکتے دل سے انٹر کام اٹھایا اور دوسری طرف سے بلاک پر متعین گارڈ کا انچارج اس سے مخاطب تھا۔

''آپ کو آپریشنل چیف نے یاد فرمایا ہے۔'' اس نے سلام کے بعد مختصر سا پیغام دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں''

اس نے مختصر سا جواب دے کر فون رکھ دیا۔ اس کے پاس کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لئے صرف چند سیکنڈ تھے۔ ایک لمحے کے لئے جگرون ارخان نے کچھ سوچا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔

☆☆

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بزدلوں کی طرح سسک سسک کر جینے کی بجائے غیرت مندوں کی طرح ایک ہی مرتبہ موت کو گلے لگا لے گا۔ کمرے کے ایک کونے میں کارنس پر دھری اپنی کلاشنکوف اٹھاتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے اس کا دھیان یاسمین کی طرف ضرور گیا تھا، لیکن

جیسے...... کسی غیر مرئی قوت نے اسے اچانک ہی احساس دلایا کہ فیضان کے ہوتے ہوئے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے وہ سچے دل سے اپنے گناہوں کی معافی اللہ سے مانگ رہا تھا۔ بلاک کے دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے جگرون ارخان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہلکا پھلکا ہو کر ہوا میں اڑنے لگا ہو۔

اس کے دل کا سارا بوجھ اتر چکا تھا......!!!

گن اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور یہ بلاک کے دروازے پر متعین گارڈ کے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ جس خصوصی چھاپہ مار اینٹی مجاہدین گروپ سے میجر ارخان کا تعلق تھا اس کے ممبران ہر وقت ''سٹینڈ ٹو'' رہتے تھے۔ خصوصاً اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوتے وقت وہ مسلح ہو کر جاتے تھے۔ یہ الگ بات کے دروازے پر ہی ان کے ہتھیار رکھ لیے جاتے......!

ضابط اور اس کے ساتھی بظاہر میجر ارخان کے احترام میں مستعد ہو گئے۔ انہیں خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ کرنل شولوخوف کے کمرے کے دروازے پر پہنچنے تک ارخان کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ یہ احتیاط مقامی ملازمین کی ممکنہ انگیخت کے پیش نظر اختیار کی گئی تھی۔ کمرے کے دروازے تک وہ لوگ اس کے آگے آگے چلتے ہوئے آئے تھے۔ دروازے سے چند قدم دور ہی رک کر اس کی طرف واپس مڑے۔

لیکن...... یہ کیا؟ زمین نے جیسے ان کے قدم جکڑ لیے ہوں۔

جگرون ارخان کی سٹین گن ان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ دروازے پر متعین روسی سپاہی ابھی اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا......!

''اپنے ہتھیار پھینک کر فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کسی مسلمان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں۔''

ارخان کے لہجے میں جھلکتی سچائی اور آنکھوں سے ٹپکتی وحشت نے ان لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ یہ شخص سچ بول رہا ہے۔ صرف دھمکی ہی نہیں دے رہا۔

محض چند سیکنڈ میں وہاں تین کلاشنکوف رائفلیں پڑی تھیں اور حسب حکم وہ لوگ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہے تھے۔ عین ان لمحات میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈیوٹی پر متعین روسی سپاہی اندر سے برآمد ہوا۔ آج یہاں ''ضابط'' کے فرائض وہی سر انجام دے رہے تھا۔ اور شاید کسی کام سے اندر گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ باہر کی صورت حال اس کی سمجھ میں آتی۔ میجر ارخان کی سٹین گن نے آگ اگلنا شروع کر دی۔ وہ فضا میں اڑتے پرندے کا نشانہ لے کر گرا لیا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کے تعاقب میں تین گولیاں محض ایک ایک انچ کے فاصلے پر ''روسی ضابط'' کے سینے میں سوراخ کر گئیں۔ خون فوارے کی طرح ابل رہا تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔

کمرے کے اندر موجود کرنل میخائل شولوخوف کو باہر کے حالات کا علم ہونے سے پہلے دروازہ جگرون ارخان کی زوردار ٹھوکر سے کھل گیا۔ شولوخوف نے اپنی دانست میں ریوالور اپنے ہولسٹر سے نکالنے میں بہت پھرتی دکھادی لیکن اجل سے زیادہ عجلت نہ دکھا سکا اور ارخان کی گن سے لپکتی لمبی سرخ زبان نے اسے چاٹ لیا۔

ارخان بڑی پھرتی سے باہر کو لپکا۔ دروازے سے باہر تین روسی سپاہی کلاشنکوف گنیں چھتیائے تیزی سے اس کی طرف آ رہے تھے۔

تینوں سپاہیوں اور ارخان کی انگلیاں اکٹھی ہی ٹریگروں پر دبی تھیں۔ جگون ارخان کو ان کا انجام دیکھنے کی مہلت نصیب نہ ہوگی۔ بس گرتے گرتے اس نے آخری منظر یہی دیکھا کہ تینوں سپاہی ڈگمگا رہے تھے۔

قریبی بیرک میں فائرنگ کی آواز سن کر تیزی سے بھاگ کر باہر آنے والے افغانی سپاہیوں نے جگون ارخان کو سیدھا کیا جو پہلو کے بل گرا ہوا تھا۔ ارخان آہستہ آہستہ کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ اسکی آنکھیں دور کہیں فضا میں ٹک گئی تھیں اور ہونٹوں سے ایک ابدی مسکراہٹ چپک گئی تھی۔

پھر اس کی بڑبڑاہٹ بھی بند ہوگئی۔!

''انا للہ وانا الیہ راجعون!''...... بوڑھے فوجی نے اپنے گرد دائرے بنائے جوانوں پر نظر دوڑائی اور اٹھ کر کھڑا ہونے سے پہلے اپنے لرزتے ہاتھوں کی انگلیوں سے جگون ارخان کی کھلی آنکھیں بند کر دیں۔

نزدیک ہی تینوں روسی سپاہی ایڑیاں رگڑ رہے تھے، لیکن ان میں سے کسی نے اس طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور دلوں میں نفرت کے الاؤ دہک رہے تھے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان سب پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ تمام معاملہ ان کی سمجھ میں آ چکا تھا۔

وہاں موجود تمام سپاہی ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے ہچکچا رہے تھے۔ ڈائریکٹر اسفندیار کو دو مسلح ضابطوں کے ساتھ اس طرف آتے دیکھ کر وہ لوگ بوجھل قدموں سے اپنی بیرک کی طرف چل دیئے۔

اسفندیار نے زمین پر بیٹھ کر جھکتے ہوئے ایک نظر جگون ارخان کے شہید وجود پر ڈالی۔

''میرے خدایا......'' اس کے دل سے آہ نکلی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک نظر اس نے سامنے کے کھلے دروازے پر ڈالی پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ کرنل شولوخوف کی لاش پر ایک نظر پڑتے ہی اس نے ایسے لمبی سانس بھری جیسے کسی بہت بڑے بوجھ سے چھٹکارا پا گیا ہو۔ وہ شولوخوف کی لاش کے بہت نزدیک آ کر اکڑوں بیٹھ کر اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جیسے اس کی موت کا یقین کر لینا چاہتا ہو۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تو بوجھل قدموں سے لیکن قدرے مطمئن باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔

اسے اس حادثے سے اگر کوئی معمولی سا بھی دکھ ہوا تھا تو وہ ارخان کی موت کا دکھ تھا۔ وہ کم از کم اس بات پر خدا کا شکر گزار تھا کہ جگون ارخان حرام موت نہیں مرا اور جاتے جاتے ایک بڑے موذی کا صفایا بھی کر گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آنے والا اس سے بھی کوئی سخت گیر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس عہدے پر بہرحال کسی ''روسی مشاور'' ہی نے فائز ہونا تھا۔

کچھ بھی تھا فی الوقت تو ڈائریکٹر اسفندیار نے سکھ کا سانس لیا......!

❁......❁......❁

نئی منزلوں کے مسافر

رات کے اس پہر یاسمین کی خواب گاہ کے دروازے پر ہونے والی دستک نے ان دونوں ہی کو پریشان کر دیا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے جب اچانک ایک قدرے شریفانہ دستک انہیں چونکا گئی۔

''کون ہو سکتا ہے؟''...... فیضان نے سوچا۔

وہ اپنی یہاں موجودگی کی اطلاع ''مرکز'' کو ضرور دیا کرتا تھا۔ کہیں اچانک اس کی طلبی نہ آ گئی ہو یا پھر دشمن کو اس کی موجودگی کا یہاں علم ہو چکا ہے؟

کچھ بھی تھا اسے چند سیکنڈ کے اندر ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

یاسمین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ خوف سے یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے چہرے سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ سفید کپڑے کی طرح دھلا ہوا چہرہ لے کر وہ کسی لاشعوری عمل کی تابع اٹھ کھڑی ہوئی فیضان نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے سے ملحق دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے یاسمین کو اشارے سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ فیضان نے اپنی رائفل بالکل پوزیشن میں کی ہوئی تھی اور دروازہ کھول کر اندر آنے والے کی اس پر نظر پڑنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ یاسمین اس کا مطلب تو سمجھ گئی تھی لیکن اس کے جسم نے کوئی حرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ڈگمگاتے قدموں پر چلتی وہ دروازے تک گئی۔ اس دوران دو مرتبہ مزید دستک ہو چکی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

نو وارد نے اپنا منہ کپڑے میں ڈھانپ رکھا تھا......

''گھبرانا نہیں بیٹی میں دوست ہوں۔''

اس نے اندر داخل ہوتے ہی پہلا فقرہ بڑی تیزی سے محض اس لئے ادا کر دیا تھا کہ یاسمین سنبھل جائے۔

فیضان نے کپڑے میں منہ چھپائے ہونے کے باوجود پہچان لیا تھا کہ یہ قاسم ایشان زادہ ہے۔ اور اس کی اچانک آمد...... خدا خیر کرے۔

وہ دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

''خیریت!''......

''اللہ ہم سب پر خیر کرے۔''

ایشان زادہ نے ایک گہری سانس لے کر منہ کے گرد لپٹا کپڑا اتار دیا۔ وہ اب یاسمن سے مخاطب تھا۔

''بیٹی! موت تو برحق ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اچھی موت مرتے ہیں۔ میں تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لایا، لیکن ایک مسلمان افغان زادی ہونے کے ناطے یہ خبر تمہارے لئے بری بھی نہیں...... ہمیں ابھی اطلاع ملی ہے کہ تمہارے والد ارخان نے روسی کرنل کو مار ڈالا اور خود شہید ہو گئے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ چند ثانیے کے لئے خاموش ہو گیا۔

یاسمین کو یوں محسوس ہوا جیسے اچانک کسی نے بڑا زوردار گھونسہ اس کے دل پر مار دیا ہو۔ اسے اپنے قدموں پر کھڑے رہنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ سسکیاں بھرتی وہ اپنے پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ فیضان مرد تھا لیکن اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا اس کے لئے بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ضبط کے باوجود...... بھیگ چلی تھیں۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون''...... وہ بڑبڑایا۔

قاسم ایشان زادہ نے آگے بڑھ کر سسکیاں بھرتی یاسمین کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے چپ کرانے لگا۔

''بیٹی! میں بڑی افراتفری میں اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ بڑا خطرہ مول لے کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ ہمارے پاس بہت مختصر وقت ہے کسی بھی لمحے یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے۔ تم جلدی تیار ہو جاؤ۔ ہم یہاں سے فوراً چلنے والے ہیں۔''

غمزدہ یاسمین کو بہر حال وقت کی نزاکت کا احساس تھا۔ اس نے خود پر قابو پانے میں حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ بڑی ہمت سے اس نے اپنی شال سے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ صاف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ہم دروازے پر تمہارے منتظر ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو تیار ہو کر آ جاؤ۔ زیادہ سامان اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک اٹیچی کیس لے آنا۔ جلدی کرو......''

کہتا ہوا قاسم ایشان زادہ باہر نکل گیا۔

فیضان کو اس کے دکھ کا احساس ضرور تھا، لیکن اسے تسلی دینے کیلئے اسے کوئی مناسب الفاظ بھی نہیں مل رہے تھے۔ بالآخر وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''یاسمین مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے لیکن تم خود کو اکیلی نہ سمجھنا۔ ہمارے پاس وقت کم ہے جلدی تیار ہو جاؤ۔''

یہ کہہ کر وہ بھی کمرے سے باہر آ گیا۔ مرد ہونے کے باوجود وہ یاسمین سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں پا رہا تھا۔

یاسمین نے بڑی افراتفری میں بہت دکھی دل سے اپنی ماں کے زیورات اور چند جوڑے کپڑوں کے اپنے اٹیچی کیس میں رکھے۔ اپنے کمرے کے ایک کونے پر رکھی ماں باپ کے ساتھ اپنی تصویر کو ایک لمحے کے لئے اس نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دل خون کے آنسو رو دیا۔

تصویر اس نے بڑے احترام سے اپنی اٹیچی کیس میں رکھ لی تھی اور باہر آ گئی۔

فیضان نے اٹیچی پکڑ لیا۔

''ہم تیار ہیں۔''

اندھیرے میں اپنی طرف بڑھتے سایوں کو دیکھ کر فیضان نے سرگوشی کی۔

''آؤ.....'' ایشان زادہ کا ہمراہی پکارا۔

دونوں آگے بڑھ آئے۔

''ایک منٹ میں اپنا کام مکمل کرلوں۔''

قاسم ایشان زادہ کی آواز سنائی دی۔

سب وہیں رک گئے۔ ایک چرمی تھیلا اٹھائے قاسم ایشان زادہ ان کے قریب سے گزر کر آگے نکل گیا..... فیضان سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے۔ اس تھیلے میں یقیناً طاقتو ٹائم بم رکھے ہوں گے۔ ایشان زادہ اپنا کام بمشکل دو تین منٹ میں مکمل کر کے واپس آ گیا۔

کابل کی اس ماڈرن آبادی سے چار سائے ایک دوسرے کے تعاقب میں باہر نکلے اور اندھیرے کی چادر نے جلدی ہی انہیں نگل لیا۔ چاروں نے راتوں رات پیدل قریباً پندرہ بیس میل کا سفر طے کیا تھا۔ اس دوران متعدد مرتبہ انہیں کرفیو کے اوقات میں گشت کرتی افغان فوج کی جیپوں کی روشنیوں سے خود کو چھپانا پڑا۔

☆☆

کابل شہر میں زیادہ تر گشت رات کے اوقات میں روسی فوج ہی کا ہوتا تھا۔ صبح البتہ وہ چھاؤنیوں میں واپس چلی جاتی تھے۔ یاسمین کے لئے یہ سفر بڑا دشوار اور جان لیوا تھا، لیکن حالات اور وقت کی نزاکت کا احساس اس سے زیادہ اور کس کو ہوسکتا تھا وہ جانتی تھی ایک مرتبہ بھی اگر خدانخواستہ وہ ان انسانی درندوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو اس کے جسم کی بوٹی بوٹی وہ لوگ نوچ ڈالیں گے.....

صبح کاذب کا اجالا پھیلنے تک وہ لوگ اپنے ایک محفوظ ٹھکانے تک پہنچ چکے تھے۔ فجر کے بعد اس کے والد کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور شام کے بعد دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا اور رات کے اندھیرے میں ایک مرتبہ پھر وہ دونوں دو اور مجاہدین کی ہمراہی میں اگلے ٹھکانے کی طرف چل دیئے۔

اس مرتبہ ان کی منزل پاکستان کا ایک مہاجر کیمپ تھی۔ جہاں فیضان نے یاسمین کو پہنچانا تھا۔ اسے زبردستی ایک ہفتے کی رخصت پر بھیجا گیا تھا۔ جس کے بعد اسے واپس آ جانا تھا۔

دوسری طرف ان لوگوں کی روانگی کے بمشکل پندرہ منٹ بعد ہی دو تین فوجی ٹرکوں نے کابل کی ماڈرن آبادی کے اس بنگلے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ اپنی دانست میں ان لوگوں نے بہت پھرتی دکھائی ہوگی، لیکن اب موت اور تباہی کے سوا ان کے لئے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ موت جو آدھ گھنٹے سے منہ پھاڑے انہیں نگلنے کی منتظر تھی مقررہ وقت پر پھٹ پڑی۔

بنگلہ اپنی تلاشی لینے والوں سمیت خاک کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اتنے زوردار دھماکے ہوئے تھے کہ دور دور تک کئی خوبصورت بنگلوں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔

☆☆

روسی جارحیت دم توڑنے لگی تھی۔

روسی سپاہیوں کی لاشوں نے روس کا معاشرتی ڈھانچہ تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور معیشت کا جنازہ بے پناہ فوجی اخراجات نے نکال دیا تھا۔

1986ء میں صورتحال ایسی تھی کہ روسی صدر گورباچوف کو مجبوراً کہنا پڑا کہ افغانستان رستا ہوا زخم ہے اس بیان نے سفارتی محاذ پر ایک نئے کھیل کا آغاز کر دیا۔

امریکی روس کو پھنسا کر اپنا الو سیدھا کرانے کے چکر میں تھے جبکہ جنرل اختر عبدالرحمٰن روسی ہزیمت کو مجاہدین کی سیاسی فتح میں تبدیل کرنا چاہتا تھا...... اس کے لئے جنرل اختر نے لانگ ٹرم پلاننگ کی تھی۔

امریکن سٹنگر میزائل میدان میں لے آئے تھے...... روس کی فضائی برتری بھی ختم ہو چکی تھی اور امریکن جاننے لگے تھے کہ اب کسی بھی لمحے روس کابل سے دم دبا کر بھاگے گا۔

لیکن اس کے بعد؟......

یہ سوال ان کے لئے بڑا ہی پریشان کن تھا۔ جنرل اختر نے مجاہدین کا سات جماعتی اتحاد بنا دیا تھا تاکہ وہ روس کے افغانستان سے نکلتے ہی کابل میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کر لیں جبکہ امریکی ایسا نہیں چاہتے تھے......

مجاہدین کی بنیاد پرست حکومت امریکیوں کے لئے ناقابل برداشت تھی......

وہ چوں چوں کا مربہ بنا کر یہاں مستقل بدامنی کے خواہاں تھے اب تک جنرل اختر ان کے راستے کی بڑی مضبوط دیوار بنا ہوا تھا......

جنرل اختر نے آج تک مجاہدین کا براہ راست رابطہ ان سے ممکن نہیں ہونے دیا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ روس کی پسپائی کا کریڈٹ امریکہ کے بجائے، سی آئی اے کے بجائے، مجاہدین، پاکستان اور آئی ایس آئی کو ملے......

امریکیوں کے لئے اب اس کا وجود ناقابل برداشت تھا کیونکہ امریکہ کا دورہ کرنے والے افغان وفد میں شامل سب سے زیادہ قابل ذکر افغان لیڈر گلبدین حکمت یار نے صدر ریگن سے شدید دباؤ کے باوجود ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس ملاقات کے ذریعے امریکن دنیا کو یہ تاثر دلانا چاہتے تھے کہ افغانوں نے روس کی پسپائی کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا ہے جبکہ غیور افغانوں کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا۔

عین ان لمحات میں جب افغانوں کی بے پناہ قربانیوں اور آئی ایس آئی کی ناقابل یقین کارکردگی نے روس کے گھٹنے زمین سے لگا دیے تھے۔ امریکیوں نے اپنے دیرینہ حلیف جنرل ضیاء الحق کو جنرل اختر عبدالرحمٰن کی آئی ایس آئی سے رخصتی پر مائل کر لیا۔

اور......جنرل اختر عبدالرحمٰن کو آئی ایس آئی سے الگ کر دیا گیا۔

سب کئے کرائے پر پانی پھر گیا ان کے بعد آنے والوں نے جنرل ضیاء الحق کی امریکہ نواز پالیسیوں کو آگے بڑھایا۔

سی آئی اے نے براہ راست مجاہدین سے رابطہ کر کے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانا شروع کیا اور دنیا نے عجیب منظر دیکھا کہ سپر پاور کو ناکوں چنے چبانے والے مجاہدین روس کی پسپائی کے بعد پاکستانی جرنیلوں کی معاونت کے باوجود جلال آباد پر قبضہ نہ کر سکے۔

جلال آباد پر قبضہ کے لئے روز نئی تاریخوں کے اعلانات ہوتے رہے لیکن بالآخر وہی ہوا جو اسلام دشمن قوتوں کا منشا تھا۔

جلال آباد اور کابل تسخیر ہوئے تو جوتوں میں دال بٹنے لگی......

نیا تماشا شروع ہو گیا۔

بد اعتمادیوں نے جنم لیا، ایک دوسرے سے شکایات پیدا ہونے لگیں ایک کے بعد دوسرا فار مولا بننے اور بگڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے، جہاد نے فساد کی صورت اختیار کر لی۔

پاکستانی عوام کہ قربانیاں دیتے دیتے جن کی کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ دہشت گردی ہیروئن اور کلاشنکوف نے جن کا کلچر ہی تبدیل کر کے رکھ دیا تھا بے بسی سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر روس کی سپر پاور کا بھرم توڑنے والے مجاہدین کیمپوں کے خیموں میں اپنی بدبختی کا ماتم کر رہے تھے......

جنرل اختر عبدالرحمٰن بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا......

عالمی شاطر شطرنج کی نئی بازی بچھا رہے تھے۔ نئے مہرے آگے بڑھائے جا رہے تھے۔ نیا کھیل شروع ہو گیا تھا۔

روسی افواج کو بالآخر پسپائی کا محفوظ راستہ مل چکا تھا۔

گروزنی کے جانباز

چار سال بعد ایک روز پاکستان کے ایک سرحدی مقام پر بنے مہاجرین کے کیمپ میں خیموں کی ایک لمبی قطار کے سرے پر بنے ایک خیمے کے باہر ایک بوڑھی عورت اپنی بہو کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ڈھائی سالہ ایک بچہ اپنی دادی سے بار بار لپٹ کر لاڈ کرتا اور پھر واپس ماں کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا۔

''کچھ کرنے بھی دو گے ماں کو یا نہیں۔''

بوڑھی دادی نے اسے محبت سے ڈانٹا۔

بچے نے ایک لمحے کے لئے غصے سے دادی کی طرف دیکھا اور پرے ہٹ گیا۔

''بالکل فیضان پر گیا ہے وہ بھی ایسا ہی تھا۔''

اس نے اپنی بہو یا سمین کو مخاطب کیا جو اون کی شال بن رہی اور سوچ رہی تھی کہ آج ہی کا دن فیضان کی واپسی کا دن ہے۔

وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔

کابل کی ماڈرن آبادی کی رہنے والی اور روسی یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ یاسمین آج پاکستان کے ایک سرحدی شہر کے کیمپ میں کینوس کے خیمے میں زندگی گھسیٹ رہی تھی۔

اس کا خاوند اپنی مرکزی قیادت سے ملاقات کرنے پشاور جاتا اور دو تین روز بعد جب واپس لوٹتا تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

ہر نیا دن ان کے لئے نئی بدصورتی لے کر طلوع ہو رہا تھا......

''سی آئی اے'' اپنے محدود مقاصد حاصل کرنے کے بعد الگ ہو گئی تھی......

روس کی شکست و ریخت جاری تھی اور یہی امریکی چاہتے تھے۔ اب وہ افغانوں کو ایک متحد قوت کیوں بننے دیتے۔

جس روز یاسمین کو فیضان کے ذریعے ''حزب اسلامی'' اور جمعیت اسلامی کے درمیان باقاعدہ جنگ کی اطلاع ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی......

فیضان اوغلو کی حالت میں کچھ الگ نہیں تھی...... اور شمشیر خان......

خاموش شمشیر خان تو اس کے لئے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ وہ پہروں خاموش بیٹھا ان کا منہ دیکھتا رہتا۔

اسے تو امید تھی افغانستان کو روس کے پنجہ استبداد سے رہائی دلانے کے بعد مجاہدین دریائے آمو کے پار ان محکوم مسلمان ریاستوں کی مدد کو

پہنچیں گے جن کی آنکھیں ان کے انتظار میں پکنے لگی تھیں۔ جن کے دعاؤں کو پھیلے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔

یہ مجاہدان کی امید تھے......

لیکن......

یہ تو آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے تھے۔

دس لاکھ شہداء اور 45 لاکھ مہاجروں کو پاکستانی سرحدوں میں دھکیل کر امریکہ بہادر نے اپنا مشن مکمل کر لیا تھا......

پاکستانی ایوان اقتدار میں عہدوں اور مراعات سے چمٹے عاقبت نااندیش ارباب بست وکشاد کے لئے اپنے ملک کی سلامتی اور افغانستان کے امن سے زیادہ اہمیت امریکی خوشنودی کو حاصل تھی۔

ان کی زندگیوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ جیسے ہی ممکن ہو وہ امریکی ''گڈ بکس'' میں موجود رہیں۔

روسیوں کی فوجی شکست کو امریکیوں نے کبھی افغانیوں کی سیاسی فتح میں تبدیل نہ ہونے دیا اور ان کے نسلی غلام اپنے آقاؤں کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل پیرا ہو رہے تھے۔

☆☆

اس روز فیضان اوغلو نے پہلی مرتبہ شمشیر خان سے چلے جانے کے لئے کہا تھا۔

''لیکن میں تو اپنے کمانڈور کے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا...... وہاں شیشان میں اپنے دادا کی قبر پر میں اپنے فاتح کمانڈر کے ساتھ فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا''

اس نے کہا تو بہت ضبط کے باوجود فیضان اوغلو کی آنکھیں چھلک گئیں۔

''میرے دوست۔ میرے بھائی! میں ضرور آؤں گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک روز تم آ گئے تھے میرے پاس...... جیسے دنیا بھر سے مجاہدین رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر ایک مرکز اور عہد پر اکٹھے ہونے لگے تھے۔ تم جاؤ شمشیر خان۔ دیر نہ کرو۔ روسیوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے...... انہیں سنبھلنے کا موقعہ نہ دو...... جاؤ اور اس مشن کو مکمل کرو جو یہاں نامکمل رہ گیا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم لوگ ہماری طرح دھوکہ نہیں کھاؤ گے''

شمشیر خان اپنے دل پر پتھر رکھے وہاں سے رخصت ہو کر بالآخر شیشان آ گیا۔ اس نے دادا قاضی کی قبر پر ان کے سرہانے کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس خطے کے مسلمانوں پر آزادی کی صبح طلوع ہونے والی ہے اور وہ افغان جہاد کی سنت کو زندہ رکھے گا......

اور اس نے ایسا ہی کیا......

ایک روز ساری دنیا نے ایک عجیب وغریب اعلان آزادی سن لیا۔ یہ جمہوریہ شیشان کا اعلان آزادی تھا۔

یکم نومبر 1991ء کو ماسکو کے در و بام اس آزادی کی گونج سے لرز رہے تھے۔ روسی صدر یلسن کے لئے یہ اعلان چونکا دینے والا اور انتہائی طیش دلانے والا تھا۔ اس کا جی تو یہی چاہا کہ ابھی آتش وآہن کے سیلاب سے چیچنیا کو روند ڈالے۔

لیکن:

روسیوں نے تاریخ سے سبق سیکھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر روسی فوجیں اس مرحلے پر شیشان میں داخل ہوئیں تو پورا خطہ ''قفقاز'' بن جائے گا...... انہوں نے 1877ء میں ''قفقاز'' میں مجاہدین کے ہاتھوں اپنے تین لاکھ فوجیوں کی موت کے سانحے کو نہیں بھلایا تھا اور افغانستان میں ہزیمت کا زخم ابھی تازہ تھا۔

اب وہ طیش میں بھر کر افغانستان کی طرح کوئی اور خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ انہوں نے ٹھنڈے دل و دماغ سے مسئلے کی سنگینی پر غور کیا اور اس مرحلے پر جبکہ روس اور امریکہ کے درمیان ''مثالی تعلقات'' قائم ہو رہے تھے ''امریکی ہمدردی'' کا حصول ضروری جانا......

یلسن جانتا تھا کہ امریکہ کی آشیرواد کے بغیر وہ شیشان کی طرف ایک قدم بھی بڑھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا......

اور اس نے ایسا ہی کیا......

اس نے امریکہ کو بتایا کہ مذہبی عسکریت پسند روس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد ٹھنڈے پیٹوں نہیں بیٹھیں گے......

وہ امریکہ کی خبر لیں گے...... ان کا اگلا ٹارگٹ امریکہ ہوگا اور...... امریکیوں نے اسی مفروضے کو سچ مان لیا......

انہوں نے روس کو گرین سگنل دے دیا...... اب روسیوں کو مناسب وقت کا انتظار تھا۔ فی الوقت وہ دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی اپنا رہے تھے۔

روس اس وقت زبردست معاشی عدم استحکام سے دوچار تھا جو افغانستان میں بے پناہ اخراجات کی بنا پر پیدا ہوا تھا۔ اگر وہ شیشان پر چڑھائی کرتا، تو مزید معاشی بوجھ اسے تباہ کر کے رکھ دیتا۔ 1877ء میں ایک مختصر سی بغاوت کو کچلنے کے بھاری بھرکم زارشاہی کو روسی خزانے کا ایک بڑا حصہ خرچ کرنا پڑا تھا۔ 1991ء میں روسی اپنی ڈوبتی معیشت کو سہارا دینے کے لئے دنیا بھر میں امداد کا کشکول پھیلا کر بھیک مانگ رہے تھے، اس لئے جنگ کے اخراجات برداشت کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔

روس کے مختلف شہروں میں قفقاز کے اڑھائی لاکھ مسلمانوں نے شیشان کی آزادی کی حمایت کی اور ہر قسم کے تعاون کے لئے آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس وقت شیشان کے صدر جوہر داؤد نے روس کو دھمکی دیتے کہا تھا:

اگر روس نے شیشان کے خلاف جنگ چھیڑی تو اس جنگ کو ماسکو اور روس کے دوسرے شہروں کے اندر تک منتقل کر دیں گے، جہاں حکومت کے وفادار ایک لاکھ تیس ہزار شیشانی باشندے موجود ہیں۔''

تین سال قبل قفقاز کی دو ریاستوں اور سیتیا اور انگوشتیا کا باہمی نزاع شدت اختیار کر گیا تو اس بہانے روس اپنی فوجیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں شیشان کی سرحد تک لے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح صدر جوہر داؤد گھبرا جائے گا اور اعلان آزادی سے تائب ہو جائے گا لیکن جوہر داؤد نے بے پناہ جرأت کا مظاہرہ کیا اور کہا...... ''اپنے ٹینک اور فوجیں ہماری سرحد سے ہٹا لو ورنہ قفقاز کی دوسری جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔''

اس کے علاوہ جوہر داؤد نے عام اعلان جہاد کر دیا۔ اس کے بعد قفقاز کی دوسری ریاستوں کے رضا کار مجاہد بھی شیشان کا رخ کرنے

لگے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر روس نے جوہر داؤد کی دی ہوئی ڈیڈ لائن سے قبل ہی فوجیں پیچھے ہٹا لینے میں عافیت جانی تھی۔

شیشان پر حملے سے پہلے روس نے لومڑی جیسی عیاری سے کام لیا۔ نفرتوں کے بیج بو کر...... بدامنی پیدا کر کے...... متحارب گروپ کو آپس میں لڑا کر اور امن کے قیام کا نعرہ لگا کر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کرنے کا پروگرام تھا۔ وہی طریقہ جو بھارت نے مشرقی پاکستان میں اختیار کیا۔ شیشان میں روس نے جن غداروں کا انتخاب کیا ان میں عمر افتر خانوف، رسلان، لابازانوف اور روسی پارلیمنٹ کے سابق سپیکر ارسلان حسبلا توف شامل تھے۔ ان لوگوں نے شیشان کے صدر جوہر داؤد کے مخالف دھڑے کی قیادت سنبھالی اور صدر پر مالی بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ اس کے بعد اپنے حامیوں کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے پر تشدد مظاہرے کیے، قومی تنصیبات کو آگ لگائی اور صدر جوہر داؤد کی وفادار فوج کے خلاف عسکری کارروائیاں کیں۔ ان کو ٹارگٹ یہ ملا تھا کہ اگر صدر کو برطرف نہ بھی کرا سکو، تو کم از کم ایک متوازی حکومت قائم کرنے میں ضرور کامیابی حاصل کر لو۔

حزب مخالف نے اس مقصد کے لئے اپنی ملیشیا قائم کی اور نادر تیچنی کے علاقے میں عملاً کنٹرول بھی حاصل کر لیا۔ نادر تیچنی میں شیشان کی سب بڑی آئل ریفائنری واقع ہے۔

حزب مخالف نے عمر افتر خانوف کے زیر انتظام علاقے میں متوازی حکومت کا اعلان بھی کر دیا اور باغی فوج کی سربراہی کیلئے شیشان کے دارالحکومت گروزنی کے سابق میئر بسلان گنتامیروف کو چیف کمانڈر نامزد کیا گیا۔ صدر جوہر داؤد کے حامیوں کے مطابق اپوزیشن لیڈر لابازانوف اور خواجہ سلیمانوف مختلف جرائم کے سلسلے میں روسی جیلوں میں قید کاٹ رہے تھے۔ ان مجرموں کی رہائی کا مقصد یہی تھا کہ وہ شیشان میں خانہ جنگی کے حالات پیدا کریں۔

☆☆

9 فروری کو حزب مخالف کے مسلح گروہوں نے فوجی چھاؤنی سے اسلحے کے گوداموں کو لوٹنے کی کوشش کی جس میں کئی جانیں ضائع ہوئیں۔ روس صدر جوہر داؤد کے مخالف گروہ کو ہر طرح کی امداد دیتا اور حوصلہ افزائی کرتا رہا۔

حزب مخالف کا لیڈر عمر افتر خانوف ماسکو سے دس بلین روبل کی خطیر رقم لے کر آیا تھا۔ خود افتر خانوف نے بیان دیا کہ یہ رقم حکومت کے خلاف عوامی تائید حاصل کرنے کے لئے خرچ کی جائے گی۔

اس رقم کے علاوہ روس نے حزب مخالف کو ملک میں گڑبڑ پیدا کرنے اور حکومت کو گرانے کے لئے ہر طرح کے اسلحے کی امداد بھیجی۔ روسی ہیلی کاپٹروں کو شیشان کی سرحد عبور کر کے حزب مخالف کے مراکز میں اسلحہ پہنچاتے ہوئے دیکھا گیا۔

☆☆

شیشان میں امن وامان کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کے باوجود حالات اس نہج پر نہیں پہنچے تھے کہ جہاں تک روس چاہتا تھا۔ دوسری طرف روسی قیادت پر روس کے انتخابات میں قوم پرست پارٹی کی اچھی خاصی کامیابی کا زبردست دباؤ پڑا۔ قوم پرستوں کے

متعصب لیڈر نے زارشاہی دور کے روس کی بحالی کا نعرہ لگایا اور دیکھتے ہی دیکھتے روسیوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ جس کا اظہار انتخابات کے موقعے پر لوگوں نے کھل کر کیا اور اس نے یلسن کے خلاف ایک مضبوط اپوزیشن کھڑی کر دی۔

اس جماعت کے منشور میں وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں سمیت دوسری بالٹک ریاستوں پر بھی دوبارہ قبضہ کرنا شامل تھا۔ شیشان کے بارے میں وہ کسی رورعایت کے قائل نہیں۔ بورس یلسن نے اپوزیشن کی عوامی مقبولیت سے پریشان ہو کر شیشان پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

شیشان کے سوا قفقاذ کی دوسری ریاستیں ابھی تک روس کے تسلط میں تھیں۔ شیشان کو دیکھ کر وہاں بھی آزادی کی جدوجہد زور پکڑنے لگی تھی۔ انہیں شیشان کے صدر جوہر موسیٰ داؤدی کی مکمل آشیر باد حاصل تھی۔ 1993ء میں ان تمام ممالک کے سرکردہ مسلم راہنماؤں کی شیشان کے صدر مقام گروزنی میں صدر داؤدی کی دعوت پر ایک مجلس منعقد ہوئی۔ جس میں طے پایا کہ یہ تمام ریاستیں شمالی قفقاذ کی ایک فیڈریشن میں ضم ہو جائیں گی اور اس فیڈریشن کا ہیڈ کوارٹر شیشان کا دارالحکومت گروزنی ہوگا۔ اس مجلس میں شمالی قفقاذ کی ان مسلم ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک اعلیٰ سطحی تنظیمی ڈھانچے کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔

یہ کوشش اب رنگ لا رہی تھیں اور ان مسلم ریاستوں کے باشندے بھی شیشان کی راہ پر چلنے کے لئے قدم بڑھا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ حالات روس کی گرفت سے باہر ہو جاتے اور گروزنی روس سے آزادی حاصل کرنے والوں کا مرکز بن جائے، شیشان پر حملہ کر کے اس خطرے کی جڑ ہی کاٹ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

روس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی کہ اندرونی خلفشار کے نتیجے میں شیشان خود بخود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گرے گا۔ اس نے شیشانی حکومت کے باغیوں کو بے پناہ مالی وسائل مہیا کئے تاکہ وہ داؤد انتظامیہ کو گرا سکیں، لیکن روس کو نظر آ رہا تھا کہ یہ باغی راہنما ایسی گڑبڑ تو پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے جس سے صدر داؤدی کی حکومت ختم کی جا سکے اور نہ لوگوں کو دوبارہ روسی فیڈریشن میں شمولیت کے لئے آمادہ کر سکیں گے۔

اس طریقے سے شیشان پر قبضہ دیکھ کر براہ راست فوجی کارروائی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

☆☆

بحیرہ اسود کی بندرگاہ ابخازیہ بھی شیشان کے قبضے میں تھی۔ اس بندرگاہ کے ذریعے ترکی اور یورپ تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ روس کو اس اہم بندرگاہ سے محروم ہونا کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے سے قبل روس تیل کے معاملے میں خود کفیل تصور کیا جاتا تھا، لیکن تیل کی یہ دولت 90 فیصد شیشان کی سرزمین سے حاصل کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ تیل کی صفائی کے بڑے کارخانے بھی شیشان ہی میں واقع ہیں۔ اس لئے روس کے دوسرے علاقوں سے نکلنے والے تیل کی صفائی بھی شیشان میں ہوتی تھی۔ اس حوالے سے اگر شیشان کو وسط ایشیا اور مشرقی یورپ کا ''کویت'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ نقصانات روس کے لئے کچھ کم اہمیت کے حامل نہ تھے چنانچہ روس نے سونے کی اس چڑیا کو دوبارہ زیر دام لانے کا فیصلہ کر لیا۔

روس نے صدر داؤد کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے ابتداء میں اقتصادی پابندیاں لگائیں۔ اس کے جواب میں 27 اکتوبر 1992ء کو صدر داؤد نے روس کے صدر بورس یلسن کو ایک ٹیلی گرام ارسال کیا کہ تیل کی جو رقم روس کے ذمے واجب الادا ہے وہ تین دن کے اندر اندر ادا کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو ہم پٹرو کیمیکل کی مصنوعات کی ترسیل روک دیں گے۔ یاد رہے کہ روس "ایوی ایشن فیول" کی 92 فیصد ضروریات شیشان سے پوری کرتا ہے۔ اس طرح روس کی معاشی شہ رگ شیشان کے قبضے میں تھی جس کو کبھی بھی وہ دبا کر روس کی ترقی کی سانس روک سکتا تھا۔

ان وجوہ کے پیش نظر روس نے شیشان پر حملہ کر کے اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے روس کو مسلمان ممالک کے خلاف کارروائی کرنے میں امریکی حمایت کی چھتری بھی حاصل تھی۔ اب روس اپنے ابتدائی بحران پر بھی قابو پا چکا تھا اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی تھی جو 1991ء میں تھی۔

ایک روز آتش و آہن سے لیس روسی بکتر بند دستے چیچنیا پر یلغار کر رہے تھے۔ زمینی حملے سے پہلے روسی فضائیہ نے گروزنی پر شدید بمباری کی اور اپنی دانست میں گروزنی کے جانبازوں کو ختم کرنے کے بعد ہی پیدل فوج کو آگے بڑھایا۔

لیکن ساری دنیا انگشت بدنداں تھی گروزنی کے جیالے اپنی روایات کے مطابق چیتوں کی طرح روسیوں پر ٹوٹے اور کابل کی تاریخ خود کو دہرانے لگی۔

❀ .... ❀ .... ❀

کس شیر کی آمد ہے!

شمشیر خان اپنے گھر آیا تو اس کی حالت ہارے ہوئی سپاہی جیسے تھی......

لیکن......

سارے گاؤں نے اس کا استقبال ایک فاتح کی حیثیت سے کیا تھا......

اس نے افغان جہاد میں حصہ لے کر شیشانیوں کا فرض کفایہ ادا کر دیا تھا......

وہ ان سب کا ہیرو تھا......اور سب سے بڑھ کر راحے کا......

راحے اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ اس نے افغانستان جانے سے پہلے اس سے کہا تھا کہ ایک روز وہ ضرور سرخرو ہو کر واپس آئے گا اور راحے نے کہا تھا وہ اس کا انتظار کرے گی......

زندگی کے آخری سانس تک اس کی منتظر رہے گی۔

کمانڈر جبریل کی معیت میں اس نے جلد ہی اپنے مشن کا آغاز کر دیا اور روسی فوجیوں پر ویسے ہی حملے ہونے لگے جیسے کبھی افغانستان میں وہ فیضان کی کمانڈ میں کیا کرتے تھے۔ آج اس کا بچھایا بارود بڑی کامیابی سے پھٹا تھا۔

دھماکہ زوردار گڑگڑاہٹ چیخیں......سسکیاں اور پھر خاموشی......گہری خاموشی۔ موت کا سناٹا......

شمشیر خان جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا۔ چند منٹ پہلے وہاں ایک بیرک نما کمرہ تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ گری پڑی اینٹیں، ٹوٹی پھوٹی لکڑیاں جھلستی ہوئی زمین، دھواں اٹھ رہا تھا۔ گہری خاموشی اور تاریکی میں شمشیر خان مسکرا دیا۔

اس نے آس پاس پھیلی ہوئی تاریکی پر نگاہ ڈالی۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہاں وہ اس وقت اکیلا تھا۔ خود مختار، بے خوف، آزاد، اس نے زنجیر کی ایک کڑی توڑ دی تھی۔ زمین کا وہ ٹکڑا آزاد ہو چکا تھا۔ اب اس علاقے سے سرکاری اور روسی فوج کی ایک اور چوکی نیست و نابود ہو چکی تھی......ایک عجیب سی طمانیت اور سکون سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ دو گھنٹے پہلے جب وہ اس علاقے میں پہنچا تھا، تو اس وقت بھی اس کے دل میں کوئی خوف نہ تھا۔ ہاں وہ ایک عجیب طرح کی بے چینی اور اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ جب بھی اسے کسی مہم یا مشن کو انجام دینے کے لئے جانا پڑتا تو دشمن کے خلاف قدم اٹھانے سے پہلے اس کا دل بے چین اور مضطرب ہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں وہ اپنے اس اضطراب کو نہ سمجھ پایا۔ وہ اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہتا۔ کیا تم خوف محسوس کرتے ہو۔ لیکن دل خوف سے خالی محسوس کرتا۔ اور سوچنے لگتا۔ پھر یہ بے چینی اور اضطراب کیوں؟ اب وہ عرصے سے اس کیفیت کو سمجھ گیا تھا۔

یہ بے چینی، یہ اضطراب۔ ایک خواہش کی تکمیل سے پہلے کے لمحے کی کیفیت تھی۔ وہ ناکامی کا منہ نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے ایک سپر پاور کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اسے اپنی جان جانے کا کوئی خوف نہ تھا۔ احساس ہوتا تو اس بات کا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائے۔ اب وہ پوری طرح مطمئن تھا۔ اس نے یہ اہم اور خطرناک فریضہ انجام دیا تھا۔ پچھلے دس دنوں میں اس علاقے میں تیرہ فوجی چوکیوں کو اڑایا جا چکا تھا۔ اس پورے علاقے میں صرف تین چوکیاں اب باقی رہ گئی تھیں۔ جہاں روسی اور سرکاری فوج کے سپاہی قابض تھے۔

آج کی رات ان بقایا تینوں چوکیوں کو اڑا کر اس پورے علاقے پر غیر ملکی فوج کے تسلط کو ختم کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ان چوکیوں کی تباہی کی صورت میں یہ پورا علاقہ آزاد اور خود مختار ہو جاتا۔ مجاہدین کے قبضے میں آ جاتا۔

شمشیر خان کو یہ چوکی اڑانے کے لئے خاص طور پر چنا گیا تھا۔ وہ اس علاقے کا بھیدی تھا۔ چپے چپے سے واقف تھا۔ ایک ایک موڑ۔ ایک ایک پتھر سے اس کی آشنائی تھی۔ اس چوکی سے چند میل کے فاصلے پر ہی تو اس کا گاؤں تھا۔ کمانڈر جبریل نے اسے یہ فرض سونپتے ہوئے کہا تھا

''گھر کی یاد بڑی ظالم ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ جب تم اس علاقے میں پہنچو گے تو قدم قدم پر تمہارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ تم اپنے گاؤں جاؤ۔ تم اپنے گاؤں جا سکتے ہو۔ لیکن ایک شرط پر...... پہلے تم اپنا فرض ادا کرو گے۔ اس کے بعد تم اپنے گاؤں جاؤ گے اور پھر پو پھٹنے سے پہلے گاؤں سے نکل جاؤ گے۔''

خان نے ہنس کر کہا تھا۔

''میں جب تک اپنے کام کو انجام نہ دے لوں گا۔ گاؤں جانے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں گا۔''

شمشیر خان نے پھر چاروں طرف دیکھا رات تاریک تھی۔ کوئی اکا دکا دھندلا دھندلا سپید ستارہ دور آسمان پر ٹمٹما رہا تھا۔ وہ اچانک زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے زمین اسے پکار رہی تھی۔ ایک عجیب، مدھم، پراسرار آواز میں...... وہ اسے کہہ رہی تھی۔

''میرے بیٹے، میرے مجاہد...... میرے غازی...... تم نے اپنی ماں کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ جس ماں کے بیٹے اتنے غیرتمند، بہادر، دلیر اور شجاع ہوں وہ ماں کبھی کسی کی ملازم اور باندی نہیں بن سکتی۔ چچنیا غلام نہیں رہ سکتا''

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔'' ماں...... عظیم ماں...... میں تیرا بیٹا ہوں۔ کیا تو کسی لمحے ہم سے مایوس ہو گئی تھی۔ ہم وقتی طور پر دبے ضرور تھے۔ غلام کبھی نہیں بنے......''

☆☆

اس نے یوں محسوس کیا۔ جیسے زمین جو اندھیرے میں پاؤں پھیلائے اس وقت نیم بیداری کی کیفیت میں تھی۔ اس زمین نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی ہے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سونے لگی ہے۔ میٹھی نیند......

شمشیر خان تیزی سے آگے بڑھا۔ چند منٹ پہلے یہاں فوجی چوکی تھی۔ اب وہاں خرابہ تھا۔ وہ جھک کر تاریکی میں ملبے کو ٹٹولنے لگا۔ اب

وہ ان کاموں کا عادی ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ تین رائفلیں ملبے کے نیچے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ مزید دو رائفلیں ڈھونڈ چکا تھا۔ اس نے پانچوں رائفلیں اٹھائیں اور پھر جھاڑیوں کی طرف چل نکلا۔ جھاڑیوں کے پیچھے ایک بڑا تھیلا پڑا تھا۔ بوری نما تھیلا۔ اس میں کئی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے ان پانچوں رائفلوں کو بھی اس تھیلے میں ڈالا اور پھر تھیلے کو کندھے پر رکھ کر چل پڑا۔ گاؤں اس کی منزل تھی۔

اب وہ اپنے گاؤں جا سکتا تھا۔ ابھی پو پھٹنے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ یہاں سے تیز تیز چلتا ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے گاؤں پہنچ سکتا ہے۔ اپنے گھر میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد وہ پو پھٹنے سے بہت پہلے گاؤں سے نکل سکتا ہے۔ اسے صبح ہونے تک ارغون کی طرف جانے والی سڑک کے ایک طرف واقع اپنے خفیہ کیمپ میں پہنچنا تھا۔ وہ بار بار فاصلے اور وقت کو ذہن میں لا رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ ٹھیک وقت پر اپنے کیمپ میں پہنچ جائے گا۔

اس کے قدموں کی چال خود بخود تیز ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ذہن اس کے قدموں سے بھی تیز تھا۔ چہرے آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ روشن، منور، ان پر رات کی تاریکی کی کوئی پرچھائیں تک نہ تھی۔

نوری...... راحمے...... اماں......

☆☆

اسے وہ دن یاد آ رہا تھا۔ جب وہ مجاہدین میں شامل ہونے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ ایک سال دو ماہ دس دن...... پہلے وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔ اسے ایک ایک دن یاد تھا۔ ایک سال دو ماہ دس دن...... سے اس نے کسی کو نہیں دیکھا...... ان کی خیریت کی کوئی خبر بھی نہ ملی تھی۔ خط و کتابت کا تو وہاں سوال ہی کہاں تھا۔ ایک ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔ تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ان لمحوں کو اس نے بار بار اپنی یادوں، اپنے تصور اور ذہن میں تازہ کیا تھا...... لیکن اس لمحے جب وہ ایک سال دو ماہ دس دن کے بعد اپنے گاؤں جا رہا تھا تو اس وقت یہ لمحے پہلے سے بھی زیادہ منور ہو گئے تھے۔

ماں اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی......

چہرے پر جھریاں، آنکھیں چندھی سی ہو رہی تھیں۔ بڑے دہانے، باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''ہاں اماں...... میں جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ پھر اپنی بوڑھی ماں کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کی بوڑھی ماں بے حد رنجور دکھی اور غمزدہ دکھائی دے گی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بہہ رہی ہوں گی لیکن وہ تو اپنی جھریوں سمیت مسکرا رہی تھی......

اس لمحے اس نے سوچا اماں اداس نہیں تو یہ مسکرانے کا بھی تو موقع نہیں۔ پھر اماں کیوں مسکرا رہی ہے...... میری اماں نے مجھ پر کبھی طنز نہیں کیا۔ آج کہیں اماں طنزیہ اور جلے بھنے انداز میں مسکرا کر میرے ارادے کی راہ میں دیوار بننے کا ارادہ تو نہیں کر رہی۔ کہیں راحمے نے اسے پٹی تو نہیں پڑھا دی...... راحمے کی شریر آنکھیں اس کی نگاہوں کے سامنے چمکنے لگیں......

''شمشیر خان'' وہ اپنی اماں کی آواز سن کر چونک اٹھا تھا۔ ''تمہیں جانا چاہئے۔ میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گی۔ میں نے تمہیں افغانستان جانے سے بھی نہیں روکا تھا۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''وعدہ...... اماں کیسا وعدہ......''

''ایک ہی وعدہ...... کہ تم پیٹھ پر گولی نہیں کھاؤ گے۔''

اس کی اماں کی آواز میں ایک اعتماد تھا۔ ایک عجیب سا طنطنہ...... اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کا سر تنا ہوا تھا۔ چندھی آنکھیں شرارے اگلے رہی تھیں۔ چہرے پر ایک ملائمت آمیز عجیب سی استقامت تھی۔ شدت جذبات سے اس کے وجود میں لرزش پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''تم نے وہ گیت سنا ہے ناں...... ''دشمن کا سر ہمیشہ کے لئے جھکا دو۔ اس کا سر کاٹ دو۔''

اسے اس وقت یہ پورا گیت یاد آ گیا تھا۔ صدیوں پرانا گیت جسے وہ اپنے بچپن سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ ''ہاں اماں مجھے گیت یاد ہے......''

اچانک اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی اماں کچھ ڈھیلی سی پڑ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیں بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن آنکھوں میں وہی چمک۔ وہ شرارے دہکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اماں بڑبڑا رہی تھی۔

''وطن کا دشمن...... وطن کا دشمن اس کا سر کاٹ دو......''

شمشیر خان کو وہ لمحہ یاد آیا۔ جب اچانک اس نے اپنی بوڑھی ماں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ اماں اس کا ماتھا چوم رہی تھی۔ اسے اپنے سینے سے لگا رہی تھی اور خان عجیب رندھے رندھے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اماں...... میں وطن کو اس کے دشمنوں سے پاک کر دوں گا۔ میں سینے پر گولی کھاؤں گا...... اور پھر ایک دوسرے لمحے میں اس کی نگاہ جب اٹھی، تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی راحمہ دروازے کے پاس کھڑی ہے اور ماں بیٹے کو دیکھ کر مسکرا رہی۔ ...... اماں نے اپنی بہو کو دیکھا تو بولی۔

''جانے کا وقت قریب آ گیا ہے راحمہ سے بھی بات کر لے...... '' پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

☆☆

راحمہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی۔ اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ راحمہ کو اپنے جانے کے بارے میں بتا چکا تھا۔ مجاہدین میں شامل ہونے کا خیال جس وقت اس کے دل میں آیا تھا تو اس نے سب سے پہلے راحمہ کو ہی اپنے ارادے سے مطلع کیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''میں بے غیرت نہیں ہوں راحمہ۔ وہ ہمارے مذہب کو بدل دیں گے۔ اگر ہم نے اس ظالم حکومت اور روسیوں کا مقابلہ نہ کیا تو ہمیشہ کے لئے غلام ہو جائیں گے۔ میں شیخ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ سرخرو ہونے۔ راحمہ نے اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا تھا اور کہا تھا۔

''ہم بے غیرت نہیں ہیں خان۔ میرے بابا نے مجھے یہ سبق پڑھایا تھا کہ اپنے میاں کو کبھی بے غیرتی نہ سکھانا۔ میں بے غیرت کی بیوی بن

کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم اللہ کا نام لے کر دشمنوں کا سر کاٹتے جاؤ۔ میں تمہارے لئے دعا کروں گی۔ تمہارا انتظار کروں گی۔ سرخرو ہو کر لوٹنا۔ لیکن افغانستان کے ہارے ہوئے مجاہد بن کر نہ آنا۔

راحمہ کی یہ بات اسے کھا گئی۔ لیکن اس کڑوی سچائی سے فرار ممکن نہیں تھا۔

شمشیر خان اڑا چلا جا رہا تھا۔ فاصلے سمٹ رہے تھے۔ وہ اس علاقے کے ایک ایک راستے اور ایک ایک موڑ سے واقف تھا۔ آنکھیں بند کر کے اپنے گاؤں پہنچ سکتا تھا۔ یادیں اور وہ سارے لمحے جو آخری الوداعی ملاقات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ وہ سارے لمحے تصویروں اور آوازوں کی صورت میں اس کے ذہن کے پردے پر کھنچے چلے آ رہے تھے۔

ان میں بعض لمحے بہت اذیتناک تھے۔ بعض لمحے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے تھے۔ اپنی دو برس کی بیٹی نوری کو گود میں لے کر، ہوا میں اچھالتے ہوئے وہ سوچا کرتا تھا۔ جب میں دوبارہ روسیوں سے مقابلہ کرنے کیلئے جاؤں گا تو یہ مجھے بہت یاد آئے گی اور اس کی یاد میرے دل کو بوجھل کر دے گی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا تھا۔ اگر میں بھی مر گیا تو...... اس کے بعد اس کا ذہن تاریک ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا۔

وہ سوچتا نوری یتیم ہو جائے گی۔ یہ تو ابھی اتنی چھوٹی سی ہے کہ اسے تو میری شکل بھی یاد نہ رہے گی۔ دوسرے لمحے وہ دانت پیسنے لگتا۔ اور دل میں کہتا کیا تو بزدل ہو گیا ہے۔" وہاں پاکستان کے ریفیوجی کیمپوں میں نوری جیسی ہزاروں بیٹیوں نے کب اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ اس کی نوری کچھ الگ تو نہیں تھی۔

☆☆

اس وقت جب اس کے قدم تیزی سے اپنے گاؤں کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے نوری کا چہرہ بار بار آ رہا تھا۔ سب سے روشن، منورہ چہرہ، سرخ رخسار پھولے پھولے گال، بھورے بال، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، توتلے لہجے میں اس کی دل میں اتر جانے والی باتیں اسے رلا رہی تھیں۔

اسے یاد آ گیا......

ایک روز اسی طرح وہ کیسی بے سروسامانی کے عالم میں اپنے گھر سے نکلا تھا۔

شمشیر خان اس کے والد کا عطا کردہ نام تھا جس نے زندگی کا طویل عرصہ افغانستان میں گزارا جب وہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ داغستان اور قفقاز سے سفر کرتا یہاں پہنچا تھا۔ شمشیر خان کی پیدائش سے بیس سال پہلے اس کا دادا شیشان لوٹ آیا تھا لیکن صرف اپنا جسم لے کر......اس کی روح افغانستان میں ہی تھی......

اس نے افغانوں کو فرنگی فوج سے لوہا لیتے دیکھا تھا۔ اس نے کہساروں کے ان شیروں کی لپک جھپٹ کا نظارہ کیا تھا جنہوں نے انگریز لشکر کے بیس ہزار میں سے صرف دو لشکری زندہ رہنے دیئے تھے تاکہ ان میں سے کوئی ایک پشاور چھاؤنی تک پہنچ کر تباہی کا احوال اپنے مالکان تک پہنچا دے......

یہ دونوں لشکری بھی انگریز نہیں ہندوستانی تھے۔

اپنے وطن واپس آنے کے بعد سے اس کے دل میں مسلسل ایک ہی آگ سلگ رہی تھی کہ کس طرح وہ بھی روس کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار دے......

ماسکو سے صرف تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر موجود امام شامل کی اپنی نگری کے مکینوں نے امام شامل کی قیادت میں ایسا معرکہ آزادی لڑا کہ تاریخ کو ایک نیا موڑ دے گئے۔ لیکن اپنوں کی ریشہ دوانیوں...... بے حسی اور کم سامانی نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

روسیوں نے جب شیشان پر کنٹرول حاصل کر لیا تو یہاں امام شامل کے ساتھیوں کو چن چن کر خاندان سمیت موت کے گھاٹ اتارا۔ یہ اس کے دادا کی خوش قسمتی تھی کہ وہ روسیوں کی نظروں سے بچ رہا اور قاضی خاندان کا معزز فرزند بننے کے سبب اسے کچھ معاشرتی تحفظ حاصل رہا۔

قاضی صاحب کے دل میں اب ایک ہی دھن سمائی تھی کہ کسی طرح وہ اپنی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر امام شامل کی نشاۃ ثانیہ کا نظارہ کر لے اس نے اپنے پوتے کا نام اپنے ایک افغان دوست کے نام پر ہی شمشیر خان رکھا تھا اور چاہتا تھا کہ جس طرح افغانوں نے فرنگیوں اور روسیوں سے خود کو محفوظ رکھا تھا اس کی قوم بھی ایسا ہی کرے......

وہ اپنے خاندان کو مرتے وقت تک افغانوں کی بہادری اور جہاد کے قصے سناتا رہا۔ شمشیر خان یہ کہانیاں سن کر جوان ہو رہا تھا۔

''آہنی پردہ'' روسیوں نے شیشان کے گرد زیادہ مضبوطی سے تانا تھا لیکن ایک روز وہ ساعت سعید بھی آ ہی گئی جب قاضی صاحب کے بوڑھے کانوں نے جن کی سماعت بھی اب ان کی بصارت کی طرح دم توڑنے لگی تھی یہ خبر سن لی کہ افغانوں نے روس کے جبر کو قبول نہیں کیا اور بندوق اٹھا لی ہے......

اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں اپنی جوانی کے کھو جانے کا دکھ ہوا......

لیکن......

شمشیر خان کی شکل میں ان کے پاس ابھی ''امید'' باقی تھی۔ انہوں نے اٹھارہ سالہ شمشیر خان سے کہا تھا کہ اب شاید وہ زیادہ دیر نہ جی پائیں لیکن ان کا دل گواہی دے رہا ہے کہ انشاء اللہ افغانستان کو روس کے پنجے سے رہائی ملے گی اور امام شامل کے نامکمل مشن کی تکمیل ہو گی۔

کوئی غیبی قوت انہیں نوید دے رہی تھی کہ روس کی شکست و ریخت کا آغاز اب افغانستان سے ہو گا......

تاجکستان، ازبکستان اور بالٹک کی ریاستوں کو آزادی ضرور نصیب ہو گی اور اس کا آغاز کابل کے پنجہ استبداد سے رہائی کے ساتھ ہی ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے پوتے سے کہا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو وہ افغان جہاد میں حصہ لے۔ جہاد کے ثمرات سمیٹے اور اسلام کی اس ہمیشہ زندہ رہ جانے والی سنت کا احیاء شیشان میں کر لے۔

شیشان سے افغانستان کے اس صوبے تک شمشیر خان کس طرح پہنچا؟

شیخ اسامہ تک اس کی رسائی کیسے ممکن ہوئی؟

یہ سوچ کر وہ جہاد کی عظمت کا قائل ہو جاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ عام حالات میں اگر وہ افغانستان کا عزم کرتا تو کبھی یہاں پہنچ پاتا...... جب کبھی فیضان نے اسے پوچھا کہ وہ چیچنیا سے یہاں تک کیسے پہنچا تو اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"جذبہ جہاد تھا جو اسے یہاں تک لے آیا۔"

وہ ہر سائل کو یہی جواب دیتا تھا......

اس کے جذبے کی صداقت تھی......

اس کی لگن تھی یا پھر اللہ کی طرف سے اس کا انتخاب کسی بڑے انعام کے کے لئے ہو چکا تھا کہ ایک روز وہ بھی آیا جب وہ شیخ اسامہ کے نزدیکی ساتھیوں میں شمار ہونے لگا۔

"جوجی" کے محاذ پر اس نے عرب، افغان اور پاکستانی مجاہدین کی معیت اور شیخ کی کمان میں زندگی اور موت کا ایسا شاندار معرکہ سر کیا جو آج عسکری تاریخ کا درخشاں باب بن چکا ہے۔ فیضان اوغلو نے اسے جو سبق پڑھا کر وطن واپس بھیجا تھا اس نے کبھی نہ بھلایا۔ روس کی شکست وریخت کا عمل جاری تھا شیشان نے اعلان آزادی کیا اور روس سے الگ ہو کر اپنی حکومت کا اعلان اور جہاد منظم کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

کمانڈر جبریل اس کے ساتھ ہی افغانستان سے آیا تھا......

دونوں فیضان اوغلو کے ساتھی تھے اور انہوں نے کئی مشن اکٹھے کئے تھے۔ فیضان اوغلو عموماً ان کا کمانڈر رہتا تھا۔ یوں تو ان کے درمیان کئی قدر مشترک تھیں لیکن سب سے اہم بات جو ان تینوں کو بہت قریب لے آئی، روسی زبان تھی۔ جبریل کا تعلق قفقاذ سے تھا اور وہ بھی ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد یہاں تک پہنچا تھا۔

دم رخصت تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

لیکن......

فیضان اوغلو نے ہی ہمت کر کے انہیں "فی امان اللہ" کہا۔

☆☆

شیشان پہنچنے کے فوراً بعد اس کی دادی نے راحمے سے اس کی شادی کر دی۔ راحمے نہ صرف شمشیر خان کی خالہ زاد تھی بلکہ دونوں نے تعلیم بھی اکٹھے ہی حاصل کی تھی۔ اکٹھے ہی پلے بڑھے تھے اور سارے خاندان کو اس بات کا علم تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کیسے جذبات رکھتے ہیں۔

شادی کے دس ماہ بعد ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں نوری عطا کی تھی۔

ننھی منی سی نوری جب قاضی خاندان کی دائی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر ڈالی تو نہ چاہتے ہوئے بھی خان اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔

اسے آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ اس لمحے کیوں رو دیا تھا۔ دائی آنگہ نے اسے بچوں کی طرح پال پوس کر جوان کیا تھا۔ اس نے پیار سے ہلکی چپت اس کے گال پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

''بس بڑا مجاہد بنا پھرتا ہے۔ اتنی سی خوشی برداشت نہیں کر پایا......''

اور......

شمشیر خان بے ساختہ ہنس دیا۔

گاؤں کی طرف جاتے ہوئے ایک ایک بھولی بسری یاد زندہ پیر کی طرح اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی......

سوا سال بعد اپنے گاؤں کی طرف آتے ہوئے اسے نجانے کیوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اجنبی راستے کی طرف جا رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے وہ رک سا گیا۔ وہ راستہ نہیں بھولا تھا۔ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ اس کا ایک ایک قدم اسے گاؤں کے قریب تر لا رہا تھا۔ لیکن نوری کا جاں فزا تصور تھا۔ جس نے ایک لمحے کے لیے اس کے قدم روک دیئے تھے۔ اسے سوا سال پہلے کی وہ شام یاد تھی جب گاؤں سے رخصت ہوا۔ اس لمحے اس نے اپنی اماں اور اپنی بیوی راحے کی طرف دیکھا تھا اس کی اماں اور اس کی بیوی سمجھ گئی تھیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ کس چیز کی تلاش میں ہے۔

''نوری سو رہی ہے''

راحے نے آہستہ سے کہا تھا۔

''آج جلدی سو گئی۔

اماں نے کہا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ جانے سے پہلے نوری کو خوب پیار کرے گا۔ اسے سینے سے لگائے۔ اس کو ہنسائے گا، لیکن نوری آج جلد ہی سو گئی تھی۔ ''میں اسے لاتی ہوں۔'' راحے نے کہا تھا۔ ''نہیں۔ سونے دو اسے جاگ گئی تو پھر دیر تک روتی رہے گی۔''

اس نے نجانے کیوں کہہ دیا۔

شاید وہ اس لمحے نوری کی نیند خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆

گاؤں سے کچھ دور ہی اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ روسی آرمڈ پرسنل کیریرز کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا جو سامنے سے اچانک نمودار ہوئے تھے۔

ان حالات میں اس کے لیے گھر کی طرف سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر وہ اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹ آیا۔ آرمڈ پرسنل کی روانگی تقریباً دو گھنٹے بعد ممکن ہوئی اور وہ دوبارہ تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیا۔

صبح کا اجالا پھوٹ رہا تھا۔

☆☆

چھوٹے چھوٹے ہموار پہاڑوں والے اس علاقے کو سیب، ناشپاتی اور انگور کے باغات نے اس طرح ڈھانپ دیا تھ کہ بعض جگہ تو سورج کی کرنیں بھی پتوں سے چھن کر اندر آئی تھیں۔ بڑے محتاط قدموں سے وہ چلتا چلا جا رہا تھا اور اب گاؤں کے داخلے کے راستے پر کھڑا حیرت سے اپنے گاؤں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ٹنڈ منڈ درختوں والا گاؤں کیا اس کا ہے؟ درختوں کو کس نے جلایا؟...... ان کی سرسبز ٹہنیاں کیسے سوکھ گئیں۔

پہلے تو اسے یونہی لگا جیسے وہ راستہ بھٹک کر اس طرف آ نکلا ہے لیکن گاؤں کی مسجد کے ایک مینار کو جو نجانے روسی جہازوں کی بمباری سے کیسے محفوظ رہ گیا تھا دیکھ کر اسے یقین کرنا پڑا کہ یہ واقعی اسی کا گاؤں ہے۔

شمشیر خان کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ روانگی پر اچانک اس کا دل بوجھل کیوں ہو گیا تھا۔

مسجد سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بہت دھیمی...... شاید لاؤڈ سپیکر کے بغیر کوئی مسجد کے صحن میں اذان دے رہا تھا۔

اپنے گھر کے سامنے پہنچنے پر زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لئے۔ ہنستے بستے گھر کی جگہ کھنڈرات کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا جس کے ایک کونے پر موجود آوارہ کتے اسے اچانک وہاں دیکھ کر پہلے تو حیرانگی سے ان کی طرف دیکھتے رہے پھر دم دبا کر بھاگ نکلے......

"شمشیر"......

پشت سے آنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

گردن موڑ کر اس نے دیکھا تو اپنے عقب میں بوڑھے عیس محمد کو پایا۔

"تو نے بہت دیر کر دی بیٹا...... اب یہاں کچھ نہیں بچا"......

"چچا...... یہ ا یہ سب......؟"

اس کی آواز بھرا گئی۔

بوڑھے عیس محمد نے اسے گلے لگا لیا۔

نہیں بیٹا...... تم بڑی بہادر ماں کے بیٹے ہو...... تمہیں رونا زیب نہیں دیتا۔"

عیس محمد نے کہا۔

دونوں مسجد میں آ گئے جہاں بمشکل دس بارہ بوڑھے نمازی موجود تھے۔ یہاں اسے علم ہوا کہ دس بارہ روز پہلے روسی افواج نے ان علاقوں پر کریک ڈاؤن کیا تھا۔ پہلے جہازوں نے اردگرد کے قریباً دس بارہ دیہاتوں پر مسلسل بمباری کی جس کے بعد روسی ٹینکوں نے گولے برسائے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ چیچن مجاہدین کے ان دیہاتوں میں زمین پر حرکت کرنے والی کوئی شے زندہ باقی نہیں بچی تو وہ گاؤں میں گھسے اور ان زخمیوں

کو جو ابھی تک نجانے کیوں زندہ تھے مارنا شروع کر دیا۔ گاؤں کے چند بوڑھے کیسے زندہ بچ گئے!

یہ معجزہ تھا یا پھر روسیوں کی طرف سے نشان عبرت بنا کر چھوڑ دیے گئے بوڑھے...... تا کہ وہ گروزنی سے واپس لوٹنے والے مجاہدین کو یہ بتا سکیں کہ ان کے گھر بار کیسے تباہ ہوئے؟

ننھی نوری، راحے، اماں کوئی بھی تو باقی نہیں بچا تھا؟

نجانے کیوں اس نے کھنڈرات بنے اپنے مکان کی اینٹیں اور لکڑیوں کے تختے ایک طرف ہٹانے شروع کر دیئے تو بوڑھے عیسٰی محمد نے اسے منع کیا پھر اس کے ساتھ ہی اس کام پر جت گیا......

اس خاک کے ڈھیر سے کیا برآمد ہوتا؟

گھر کا ٹوٹا پھوٹا سامان، مسخ شدہ تین لاشیں...... جو ناقابل شناخت ہو چکی تھیں...... کسی نہ کسی طرح گاؤں کے بوڑھوں کی مدد سے اس نے مسخ شدہ لاشوں کو دفن کیا۔ وہ سب کسی مشینی عامل کی طرح اس کا ساتھ دے رہے تھے......

شام ڈھل رہی تھی جب اس نے اپنی ماں کی قبر پر مٹی ڈالی۔

آٹھ بوڑھوں کے ساتھ نوجوان شمشیر خان مسجد کے صحن میں بیٹھا تھا......

"بیٹا تم صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ...... اب بھی کوئی نہ کوئی گشتی پارٹی اس طرف آتی ہے...... وہ جانتے ہیں کہ اس گاؤں سے جانے والے مجاہدین کبھی نہ کبھی لوٹ کر آئیں گے۔"

شمشیر خان پتھریلی آنکھوں سے عیسٰی محمد کو دیکھتا رہا۔

اب باقی بوڑھے بھی عیسٰی محمد کے ساتھ اس کی منت سماجت کر کے یہاں سے جانے کی تلقین کر رہے تھے۔

اچانک ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں......

اسے اپنے دادا کا وہ گیت یاد آ گیا جو اکثر وہ گنگنایا کرتا تھا......

ہم شیشان کے شیر ہیں۔

ہم اللہ کے سپاہی ہیں۔

ہم گروزنی کے بیٹے ہیں۔

کوئی ہمیں فتح نہیں کر سکتا۔

اس نے بے ساختہ گیت گنگنانا شروع کیا اور تمام بوڑھے کورس کی صورت اس کا ساتھ دینے لگے۔ امام شامل رحمۃ اللہ علیہ بوڑھے پیروکاروں کی آواز میں نجانے کیا چھپا تھا کہ سارے مناظر اس گیت کا حصہ بننے لگے۔

اچانک ہی شمشیر خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا......

سب خاموش ہو گئے۔

''میں چلتا ہوں چچا...... کمانڈر جبریل میرے منتظر ہوں گے۔ ہم گروزنی جا رہے ہیں...... آخری معرکہ لڑنے...... شاید وہاں میں نوری، راحے اور اپنی اماں کا قرض چکا دوں۔''

وہ چل دیا......

بوڑھے اس کی پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گاؤں کے باہر تک وہ اسے چھوڑنے آئے تھے۔ انہوں نے باری باری بغلگیر ہو کر اس کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ جب شمشیر خان انہیں خدا حافظ کہہ کر سوئے منزل چلا تو بوڑھے عیسٰی محمد کے لرزتے ہونٹوں سے شیشانی گیت پھسل رہا تھا

ہم شیشان کے شیر ہیں

ہم اللہ کے سپاہی ہیں

ہم گروزنی کے بیٹے ہیں

کوئی ہمیں فتح نہیں کر سکتا

ناشپاتیوں اور سیبوں سے ڈھکے باغات کی شمال کی طرف سے آنے والی ہواؤں پر تیرتا یہ گیت اس کے ساتھ ساتھ گروزنی کی طرف گامزن تھا۔

طارق اسمٰعیل ساگر

مارچ 2001ء لاہور

❁......❁......❁